عشق دم جبریل

عشق دمِ جبرئیل

عشق دم جبرئیلؑ ،عشق دل مصطفیٰؐ
عشق خدا کا رسول،عشق خدا کا کلام

شفیق راجہ

زیر اہتمام : **طلوع ادب باغ آزاد کشمیر**

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نام کتاب: عشق دمِ جبرئیل
تحقیق وتصنیف: شفیق راجہ (پروفیسر راجہ محمد شفیق)
سن اشاعت : ۲۰۱۸ء
تعداد: : ۵۰۰
قیمت: : ۴۰۰ روپے
معاونت: پروفیسر دلشاد احمد اریب، شہباز گردیزی،
راجہ طاہر گلزار

سرورق: :
زیر اہتمام: : طلوع ادب باغ آزاد کشمیر

انتساب

- اپنے برادر حقیقی **ڈاکٹر محمد عتیق زاہد** کے نام
  جو میرا بازو، میری ڈھارس ہیں۔
- اپنی نصف بہتر **''بیگم نگینہ شفیق''** کے نام۔
  اس نے میرے ساتھ تین دھائیوں سے زائد کی رفاقت میں
  مجھے پریشانیوں سے دور رکھا۔
- **اپنے بچوں کے نام۔**
  جنہیں دیکھنا ہی خوشیوں میں اضافہ کر دیتا ہے
- اپنے دوستوں اور طلوع ادب کے سارے قلمکاروں کے نام۔
  جنہوں نے کسی مرحلے پر مجھے بددل نہیں ہونے دیا

pics\maulana room.png not found.

اے خدا بنما تو جاں را آں مقام

کاندروں بے حرف می روید کلام

مولانا روم علیہ الرحمۃ

ترجمہ:۔

اے میرے اللہ مجھ کو بھی اس مقام پر پہنچا دے جہاں بات کرنے کیلئے الفاظ کا استعمال نہیں ہوتا۔ (مافی الضمیر کے اظہار کیلئے الفاظ کی ضرورت نہیں پڑتی)۔

۔☆۔☆۔☆۔

pics\Hafiz2.png not found.

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است برجریدۂ عالم دوام ما

حافظ شیرازی علیہ الرحمۃ

ترجمہ:
اس شخص کا دل جس کو عشق نے زندگی بخشی ہے وہ کبھی مر ہی نہیں سکتا، بلکہ اس کا نام ہمیشہ رہنے والی زندگی کی کتاب میں نقش کر دیا جاتا ہے۔ (وہ انمٹ نقش کی صورت اختیار لیتا ہے)۔

-☆-☆-☆-

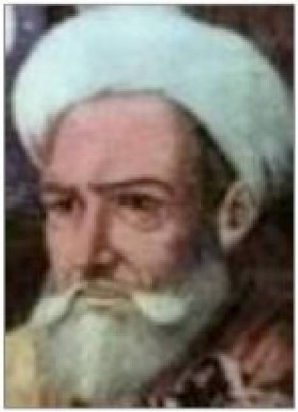

میرزا عبدالقادر بیدل

یا خدا مست چہ جام کردم خود را
کز خویش برون خرام کردم خود را
ایں رفتن رنگ یا وداع دل بود
دلدار آمد سلام کردم خود را

ترجمہ:

اے رب مجھے جام (جام محبت) نے خود سے کیسا مست کردیا کہ باہری تعلق (ظاہر سے تعلق) مجھ سے رخصت ہوگیا۔ یہ رنگ کا اڑ جانا تھا یا دل کا رخصت ہوجانا تھا جب محبوب آیا تو میں خود سے لاتعلق ہوگیا (میری ہستی زائل ہوگئی

حکیم الامت علامہ محمد اقبالؒ

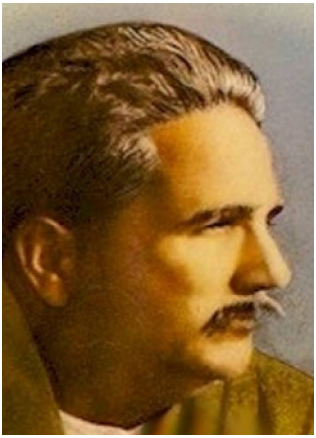

عقل ہے تیری سپر، عشق ہے شمشیر تری
میرے درویش خلافت ہے جہانگیر تری
تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری
ما سوااللہ کے لئے آگ ہے تکبیر تری
کی محمدؐ سے وفا تو نے، تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

(جواب شکوہ بانگ درا)

سرمد شہید ہندیؒ

از منصب عشق سرفرازم کردند
وز منت خلق بے نیازم کردند
چوں شمع دریں بزم گدازم کردند
از سوختگی ء محرمِ رازم کردند

ترجمہ:
مجھ کو منصب عشق سے سرفراز کیا۔ اور لوگوں کی احسان مندی سے بے نیاز کر دیا۔ شمع کی مانند اس بزم میں مجھ کو (پہلے) جلایا۔ (اور پھر) اس جلنے کی وجہ سے مجھے رازدار بنا دیا۔

(رباعیات۔سرمد ہندی)

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات، موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق دم جبرئیل عشق دل مصطفیٰؐ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
عشق کی ہستی سے ہے پیکر گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاؑس الکرام
عشق فقیہہ حرم، عشق امیر جنود
عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام

علامہ اقبالؒ

عنوانات

ا۔شفیق راجہ کا عشق پروفیسر ڈاکٹر احسان اکبر
۲۔حرف آغاز شفیق راجہ (راقم الحروف)

باب اول تفہیم عشق
ا۔ تصور عشق
۲۔ اسلام میں تصور عشق
۳۔مختلف مذاہب میں تصور عشق

باب دوم وجدان عشق
ا۔عشق اور تصوف
۲۔عشق مجاز سے حقیقت تک (صنم تا حرم)
۳۔عشق و ہوس (ایک تقابل)

باب سوم مدارج عشق
ا۔مدارج عشق اور مختلف ائمہ لغت
۲۔مدارج عشق اور روشن ضمیر صوفیائے کرامؒ

باب چہارم تصورعشق اور مولانا رومؒ

۱۔حیات رومی۔ ایک سرسری مطالعہ
۲۔مثنوی مولانا روم اور تصورعشق

باب پنجم تصورعشق اور علامہ اقبالؒ

۱۔حیات اقبال۔ایک سرسری مطالعہ
۲۔۔عشق اصل کائنات
۳۔عشق نغمۂ تار حیات
۴۔عقل وعشق ایک تقابل
۵۔اقبال کے مختلف تصورات میں عشق کا سراغ

باب ششم عشق دل مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

۱۔عشق مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم
۲۔صدق خلیلؑ بھی ہے عشق
۳۔صبر حسینؓ بھی ہے عشق

شفیق راجہ کا عشق

(عشق دم جبرئیل اور شفیق راجہ)

پروفیسر ڈاکٹر احسان اکبر اسلام آباد

پروفیسر شفیق راجہ صاحب نے ''عشق دم جبرئیل'' نام سے دراصل عشق کے لفظ، اس تصور کی وسعت (پھیلاؤ) اور آسمانی مذاہب میں اس کی اہمیت کے مسائل سے گفتگو کی ہے۔ اس معاملہ کا آغاز ان کے لئے علامہ محمد اقبال کا تصور عشق کرتا ہے اقبال کے تعلق سے عشق و وجدان کی بات کرتے ہوئے رومی کی بات جگہ جگہ کرنا پڑتی ہے۔

راجہ صاحب کہتے ہیں کہ انسان جو جسم و روح کا مرکب ہے، وجود کے جس پہلو کو ترقی دیتا ہے وہ رخ قوی تر ہو جاتا ہے۔ روحانی ارتقاء میں جسم رکاوٹ بنتا ہے۔ روح اپنی اصل یعنی ذات الٰہی ء کی جانب پلٹنا چاہتی ہے سو جسم کی رکاوٹ دور کرنے کیلئے انسان کو مجاہدات سے گذرنا پڑتا ہے۔ محبت کا یہ سفر جو سختیوں سے بھرا ہوتا ہے یہی عشق ہے۔ سفر کے تجارب کے ناطے سالکین کی کیفیات مختلف ہو سکتی ہیں مگر مقصود سب کا ایک ہے وہ یہ کہ تزکیۂ نفس ہو جائے جو قرب الٰہی کی بنیاد ہے۔

وہ (شفیق راجہ) قرآن کریم کی تصریحات میں بھی اللہ کی محبت کے حقداروں کی تلاش کرتے ہیں سو بتاتے ہیں کہ **خالصۃللّٰہ** محبت کرنے والوں کے علاوہ مومنین، صابرین، مقسطین، متوکلین، مجاہدین اور محسنین کو یہ قرب الٰہی نصیب ہو جاتا ہے۔ مخلوق کی محبت سے اوپر اٹھ سکنے والا ہی اس منصب اعلیٰ پر فائز ہو سکتا ہے۔

یہاں اسلام اور دیگر مذاہب سماوی میں موجود متصوفانہ لہروں سے بھی بات کی گئی ہے تاہم دوسرے مذاہب کے دیوی دیوتاؤں کے سارے نام ضرور بتائے گئے۔افرودیت،عشتار، وینس، کیوپڈ اور مہر وغیرہ کے علاوہ بھی کئی نام۔یہ بات بھی کی گئی کہ عربی جس نے ''عشق'' کا نام دیا اس میں محبت کے مراحل کیا کیا کہلاتے ہیں اور یہ بھی بتایا کہ صوفیائے کبار نے عشق کے کیا کیا مراحل بتائے۔یہاں عشق ومحبت کو موضوع کرنے والی شاعری قدم بقدم ساتھ چلتی جاتی ہے ۔روایت سے حوالے بھی دیئے۔

فارسی شاعری میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے حوالے سے اور ویسے عشق کو موضوع کرتے اشعار کا جو خزانہ موجود ہے اس میں سے بھی انہوں نے کتنے ہی قیمتی شعر اٹھائے، اسلامی روایات میں اس کے آغاز ظہور کی بھی بات کی اور اس کے مترادف تلاش کرنے کی بھی سعی کی۔

(عربی) شاعر **ابو محجن ثقفی** سے ناراض ہوکر (امیر اسلامی عسکر) حضرت سعدؓ ابن ابی وقاص انہیں قید کر کے رکھتے ہیں وہ جہاد میں شریک ہونے کی آرزو بڑی بے تابی سے ایک نظم میں بیان کر کے بیگم سعدؓ سے عہد کرتا ہے کہ اسے آزاد کر دیا جائے تو وہ واپس آ کر دوبارہ یہ بیڑیاں پہن لے گا۔محترمہ اسے اجازت دے دیتی ہیں۔ **ابو محجن** جہاد میں داد شجاعت یوں دیتا ہے کہ حضرت سعدؓ خود حیران رہ جاتے ہیں مگر وہ (**ابو محجن**) واپس لوٹتا ہے اور وہی بیڑیاں پہن لیتا ہے یہ جذبہ جس نے **ابو محجن ثقفی** کو جہاد سے واپس لا کر باندھ دیا عشق ہی کی قید کی عطا ہے۔

ارشاد خداوندی میں جو حب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عین ایمان کہا گیا ہے فاضل مصنف نے اس سے بھی استنباط کیا اور عمدگی سے بات کی۔(فارس کے ساتھ) دوسری سپر پاور رومی سلطنت تھی جس کے خلاف جہاد کیلئے خالد بن ولید سوئی کی مہم کے لیے لشکر لے کر نکلتے ہیں تو عشق ہی اس سفر میں رہنما ہے کہ سارا سفر صحرائی ہے پانچ پانچ دن کی مسافت پانی کے بغیر ہے۔(اس خطرناک راستے کے رہبر) ایک صحابی حضرت نافعؓ بن عمیر راہ کی صعوبت کے باعث آشوب چشم کا شکار ہوئے ایسے کہ اپنی بینائی گنوا بیٹھے مگر رہنمائی کا فریضہ ادا کرتے رہے۔پورا لشکر جذب دروں کے وسیلے سے آگے بڑھا اور خیریت سے منزل مراد تک پہنچا۔صاحب تصنیف اسے ایمان کی اعلیٰ ترین حالت

کہتے ہیں۔

خوبی کی بات یہ ہے کہ عشق کی ان منازل کی جستجو میں ان کی رفاقت کلام اقبال کر رہا ہے ہر باب کے حوالے سے شعر اقبال نصیب ہے اور شعر اقبال کو تاریخ کی بنیادیں نصیب ہیں۔تاریخ اسلامی سے یہ دونوں عظیم الشان مثالیں فراہم کرتے ہوئے سرِ باب جو اقبالی شعر درج ہوا ہے وہ ہے:

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مرد مسلماں بھی کافر و زندیق

تاریخ اسلام سے یہ مثالیں بھی برجستہ اور موزوں ہیں مگر جس نازک بات کو یہ شعر بیان کر رہا ہے اس کے ناتے کسی غیر مسلم کے جذبۂ عشق سے استنباط بھی لازم آتا۔تاکہ واضح ہوتا کہ کفر کس طرح مسلمانی اور مسلمانی کیسے کفر و زندقہ بن جاتی ہے۔(اس حکم پر عمل کرنے کی سعی کی گئی۔راقم)

جذب و محبت کی اصل کو ڈھونڈتے ہوئے وہ تصوف کی روایت کی اصل تک بھی جاتے ہیں۔اپنی مکی زندگی میں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام لانے والوں کی کردار سازی اور تربیت ایسی کی کہ وہ اپنی جگہ مثالی انسان (انسان کامل) بن گئے۔مگر پہلا شخص جس نے دنیا کو ترک کر کے یاد خدا سے لو لگانے کیلئے ''حجرہ'' آباد کیا وہ ابوالہاشم کوفی (م ۱۵۰ھ) تھا۔دوسری صدی ہجری کے آخر تک اسلام لفظ تصوف سے آشنا نہ ہوا۔''ولی'' کا لفظ بھی بعد میں آیا۔سید علی ہجویریؒ تصوف کی بنا آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد پاک سے لیتے ہیں'' **من سمع صوت اهل التصوف علىٰ دعاء هم فلا يؤمن كتب عند اللّٰه من الغافلين**''(**باب سوم . كشف المحجوب**) 'صفا' اور صفہ' کے لفظ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دیگر ارشادات میں بھی صفائی اور تزکیہ کے لئے استعمال ہوئے ہیں عمدہ شے کو بھی صفہ کہا گیا ہے اور یہی صحیح ترین معلوم ہوتا ہے تیسری صدی ہجری میں تصوف کا سلسلہ درجوں میں تقسیم ہوا۔اور دنیا کی ولایت دو حصوں میں تقسیم ہوئی۔ایک دنیا کی ولایت ایک باطنی ولایت۔عالم تشریع اور عالم تکوین۔

عالم تکوین میں غوث الاعظم ،غوث قطب الاقطاب،قطب،ابدال اور ولی۔'ولی' کے مدارج

آتے ہیں۔غوث الاعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے سلسلہ تصوف میں بھی سلسلہ تعلیم ،قرآن و حدیث وفقہ برابر شامل تھا۔تربیت فقراور شرع کی تعلیم بعد کے زمانوں میں الگ الگ ہوئیں۔بعد میں حضرت سید علی ہجویریؒ نے''کشف المحجوب'' کے ذریعے شرع وفقر کو قریب لانے کی عظیم سعی کی۔حضرت سید علی ہجویریؒ ارشاد فرماہیں''خداوند کریم نے دلوں کو جسموں سے ستر ہزار برس پہلے پیدا فرمایا اور قرب ووصل کے مقام میں جگہ دی اور ان کی روحوں کو دلوں سے ستر ہزار برس پہلے پیدا فرمایا اور انہیں انس کے درجے میں رکھا۔اور ہر روز ۳۶۰ مرتبہ سروں پر اپنی تجلی فرمائی اور ۳۶۰ مرتبہ روحوں پر اپنی رحمت وکرم کی نظر فرمائی اور انہیں محبت کا کلمہ سنایا اور ہر روز دلوں پر محبت کے ۳۶۰ لطیفے ظاہر کئے''

عشق محبت کی انتہائی منزل ہے جو اس راہ تصوف میں حاصل ہونے والی ایک نعمت عظمیٰ ہے تصوف کی کی اس ابتداء کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔اس سارے سلسلے کی روح محبت اور عشق ہے۔

صاحب کتاب نے Old Testament اور New Testament سے بھی محبت الٰہی اور ساتھ کے پڑوسی کی محبت کی یافت کی ہے۔انہوں نے بتایا کہ انجیل قدیم میں بھی محبت پر اصرار بدستور ہے۔توریت یہ ضرور کہتی ہے کہ خداوند کی محبت انہی کے نصیب میں ہوتی ہے جو اس کی دائمی حُبّ پر یقین رکھتے ہیں یہ خداوند کے عفو ورحم پر ہی عاجزانہ انحصار سے ممکن ہوتا ہے۔اسلام کی تو بنیاد ہی سلامتی، تسلیم و رضا اور اخلاص پر ہے یہاں تو بات ہی پوری کمٹ منٹ commitment کی ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب اپنے مہربان چچا سے کہا تھا''چچا جان اگر قریش میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند رکھ دیں تب بھی میں اپنے کام سے نہیں ہٹوں گا''۔ مصنف نے اس بیان کو عشق منصبی کی مثال کے طور پر صحیح چنا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو پیکر استقامت تھے پیکر عزم وعمل تھے، پیکر عشق تھے اس اعلان محبت سے آغاز ہوتا ہے سفر عشق۔انہیں (سفر عشق کے دوران) زندگی شعب ابی طالب ہی نہیں اعزّہ کے مقاطعہ، دشمنی، قتل تک سازشوں، ہجرت، شب بیداری، نفس کشی اور جانے کس کس گھاٹی سے گزارتی رہی۔تریسٹھ سال کی پوری زندگی

اس کا ایک منظر نامہ ہے۔ حد یہ ہے کہ خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''جتنا مجھے ستایا گیا اتنا کسی رسول خدا کو اذیت نہیں دی گئی۔''

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہر اس شخص نے پیار کیا جس کے دل میں بغض اور نفرت کی سیاہی نہ تھی کسی صحابیؓ نے عرض کی ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے آپ سے عشق ہے'' تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمنے ارشاد فرمایا ''ایسا ہے تو سختیوں اور مصیبتوں کو سہنے کیلئے تیار ہو جاؤ''

عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک صداقت ہے کہ مسلمان کا حق ہے مگر سفر آسان بھی نہیں آج ہر کہہ و مہ اعلان کر رہا ہے کہ میں عاشق رسول ہوں گویا۔ ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی۔ یا۔۔ نرغے میں آ گیا عشق اعظم۔ ہمارے درویش شاعر نے کہا تھا'' عشق لوکاں جاتا جیویں جھرلوا ے مداری دا''

مصنف ممدوح نے بڑی عمدگی سے اسلام کے اندر موجود عشقیہ عناصر سے بحث کرتے ہوئے ''ایمان' کو 'عشق' ہی کی صورت بتایا ہے۔

یہ مطالعہ تحقیقی اپنے خاتمے پر علامہ کے عشق محمدی ؐ سے سرشار شعروں کے ساتھ علامہ کی عام فارسی شاعری اور اس کے وسیلے سے عام ہونے والے پیغام تک جاتا ہے یوں اقبال کا فلسفہ بھی بیان ہو جاتا ہے۔ مجموعی طور پر 'عشق' سے 'عشق اقبالیات' تک یہ سفر ہے۔ میں اس سفر کی کامیابی پر راجہ صاحب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ نظم ونثر کے جتنے عالمانہ حوالہ جات سے وہ گذرے ہیں وہ ان کی محنت شاقہ پر دال ہے۔ ایسا اہم کام زبردست commitment کمٹمنٹ کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا

۔

انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد۔

پروفیسر ڈاکٹر احسان اکبر

اسلام آباد

حرف آغاز

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہٖ الکریم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سب سے پہلے تو مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ مجھے کچھ نہیں کہنا کیونکہ یہ جس پہاڑ کو میں نے ہاتھ لگا لیا ہے اس کی ہیبت، اس کی وسعت، اس کی فلک بوسی اور میری ذہنی سطح سے اس کی بلندی نے مجھے خوفزدہ کر دیا ہے۔ میرا دن سورج نکلنے سے شروع ہوتا ہے اور سورج کے غروب ہونے اور پھر سورج طلوع ہونے تک ہے۔ میری محنت کا میدان وہاں تک ہے جہاں تک میری آنکھیں، میرا ذہن، میری سوچ، یا میرا تخیل احاطہ کرتا ہے۔ میرے جسمانی اعضاء محدود طاقت کے حامل ہیں، میرے ہاتھوں کی قوت محدود ہے، میری آنکھوں کا دائرۂ بصارت محدود ہے، میرے اعصاب ایک حد تک چلنے کی مجھ کو اجازت دیتے ہیں، میں تھکتا ہوں، مجھے بھوک لگتی ہے، پیاس لگتی ہے، نیند آتی ہے، راستے یا محنت کی تھکاوٹ مجھے آرام کرنے پر مجبور کرتی ہے، سو میں جس جہان میں رہتا ہوں وہاں یہ ساری کیفیات۔ تکالیف، مصائب، رنج، راحت، خوشی و مسرت کے لمحے انسانی زندگی کا حصہ ہیں اور ہر انسان کی زندگی میں یہ سارے لمحے موجود ہوتے ہیں لیکن ''عشق'' کے اس پہاڑ کو ہاتھ لگانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں جہاں آ گیا ہوں وہاں یہ سب کچھ روا نہیں, یہ عشق کا جہان ہے, یہاں زندگی کے وہ معنی نہیں

جو ہماری دنیا میں رائج ہیں, یہاں یعنی جہانِ عشق میں زندگی محض سانس لینے کا نام نہیں ایک لگن کا نام ہے، یہاں موت کے معنی بھی وہ نہیں جو ہماری لغتوں میں درج ہیں کہ انسان فانی ہے یا فنا ہر ذی نفس کے انتظار میں ہے یا سی طرح کے دیگر تصورات، لیکن عشق کی دنیا میں موت اسی پہلے والی زندگی کے تسلسل کا نام ہے صرف رہنے کا جہان بدلتا ہے۔ یہاں موت سے مراد محض انتقال ہے ایک جہان سے دوسرے جہان کی جانب اور بس۔ زندگی جاری رہتی ہے، زندگی کا پہیہ رکتا نہیں، منتقل ہونے والے زندہ رہتے ہیں اور انہیں رزق دیا جاتا ہے ہاں، ہماری اس دنیا کے لوگ اس کا شعور نہیں رکھتے۔

ایک بات طے ہے کہ عشق کا تعلق انسان کی ذات سے تو ہے لیکن اس کے جسم کے ساتھ ہے ہی نہیں، کیونکہ یہ جسم تو محض ایک آلہ ہے یہ ایک Packing material ہے۔، packed material نہیں اور یہ اصل انسان بھی نہیں اصل انسان تو روح ہے اور روح کو کبھی وہ موت آ نہیں سکتی جس کا تصور ہمارے ذہنوں میں موجود ہے۔ روح انسانی جسم میں واقع ''دل'' کے مقام پر رہتی ہے لیکن اس کی نگاہ اس کی جائے استقرار تو پیش جمال لم یزال ہے، یہی اس کی منزل ہے اللہ جل جلالہٗ کا دیدار، حسن ازل کا دیدار ہی دراصل عشق کی حقیقی منزل ہے۔ اسی لئے انسان اللہ کا خلیفہ بنایا گیا اور انسان وہی ہے جو نیابت الٰہی کا اہل ہے۔ گویا نیابت الٰہی کا اہل صرف ''عاشق'' ہے۔ اعلیٰ ترین اور افضل ترین انسان کی تخلیق وجہ تخلیق کائنات ہے جو سراپا عشق ہے تو عشق ہی اصل کائنات ہے جس کو ممات نہیں۔

لہٰذا آپ بتایئے میں کچھ کہنے کے قابل ہوں؟ ہاں ایک اور بات، میں عاشق سے مراد وہی فلموں والا، ناولوں والا، قصے کہانیوں والا عاشق لیتا تھا لیکن یہاں تو عاشق کسی اور ہی سیارے کی مخلوق نظر آیا یہاں مجھے معلوم ہوا کہ عاشق کوئی معمولی درجے کی چیز نہیں۔ یہ عاشق وہ نہیں جسے ہم اپنی غزلوں یا دیگر شعری و نثری اصناف یا داستانوں میں پڑھتے سنتے آئے ہیں۔ میں اس تذبذب میں تھا کسے عاشق کہا جائے کسے نہیں۔ میں سخت مشکل میں تھا لیکن حضرت حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے عاشق کی تعریف کر کے میرے لئے آسانی پیدا کر دی۔

انہوں نے شاید میری یا مجھ جیسے کم فہموں کی مشکل کو بھانپتے ہوئے فرمایا تھا۔

عاشق آں نیست کہ لب گرم فغانے دارد
عاشق آں است کہ بر کف دو جہانے دارد
عاشق آں است کہ تعمیر کند عالم خویش
در نسازد بہ جہانے کہ کرانے دارد
دُرد من گیر کہ در میکدہ ہا پیدا نیست
پیر مردے کہ مئے تند و توانے دارد

اس کا ترجمہ بھی دیکھ لیجئے:

۱۔عاشق اسے نہیں کہتے جو اپنے لبوں سے نالہ وفریاد کرتا ہے بلکہ عاشق تو وہ ہے جو (اس رونے دھونے کی بجائے) دونوں جہان اپنی ہتھیلیوں پر رکھتا ہے۔

۲۔عاشق وہ ہے جو اپنی دنیا آپ تعمیر کرتا ہے اور دوسروں کی تعمیر کردہ دنیاؤں میں رہنے کو (توہین خیال کر کے) اختیار نہیں کرتا، وہ ایسی دنیا سے تعلق رکھتا ہی نہیں جس کی پیائش کی جاسکے، ماپی جاسکے (جس کی کوئی حدود مقرر ہوں، وزن رکھتی ہو، جگہ گھیرتی ہو)۔

۳۔مجھ سے میرے پیالوں میں بچی ہوئی تلچھٹ ہی لے لے (مجھ سے حکمت و دانائی کی باتیں لے، میں نے اپنی شاعری میں خودشناسی اور خداشناسی کی جو بات کی ہے اسے سمجھنے کی کوشش کر۔تمہاری تھوڑی سی کوشش تمہارے لئے عشق کا دروازہ کھول سکتی ہے) کیونکہ اس طرح کی شراب تجھے دنیا کے کسی دوسرے شراب خانے میں دستیاب نہیں ہے یہ شراب مجھ تک میرے اسلاف کے ذریعے پہنچی ہے اور ایسا ساقی (مرشد) تلاش کر جس کی شراب تیز اور تند ہو (معرفت الٰہی کے نشے سے بھرپور ہو)۔

ہماری اس دنیا میں جہاں ہم رہتے ہیں اور جس کی کامیابیوں خوشیوں، دکھوں اور مصائب کو ہم نے بہت زیادہ اہم سمجھ لیا ہے۔اس دنیا کی تکالیف، مصائب، مشکلات یا اس کے برعکس کیفیات یعنی خوشی، مسرت اور کامیابی میں سے تمام قسم کے جذبات کی دو جہات

ہیں، ایک ہمارے اوپر مرتب ہونے والی کیفیات اور دوسری سمت دوسروں پر مرتب ہونے والی کیفیات جن سے یا تو ہم خوش ہوتے ہیں یا رنجیدہ۔ عاشق کو نہ تو خود پر کسی قسم کی تکلیف یا خوشی کے اظہار کی اجازت ہے نہ اسے محسوس کرنے کی۔ عاشق کی کوئی جائے استقرار نہیں اس کا کوئی ایسا مقام نہیں، جہاں وہ رک سکے، سانس لے سکے، تھوڑی دیر تک سستا سکے، وہ تو ہر وقت حرکت میں رہتا ہے اور اسے تکان، یا دیگر سفری تکالیف پر بھی اپنی جبیں پر شکن تک لانا گوارا نہیں۔ ایک خیال آتا ہے کہ پھر ایسا شخص تو ہماری دنیا کا ہوگا ہی نہیں، تو جواب اثبات میں ہے اسے پہلے سے بنی ہوئی یہ دنیا، اس کی حدود، اس کی قیود کی کوئی پرواہ ہی نہیں، وہ تو اپنا جہان خود تعمیر کرتا ہے۔ اسے یہ بنی بنائی دنیا قبول ہی نہیں۔

اب یہ دنیا (عشق کی دنیا) ہے کیا؟ تو اس کا راستہ وہ ہے جو اس راستے کے جاننے والوں نے بتایا، اور اس کی راہ بھی سجھادی اور زادراہ بھی بتادیا۔ اس راستے کیلئے زادراہ کیا ہے ،اس راستے کے کسی بدرقہ یا رہنما کا وجود۔ گویا زادراہ اور راستے کی رہنمائی کیلئے مرشد کی شرط بھی لگادی گئی۔ راہ نوردان شوق کو اس ''تلچھٹ'' ہی کو غنیمت سمجھنا لازم ہے جو بزرگ، مرد حضرات کے پیالوں کی تہوں میں ہے۔

اس سارے منظر نامے کے برعکس ادھر ہمارا یہ حال ہے کہ ہم تکلیف میں نالہ وفریاد کرتے ہیں، روتے ہیں، خوشی میں خوش ہوتے ہیں ہنستے ہیں، کسی کے پیدا ہونے پر جشن مناتے ہیں کسی کے مرنے پر ماتم کرتے ہیں۔ لیکن جس مضمون کو میں نے ہاتھ لگانے کا جرم کیا وہاں تو ایسی کوئی کیفیت سرے سے ہے ہی نہیں۔ وہاں تو کیفیت ہی اس کے برعکس ہے بچہ دنیا میں آتے ہوئے روتا ہے اور دنیا سے جاتے ہوئے '' فُزْت وَ رَبِّ الْکَعْبَه ''(رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہیو گیا) کا نعرہ لگاتے ہوئے، مسکراتے ہوئے دوسری دنیا کی جانب چل دیتا ہے۔ اللہ اللہ خیر صلاّ۔

پہلا منظر علم کا، خرد کا، سوچ کا، سمجھ کا منظر ہے۔ اور دوسرا منظر عشق کا منظر ہے۔ جہاں فیصلے دماغ سے نہیں دل سے ہوتے ہیں۔ یہ معرکہ ازل سے ہے اور ابد تک جاری رہتا ہے

کوئی سالکِ رہ عشق جب عشق کے اس راستے کی طرف متوجہ ہوتا ہے، تو اسے ایک معرکے سے تعبیر کرتا ہے، اسے اہل خرد سے کیوں، کیسے، کس طرح اور اسباب وعلل والوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔

جیسا کہ حضرت علامہ اقبال کا ارشاد ہے:۔

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفےٰ ؐ عقل تمام بو لہب
گاہ بحیلہ می برد ، گاہ بزور می کشد
عشق کی ابتدا عجب عشق کی انتہا عجب
عالم سوز وساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگ آرزو، ہجر میں لذت طلب
عین وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا
گرچہ بہانہ جو رہی میری نگاہ بے ادب
گرمیٔ آرزو فراق، شورش ہائے و ہو فراق
موج کی جستجو فراق، قطرہ کی آبرو فراق

عشق کی اس دنیا میں تو دل کی بات ہوتی ہے عقل وشعور کی نہیں۔ ویسے بھی عقل اس دنیا میں قابل پزیرائی ہے ہی نہیں کیونکہ 'عقل'' عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے۔ اس کے برخلاف عشق کے ہاں صرف ایک رویہ ہے اور وہ صراط مستقیم پر چلتے ہوئے (**تواصو بالحق** کیلئے) ہر قسم کے مصائب ومشکلات کا سامنا کرنے کے باوجود صبر کے ساتھ (**تواصو بالصبر**) چلتے رہنا ہے اور وہ بھی صرف ایک دھن میں، منزل یعنی'' **وصل بالحق** '' کو پا لینے کی دھن، ہاں اس منزل عشق کی جانب سفر میں زاد راہ مرشد ورہنما کے فیضان نظر یا ہدایات کے علاوہ اخلاص عمل، حرکت، جہد مسلسل اور ایسی سعی پیہم جسے نتیجے کی کوئی پرواہ نہیں جیسے جذبے، اضطراب، محبوب کے دیدار کی تڑپ یہ سارے عوامل ہونا لازمی ہیں۔ عشق میں **وصل الی**

الحق یعنی حقیقی وصل کی بجائے وصال کے سراب کے لئے کوئی جگہ نہیں، طریق عشق میں ہجر، فراق سے زیادہ لذت آگیں ہے اس لئے کہ وصال عاشق کو اطمینان دیتا ہے اور اطمینان یا سکون سے اس کی آرزو مر جاتی ہے اور یہ عشق کی موت ہے جبکہ ہجر عاشق کو اضطراب دیتا ہے جو مزید کوشش پر ابھارتا ہے اور یہ مسلسل جدو جہد ہی دراصل عشق کا ثمر ہے تا آنکہ وہ لمحہ نہ آ جائے کہ جب اسے آخری اور حقیقی وصال نصیب ہو جائے، اسے اپنا سفر جاری رکھنا ہے (زمین کی سطح کے اوپر یا نیچے) راہ عشق میں اسے (قطرے کو) راستے میں بے شمار ندیاں نالے جھیلیں دریا آتے ہیں لیکن یہ سب آسودگیاں اسے سمندر تک پہنچنے اور سمندر سے مل کر سمندر ہونے سے نہیں روک سکتیں۔ اس لئے کہ اس کا سفر سمندر سے شروع ہوا تھا اسے لوٹ کر سمندر ہی تک پہنچنا ہے سو اس کی سمندر تک پہنچنے کی جدو جہد حقیقی عشق ہے، درمیان میں چھوٹی چھوٹی آسودگیاں دراصل اس کیلئے سراب ہیں جنہیں اسے نظر انداز کرنا ہوتا ہے ورنہ وہ اپنے عشق کی آخری منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔

انسانی زندگی میں انسان کی اپنی دنیاوی تمناؤں اور خواہشوں کی خوبصورت لڑیاں، دراصل یہی سراب ہیں یہی طول امل ہے جس کا علاج یا تو قناعت ہے یا موت۔ اگر انسان ان میں پڑ گیا اور انہیں ہی کو اپنی منزل قرار دے دے تو اس کا راستہ کھوٹا ہو سکتا ہے اس کو حاصل کچھ بھی نہیں ہوگا اور ''**و ما الحیٰو ۃ الدنیا الا متاع الغَرور** یعنی دنیاوی مال و دولت محض سراب ہیں اور کچھ بھی نہیں'' کی تنبیہ اسے انہی سرابوں کے پیچھے بھاگنے سے روکتی ہے۔ قرآن پاک کی تربیت کا یہی انداز ہے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین کرام اور امت کے بڑے اور رہ عشق کے شناور اسی ترتیب سے، اسی ترکیب سے سالک کی تربیت کرتے رہے ہیں اسے دنیاوی لذات، خواہشات کی پیروی، اور طول امل سے بچانے کیلئے۔ اور میں۔ جو ذرا سی بھوک، تھوڑی سی سردی، پیاس، اور تھوڑی سی گرمی، معمولی سا بخار یا سر درد برداشت نہیں کر سکتا، میں اپنی بری عادات سے جان نہیں چھڑا سکتا۔ تو میں نے کس بھرتے پر عشق کا تذکرہ کرنے کی ٹھانی ہے۔ ایسی مجھے سوجھی کیا؟ اور کیوں میں نے اس دنیا

میں جستجو کی ٹھانی ہے۔ وسیع وعریض اور انتہائی گہرے سمندر کی تہوں سے وہ سیپ ڈھونڈنے کی سعی کی ہے جو قطرۂ نیساں پیئے ہوئے ہے اور جس کے بطون میں ایک انمول گوہر پرورش پا رہا ہے۔ یہ عشق کی دنیا ہے۔ جہاں سورج عاشق کے تابع ہے، عاشق سورج کا محتاج نہیں گویا عشق زماں کا مطیع نہیں، چاند زمین، زمینی اور سمندری مخلوق، سارے حیوانات اس کے مطیع ہیں۔ ایک عرب شاعر نے ہماری دنیاوی زندگی کا ایک خوبصورت تجربہ بیان کیا ہے آپ بھی محسوس کیجئے:

وَ لَمَّا نَزَلْنا مَنْزِلًا طَلَّهُ النَّدٰی
اَنِیْقاً وَّ بُسْتاناً مِّنَ النُّوْرِ حالِیاً
اَجِدُ لَنَا طِیْبَ المَکَانِ وَ حُسْنُهُ
مِنِّی فَتَمَنَّیْنَا فَکُنْتُ الامانیاً

(شاعر نامعلوم ''نقوش اقبال'' مولینا سید ابوالحسن ندوی صفحہ ۱۸۸)

ترجمہ: جب ہم شبنم سے شاداب مقام اور پھولوں اور غنچوں سے مہکے ہوئے باغ میں اترے۔۔تو حسن مقام کی وجہ سے ہمارے دلوں میں آرزوؤں اور تمناؤں نے ڈیرے ڈال لئے اور ان آرزوؤں کا اصل مرکز تم ہی تھے۔

اب ضمیر مخاطب پتہ نہیں دنیا کی جانب ہے، دنیاوی لذات اور اس متاع غرور سے بے رغبتی کی ترغیب ہے، کسی دنیاوی محبوبہ کی جانب ہے یا دنیا میں انسان کے ھبوط کی غایت اولیٰ یعنی عشق اور اس کی آخری منزل کے حصول کی جدوجہد ہے۔ خالق کے فرمان کے مطابق کامیاب زندگی گذار کر خالق کی جانب واپسی کی جدوجہد اور اس ارشاد کا انتظار ''یا ایتھا النفس المطمئنة 0 ارجعی الیٰ ربّکِ راضیةً مرضیة 0 فالدخلی فی عبادی والدخلی جنتی 0'' (القراٰن سورة الفجر ۸۹.۲۷.۳۰)

ترجمہ: اے نفس مطمئنہ اپنے پروردگار کی جانب خوشی خوشی چلا آ پس (فوراً) میرے خاص بندوں میں شمار ہو، اور جنت میں داخل ہو جا۔ (اور جنت میں سب سے بڑا انعام دیدار

خداوندی ہے) اور یہی عشق کی اصلی منزل ہے۔ پس یہی سمندر، پانی کے قطرے کی آخری منزل ہے۔

یہ دنیا جس کا میں نے تذکرہ کرنے کی سبیل کی ہے، اس کی باتیں بہت عجیب لگتی ہیں، یہاں زمانے کی تین مروجہ حالتیں یعنی ماضی، حال اور مستقبل نہیں ہیں جنہیں ہم بچپن سے ساری زبانوں کی ساری درسی کتب میں پڑھتے چلے آرہے ہیں اور یہاں؟ یہاں تو صرف ایک ہی زمانہ ہے اور وہ ہے حال کا زمانہ (نہ کوئی لمحہ گذرا ہوا لمحہ ہے نہ کسی لمحے کے آنے کا انتظار ہے)۔ بس یہی ایک لمحہ جس میں آپ ہم جی رہے ہیں اور یہ لمحہ غیر فانی ہے اسی کو ایک ''آن بسیط'' کہتے ہیں۔ عشق کے جہان والوں کے نزدیک وقت کو زمانوں میں ڈھالنے والا آلہ ''سورج'' ہے جو خود فانی ہے، سورج کے طلوع وغروب سے موجودہ زمانے تشکیل پاتے ہیں جو ہمارا واہمہ ہے کیونکہ زمانہ یا وقت تو لافانی ہے اور اسے ماپنے والا آلہ یعنی سورج فانی ہے لہٰذا یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ ایک لافانی چیز کو ایک فانی شے ماپ سکے۔ سو عشق کے جہان میں صرف ایک زمانہ ہے اور وہ ہے حال کا زمانہ۔ اور وہ ناقابل پیائش ہے، ناقابل احاطہ ہے علامہ اقبال کا ارشاد ہے:

باز بہ پیما نہ ٔ لیل و نہار
فکر تو پیمود طول روزگار
تو کہ از اصل زماں آگاہ نہٖ
از حیات جاوداں آگاہ نہٖ
اصل وقت از گردش خورشید نیست
وقت جاوید است و خور جاوید نیست
وقت را مثل مکاں گستردہ ای
امتیاز دوش و فردا کردہ ای

ترجمہ۔ا: تو سورج کی حرکت کے پیمانے سے رات اور دن کی پیائش سے دور رہ

۔تیرے اس عمل یا فکر سے صرف دنیاوی زندگی کی لمبائی ماپی جاسکتی ہے اور کچھ نہیں۔

۲۔تو اس طرح زمانے کی اصل حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا اور نہ لافانی زندگی کی حقیقت کو جان سکے گا (کیونکہ زندگی فانی نہیں، لافانی ہے اور فانی چیز لافانی شے کی حقیقت کے بارے میں نہیں جان سکتی۔کائنات کے جملہ مظاہر فانی ہیں بلکہ خود یہ ارضی کائنات بھی فانی ہے)۔

۳۔وقت سورج کی گردش سے نہیں ماپا جاسکتا۔کیونکہ وقت ایک لافانی حقیقت ہے اور سورج ایک فانی آلہ ہے۔

۴۔یہ دنیا وقت کیلئے مثل مکاں آراستہ کی گئی ہے اور اس میں ماضی اور مستقبل (کے دو کھلونے) پیدا کئے گئے ہیں اور ان میں امتیاز پیدا کیا گیا ہے۔

قارئین کرام :ادھر میں ٹھہرا اسی فانی دنیا کا باسی جو پیدا ہوا پل پل بڑھا میرے سامنے میرے بڑے اور مجھ سے چھوٹے یہاں سے دوسرے جہان منتقل ہوئے اور وہ ماضی ہو گئے میرا بچپن،لڑکپن اور جوانی ماضی میں ڈھل گئے اور میرا مستقبل میرا انتظار کر رہا ہے میرے تو تین زمانے ہیں، ماضی ایک حقیقت ہے، حال ایک حقیقت ہے جس میں میں جی رہا ہوں اور مستقبل ایک حقیقت ہے اور بڑی بے تابی سے میرے انتظار میں ہے پھر میں اپنے مستقبل کے حوالے ہو جاؤں گا اور دوسروں یعنی پیچھے رہ جانے والے لوگوں کیلئے میں ماضی بن جاؤں گا۔میری حالت یہ ہے کہ میرا ہر لمحہ فانی ہے آگے سرکنے والا ہے اور میں باتیں کرنے چلا ہوں لافانی دنیا کی،اب آپ ہی بتایئے میں اپنی طرف سے کیا کہہ سکتا ہوں بس بڑوں اور برگزیدہ ،روشن ضمیر حضرات نے جو ارشاد فرمایا اس سے کچھ استخراج کر کے آپ کے سامنے حاضر کر دیا ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔

تھوڑا ذکر ''عشق دم جبرئیل'' کا کروں تو اس کی تخلیق کا سبب علامہ اقبالؒ کا یہ شعر بنا:

عشق دم جبرئیل ،عشق دل مصطفیٰؐ
عشق خدا کا رسول،عشق خدا کا کلام

اس شعر میں اسی عشق کا تذکرہ ہے جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں یہاں عشق کی چار

حیثیتوں یا چار خواص کا ذکر ہے، یعنی دم جبرئیل، دل مصطفیٰؐ، خدا کا رسول، اور خدا کا کلام۔ زیر نظر کتاب میں اختصاراً انہی باتوں یعنی ''عشق'' (دم جبرئیل۔ دل مصطفیٰؐ، خدا کا رسول اور خدا کا کلام) کا تذکرہ ہے۔

عشق دمِ جبریلؑ

حضرت جبرئیل علیہ السلام جو اللہ کے مقرب ترین فرشتہ ہیں، اللہ کی طرف سے اللہ کے رسولوں تک اللہ کا پیغام پہنچانے کے ذمہ دار ہیں اور یہ ذمہ داری اللہ نے یونہی نہیں دے دی ان کے اندر اس امانت کو سنبھالنے، اس امانت کو بحفاظت پہنچانے کی قوت پیدا کی اور انہیں تمام فرشتوں کی سرداری پر فائز کیا تب انہیں یہ ذمہ داری دی۔ ان کے اوصاف کیلئے اللہ نے سورۃ تکویر میں ارشاد فرمایا: '' اِنّہٗ لَقَوْلُ رَسُولٍ کَرِیْم 0 ذِی قُوَّۃٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَّکِیْن 0 مُطَاعٍ ثَمَّ اَمِیْن 0 وَمَا صَاحِبُکُمْ بِمَجْنُوْن 0وَلَقَدْ رَاٰہُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْن0

(القرآن سورۃ التکویر پارہ ۳۰)

(نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک یہ امانت پہنچانے والے نے ٹھیک ٹھیک امانت پہنچائی کیونکہ یہ کلام جس واسطے سے رسول تک پہنچا) وہ پیغام برعزت والا ہے 0 وہ بڑی قوت والا ہے وہ عرش کے مالک کے پاس اعلیٰ درجے والا ہے 0 سب کا مطاع ہے (سب اس کے مطیع ہیں) اور وہ اعلیٰ درجے کا امین ہے 0 اور (اے محبوب ﷺ) آپ کا رفیق دیوانہ نہیں (اللہ کا عاشق صادق ہے) 0 وہ جب اپنے (پروں کو پھیلائے) تو دیکھے آفاق کو کھلا کھلا، ظاہر، اس میں ذرہ ذرہ۔ (جیسا کہ محترم پروفیسر احسان اکبر مدظلہٗ نے ارشاد فرمایا) دم جبرئیل کے اور معانی بھی ہو سکتے ہیں یعنی ان کی سانس (پھونک) بھی اپنے رب کے حکم کے مطابق زندگی بخش تھی۔ حضرت مریم سلام اللہ علیہا کی آستین میں حضرت جبرئیلؑ کی پھونک حضرت

عیسیٰ ؑ کی زندگی کی پھونک تھی۔حضرت جبرئیلؑ عقل اول ہیں مگر وہی عشق کی علامت بھی ہیں کہ خداوند تعالیٰ کے کلام کی برداشت عقل محض کے بس میں ہے ہی نہیں۔ایک ایسی ذمہ داری جسے اٹھاتے ہوئے پہاڑ لرزنے لگے، وہ انسان نے اٹھالی اور عقل محض والا انسان تو ظالم اور جاہل ہے۔

عشق دل مصطفٰے (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

وہ دانائے سُبل مولائے کُل ختم الرسلؐ جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا
نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

علامہ اقبال :کلیات اقبال اردو :بال جبریل (حصہ دوم) :''مزار حکیم سنائیؒ پر'' ۳۶۳/۲۹

اللہ کا رسول ایسا ہے کہ وہ عشق کے راستے کا جاننے والا ہے، جس کی منزل اللہ کا وصل ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سارے جہاں کے آقا اور سارے انبیاء کے خاتم ہیں، (گو وہ سب سے آخر میں تشریف لائے) لیکن نگاہ عشق (خالق کائنات کی نگاہ) میں اور مستی کی نگاہ (متبعین کی نظر میں) وہی آخری منزل ہیں۔وہ سب سے پہلے خلق کئے گئے اور سب سے آخری رسول کی حیثیت سے دنیا میں تشریف لائے۔وہ اللہ کا پیغام سراپا، اللہ کی دلیل سراپا ،وہی یاسین اور طٰہٰ ہیں

اللہ جس کا وصل ہر عاشق صادق کی منزل ہے، (الہامی کتب) اس کا کلام، اس کا منشور ،اس کی کتاب ہے جو اس منزل کی جانب رہبر ہے جسے سلوک کہتے ہیں اور اس کو رہبر کامل تک پہنچانے کی ذمہ داری ایک باعزت، باوقار، مطاع، امین اور اہل ترین بارگاہ الٰہی میں مقبول ترین فرشتے کو سونپی گئی اور جسے سونپی گئی وہ ہستی یعنی نبیٔ پاک صلی اللہ علیہ وسلم خالق ازل کے بعد اس کی مخلوق میں بزرگ ترین ہے۔

اس رہبر کامل ؐ نے جس طرح اسے انسانیت تک پہنچایا اس کی مثال ملنا ناممکن ہے۔اللہ کا رسول ؐ فی نفسہٖ باقی مخلوق کیلئے عشق کی معراج ہے انہی کی اتباع یا اطاعت سے انسان کیلئے ممکن ہے کہ وصال الی الحق کی منزلوں کا سفر کرے اس طرح انسان انسانیت کی معراج یعنی خلافت الٰہیہ کے منصب کو بھی پالیتا ہے اور ''ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ'' کا مصداق بن سکتا ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم سے بے پناہ محبت اصل ایمان ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے عشق اللہ کا حکم بھی ہے اور مومن کی احتیاج بھی۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات اقدس عشق منزل بھی ہیں اور اللہ سے عشق کی منزل کیلئے صراط منزل بھی۔یہی وہ عشق ہے جو عاشق کو وصل باللہ کی راہ دکھاتا ہے۔ **قل ان کنتم تحبون اللّٰہ فاتبعونی یحببکم اللّٰہ**

عشق خدا کا رسول ؐ۔۔۔عشق خدا کا کلام

اللہ کا کلام عشق کا نصاب ہے اور سنت نبوی ؐ کی اتباع عشق کا راستہ اور بس! اس سے زیادہ انسان سے مطلوب بھی نہیں۔ایک دنیا جو ہمیں نظر آتی ہے جس میں اسباب ہی سب کچھ ہیں سورج سے روشنی، فضا سے ہوا، زمیں سے غذا، زمین پر عہدے، منصب، اختیار، جسمانی خوبصورتی وغیرہ وغیرہ لیکن یہ سب کچھ تو ایک محدود اور مستعار دی گئی مدت تک ہے۔ غیر فانی خالق جو حقیقتاً حسن ازل ہے وہ انسان کو اپنا نائب بنا کے دنیا میں لایا ہے اپنی صفات سے متصف کر کے۔پھر وہ اس کو ہمیشہ کیلئے کیسے فنا کرے گا؟ اور کیوں کرے گا؟اس نے تو عشق کا بیج اس لئے بویا کہ ہر ذرہ اس کی جانب لوٹ جانے کو ہمیشہ پیش نظر رکھے اور اس کیلئے بے تاب رہے اور یہ ذرہ یا قطرہ پھر سے سمندر میں مل کر سمندر کہلا سکے یا ذرہ صحرا بن سکے۔اور غیر فانی ہو جائے ''انا للّٰہ و انا الیہ راجعون'' (بے شک ہم اللہ ہی کے لیے ہیں

اوراسی کی جانب لوٹ کر جانا ہمارے لیے طے ہے) کا یہی مفہوم ہے۔

ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ، ایک لامتناہی زندگی اس کی منتظر ہے اس میں کامیاب زندگی کا ایک طریقہ بتادیا ہے جو اس نے آدمؑ کو جنت سے نکالنے کے وقت سمجھا دیا تھا'' **و قلنا اھبطو منھا جمیعاً فَاِ مّا یأتینکم منی ھُدیً فمن تبع ھُدایَ فلا خوف علیھم و لا ھم یحزنون 0'' القرآن سورہ البقرۃ ۲:۳۸**

ترجمہ : اور ہم نے کہا جاؤ سارے کے سارے پھر میں وقتاً فوقتاً تمہاری رہنمائی کیلئے ہدایات (اپنے رسولوں کے ذریعے) بھیجتا رہوں گا لہٰذا جو کوئی بھی ان ہدایات کے مطابق زندگی گذار کے آیا تو اسے اپنے گذرے وقت پر کوئی پچھتاوہ نہیں ہوگا اور نہ اسے آئندہ کا کوئی خوف دامن گیر ہوگا۔

یہ ہدایت نامہ دراصل عشق کا منشور ہے ۔ جو ایمان وعمل کی بنیاد بنتا ہے ۔ایمان، اطاعت الٰہی ، اطاعت رسولؐ یہ سب عشق کی دنیا ہے۔ اسے لفظوں کے کمزور سہارے یا تاویل کی ضرورت نہیں ، دل کی ضرورت ہے جذبے کی حاجت ہے، یہی اس سفر کا زادراہ ہے اللہ کا کلام بھی عشق، اللہ کا پیغام پہنچانے والا فرشتہ بھی عشق سے لبریز، اللہ کا رسولؐ بھی عشق صادق کی سب سے بڑی علامت سب عشق ہی عشق ۔ بس عشق کی اس دنیا میں قدم رکھنے ہی سے اس کی اصل افادیت کی سمجھ آسکتی ہے اور یہ کوئی آسان کام نہیں:

وادیٔ عشق بسے دور ودراز است و لے

طے شود جادۂ صدسالہ بہ آہے گاہے

''وادیٔ عشق بہت طویل ہے ، بہت دور ہے راستہ بہت دشوار گذار ہے اسے طے کرنا کوئی آسان کام نہیں لیکن جب دل میں عشق بیدار ہوجاتا ہے تو یہ طویل راستہ ، یہ دشوار گھاٹی ایک آہ مستانہ سے طے ہوجاتی ہے''۔

زمین کی طنابیں کھینچ لی جاتی ہیں ، سلوک کی منازل یوں چشم زدن میں طے ہوجاتی ہیں ، برسوں کا سفر لمحوں میں طے ہوجاتا ہے۔ جیسے دین کے بڑے ، بزرگ پل صراط کی مثال دیتے

ہیں کہ اس کا سفر پندرہ سو برس کا ہے اور وہ پل تلوار سے زیادہ تیز، بال سے زیادہ باریک ہے۔اس کے نیچے جہنم دہک رہا ہے لیکن توفیق الٰہی اس پل سے عشق الٰہی کو ایک لمحے میں پار اتار دیتی ہے کہ پار پہنچنے والا کہتا ہے ہم نے پل صراط کا سنا تھا وہ کیا ہوا؟ تو اسے بتایا جاتا ہے تم تو وہ پل عبور کر آئے ہو تو وہ حیران ہو جاتا ہے پس صراط عشق، پل صراط کی مانند ہے مگر توفیق الٰہی، عشق الٰہی سے لبریز دلوں کو بھلا کب تکلیف میں دیکھنا چاہے گی فوراً مدد کو پہنچتی ہے ہاں اگر دلوں میں اصلی شہد کی بجائے راب بھری ہوئی ہو تو اس منزل کی جانب ایک قدم بھی اٹھانا محال ہے قدم منوں بھاری ہو جاتے ہیں اور راستے کی ٹھوکریں مقدر ٹھہرتی ہیں۔

عشق توفیق الٰہی کا محتاج ہے کہ اللہ ہی منزل ہے، اللہ ہی کی جانب سفر ہے اسی کے رسول رہبر و رہنما ہیں تو اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر بھلا کوئی وہاں تک جانے کا سوچ بھی کیسے سکتا ہے؟ آلودہ دلوں کو وہاں قبول نہیں کیا جاتا پہلے دلوں کو یہاں دنیا میں مانجھا جاتا ہے اس میں تھوڑی تکلیف کا سامنا ہو سکتا ہے اور یہ بھی کہ یہ سفر عشق مرشد کی فیض نظر کے بغیر طے نہیں ہو سکتا عاشق منزل پر پہنچ کر سوچتا ہے۔

عشق شورانگیز راہر جادہ در کوئے تو برد
برتلاش خود چہ می نازد کہ رہ سوئے تو برد

ترجمہ: ''میرے پرشور عشق کو ہر راستہ خود تیری گلی کی طرف لے گیا میں بھلا اپنے عشق پر کیا ناز کرتا جب کہ مجھے تو عشق خود ہی تیری جانب، تیری گلی میں لے گیا۔''

اب اس میں کمال تو عشق کا ہے عاشق کا کیا کمال ہے؟ کمال منزل کا ہے مسافر کا تو نہیں۔ پس بارگاہ باری میں عشق کے راستے کے فہم کی التجا ہے اور میں کہ سرتاپا گناہوں میں ڈوبا ہوا، طرح طرح کے وسوسوں کا مارا ہوا، سراب کی دنیا کا مکین، میں تو یہ دعا بھی کرنے کا استحقاق بھی نہیں رکھتا۔

ضربتے باید کہ جان خفتہ برخیزد زخاک
نالہء کہ بے زخمہ از تار رباب آید بروں

ترجمہ: عشق کی کوئی ایسی ضرب چاہیے جو جسم خاکی کے اندر خفتہ روح بیدار کردے (ایسی ضرب کیلئے کسی مرد کامل کی نظر درکار ہوگی) کیونکہ مضراب کے بغیر رباب کے تاروں سے نغمات عشق کس طرح باہر آئیں گے۔

بھلا میرے خاکی جسم کو جو دنیا کو اوڑھ چکا ہو اور دنیا کو اپنا سب کچھ سمجھ چکا ہو، دنیا کے مال ومتاع، اقتدار واختیار کو منزل گردانتا ہو، تھوڑی سی لمحاتی خوشی کو دائمی خوشی پر محمول کرتا ہو اور ذرا سی مصیبت پر گھبرا کر شکوے شکایت پر اتر آتا ہو، اس کو عشق کے جہان بے بدل کے متعلق محض بیان سے کیا فرق پڑنا ہے؟ اس کے دل کا زنگ کیسے اترے گا؟ میرے جیسے کم فہم اور زنگ آلود دل کے مالک کو کسی کے فیضان نظر کی شدید ضرورت ہے۔ اللہ کے کسی خاص بندے کی ضرورت ہے جو مجھ گناہوں میں ڈوبتے شخص کا ہاتھ پکڑ کر اس گناہوں کی دلدل سے نکال باہر کرے۔ کاش میں کسی بندے کی توجہ حاصل کرنے کے قابل ہوسکوں۔ یہ تو قسمت کی بات ہے یا قدرت اگر مجھے ''حکمت یا ہدایت'' عطا کئے جانے کے قابل سمجھے جس کا میں طالب ہوں: ارشاد خداوندی ہے:

یؤتی الحکمة من یشاءُ و من یؤتَ الحکمة فقد اُوتی خیراً کثیراً .....(سورۂ آل عمران پارہ۳)

ترجمہ: جسے چاہتا ہے (اور جس کو طلب حکمت ہو) وہ حکمت عطا کرتا ہے اور جسے حکمت دی جاتی ہے پس یقیناً اسے گویا خیر کثیر عطا کی گئی۔

اور میں اس حکمت کے ذرہ برابر کی عطا کیلئے دامن پھیلائے دعا گو ہوں۔

ایک بات آپ سے ضرور گذارش کروں گا وہ یہ کہ بہت عرصہ پہلے ایک اللہ والے نے کسی کے ہاتھ مجھے پیغام بھیجا تھا کہ میں جا کے ان سے مل لوں بس ایک لمحے کی دیر ہوگئی میں پیغام لانے والے کی بات پر توجہ نہ دے سکا۔ اور جب ان سے ملنے کا ارادہ کیا تو وہ اللہ والے اس دنیا سے اگلے پڑاؤ کی جانب سفر کر چکے تھے، میں اپنی ناسمجھی اور تساہل کی وجہ سے ایک بڑی سعادت سے محروم رہ گیا۔ لیکن ذرا دیر میں بہت زیادہ دیر ہوگئی تھی، بہت دیر میں حضرت

علامہ اقبال کے اس شعر کا معنی سمجھ میں آیا ‘

عشق فرمودۂ قاصد پہ سبک گام عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنیٔ پیغام ابھی

میں اپنی اس کوتاہی پر آج تک کف افسوس مل رہا ہوں اگر میں اس فرمودۂ قاصد پر سبک گام عمل ہو جاتا تو شاید میں رہ عشق کو سمجھنے کے قابل ہو سکتا۔ مگر کاش!۔۔۔۔

ہاں آپ سے درخواست ہے کہ چونکہ آپ میرے لئے مستجاب الدعوات ہیں میرے لئے دعا فرمائیں اللہ آپ کی ضرور سنے گا دوسری بات کہ اس کتاب میں اگر کوئی ایک بھی کام کی چیز کسی کے کام آ گئی اور اس نے اپنی سمت درست کر لی تو میرا بیڑا پار ہو جائے گا۔ کاش ایسا ہو جائے اور میں بھی کسی مرد کامل کے فیضان نظر کے قابل ہو سکوں !

میں علامہ اقبال کے ارشاد پر اپنی گفتگو کا اختتام کرنا چاہتا ہوں جو انہوں نے عاشق اور عشق کے بارے میں فرمایا:

راہرو کو داند اسرار سفر
ترسد از منزل ،ز رہزن بیش تر
عشق در ہجر و وصال آسودہ نیست
بے جمال لایزال آسودہ نیست
ابتدا پیش بتاں افتادگی
انتہاء از دلبراں آزادگی
عشق بے پرواہ و ہر دم در رحیل
در مکان و لا مکاں ابن السبیل
کیش ما مانند موج تیز گام
اختیار جادہ و ترک مقام

ترجمہ:ا۔ وہ مسافر جسے سفر کے رازوں کا علم ہے وہ راستے کے لٹیروں سے اتنا نہیں ڈرتا

جتنا منزل سے (منزل کی جانب سفر کی مشکلات سے، اپنی لغزشوں سے) ڈرتا ہے۔

۲۔عشق ہجر و وصال دونوں میں آسودگی نہیں پاتا وہ جمال لایزال (حسن مطلق) کے دیدار یا وصل کے بغیر ہمیشہ بے چین رہتا ہے اور مطلق آسودگی نہیں پاتا۔

۳۔عشق کی ابتدا بتوں کے آگے جھک جانے سے ہے (حسینوں کی زلف گرہ گیر کا شکار ہوتا ہے) اور اس عشق کی انتہاء ان دلبروں اور حسینوں سے آزادی ہے۔

۴۔عشق بے پرواہ ہے اور ہر دم سفر میں رہتا ہے خواہ مکاں (دنیا) ہو یا لا مکاں (آخرت)، وہ ہر جگہ مسافر ہے۔

۵۔ ہمارا (اہل عشق کا) مسلک تیز بہنے والی موج جیسا ہے یعنی راستہ اختیار کرنا اور منزل کے خیال کو چھوڑ دینا، اور۔ چلتے رہنا۔اور مسلسل چلتے رہنا ہے۔

بس یہی کچھ میرا مایۂ حیات ہے۔اگر اللہ کے کسی خاص بندے کی توجہ ہوگئی۔اور اس ہستی نے مجھے کسی قابل سمجھا تو میرے دل سے دنیا کی غلاظتیں دور ہو جائیں گی اور مجھے اس کی امید بھی ہے۔

حضرت علامہ اقبال نے حضور حق میں جو التجا کی تھی میں بھی وہ الفاظ اپنے لئے دہراتا ہوں آپ آمین کہئے کہ آپ میرے لئے مستجاب الدعوات ہیں۔اللہ سے امید ہے کہ وہ میری اس التجا کو بھی قبول فرمائے گا۔

بہ پایاں چوں رسد ایں عالم پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضورؐ خواجہ ما را
حساب من ز چشم او نہاں گیر

ترجمہ:

جب یہ شخص اس جہاں سے اُس جہاں (محشر) میں پہنچے اور ہر پوشیدہ تقدیر 'عمل' ظاہر ہو جائے تو اے اللہ میاں مجھے میرے آقا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رسوا مت

کیجئے ،'بس میری التجا ہے کہ میرا حساب ان کی نگاہ سے پوشیدہ رکھئے'' کہیں ایسا نہ کہ میں امت محمدیہ سے خارج کردیا جاؤں یا حضور نبی اکرمؐ میرے اعمال کی وجہ سے حضور حق میں شرمندہ ہوں''

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روز محشر عذر ہائے من پذیر
ور حسابم گر تو بینی نا گزیر
از نگاہ مصطفٰے پنہاں بگیر

ترجمہ:اے مرے اللہ ! تو تو دونوں جہانوں سے بے نیاز ہے، بے پرواہ ہے (کسی کے نیک یا برے اعمال سے تجھے کچھ فرق نہیں پڑتا، نہ تو تیرے مرتبے میں اضافہ ہوتا ہے نہ کمی)اور میں ایک بے کس، بے بس فقیر۔کل قیامت کے دن مرے برے اعمال سے صرف نظر کرنا۔ پھر بھی اگر تو دیکھے کہ مرے اعمال کا احتساب ناگزیر ہے تو میرا حساب کتاب نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہوں سے دور لیجیے گا (کہ میری وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کے حضور شرمندہ نہ ہوں کہ ان کا ایک امتی اتنے برے اعمال کے ساتھ حشر کے میدان میں چلا آیا)

میں اپنے ان تمام دوستوں اور کرم فرماؤں کا شکر گذار ہوں جنہوں نے اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں میری بہت مدد کی ۔ ان میں میرے ادارے طلوع ادب کے تمام دوستوں خصوصاً دلشاد اریب، ایم اے اردو، تاریخ، اسلامیات۔ایم فل (لیکچرر اسلامیات) کہ جن کی عربی علوم پر گہری نظر ہے اور تصوف کے معاملات سے بھی باخبر ہیں۔عزیزم سید شہباز گردیزی قدم قدم پر میرے معاون رہے وہ ایک پائے کے شاعر اور نثری ادب کے گہرے سمندروں کے پیراک ہیں۔ ان کے علاوہ حضرت مولانا امین الحق فاروقی (مہتمم دارالعلوم تعلیم القرآن باغ) ،حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ (خطیب مرکزی جامع مسجد باغ)،محترم محمود حسین میر ہمدانی جو عربی ادب اور تصوف کے حوالے سے کثیر المطالعہ شخص

ہیں۔مولانا مفتی یاسر الیاس، مولانا مفتی سید بشیر حسین شاہ ،مولانا مفتی شمس الحق (اساتذہ دارالعلوم باغ) اور مولانا قاری عبدالغفور (اب مرحوم) ایسے متبحر علماء جن کی تصوف اور علوم عربیہ پر گہری نظر ہے ان سے مجھے بہت رہنمائی ملی۔ان کے علاوہ تاریخ کے استاد ڈاکٹر محمد شکیل (ایم۔اے، پی ایچ ڈی۔صدر شعبہ تاریخ گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج برائے طلبہ باغ)، سید وجاہت گردیزی (ایم اے، ایم فل، ریسرچ سکالر۔ شعبۂ اردو گورنمنٹ ماڈل سائنس کالج باغ)، کا بطور خاص ممنون ہوں کہ انہوں نے میری اس کوشش کو سنوارنے میں میری بہت مدد کی اور اپنے مفید مشوروں سے مجھے نوازتے رہے۔

آخر میں، میں تمام اہل فکر ونظر حضرات سے درخواست گذار ہوں کہ اسے ضرور پڑھیے اور جہاں کہیں سہو ہوا ہو، نادانستگی میں کوئی غلط جملہ یا حرف لکھا گیا ہو اس کی نشاندہی ضرور فرمایئے اللہ آپ کو ہمیشہ، ہنستا مسکراتا رکھے۔آمین ثم آمین

آپ کی توجہ اور دعاؤں کا طالب
محمد شفیق راجہ باغ آزاد کشمیر
profshafiqueraja@g.mail,com
0344 9884547,05-823-442195

نہ باصحرا سرے دارم، نہ باگلزار سودائے
بہر جا میروم از خویش میبالد تماشائے

میرزا عبدالقادر بیدلؔ

ترجمہ: نہ مجھے صحرا (کی وسعت، ویرانی، بے رنگی، تصور رنج وغم) سے کوئی سروکار ہے نہ مجھے باغ (کی رنگینیوں، خوشبو، تصور راحت) کا خبط ہے میں جہاں کہیں جاؤں نظارے میرے اندر سے اگ کر باہر آتے ہیں۔

باب اول

تفہیم عشق

۱۔ تصور عشق
۲۔ اسلام میں تصور عشق
۳۔ مختلف مذاہب میں تصور عشق

عشق

ہے ابد کے نسخۂ دیرینہ کی تمہید عشق
عقل انسانی ہے فانی زندۂ جاوید عشق

عشق ایک دریا ہے جو پایاب نہیں، ایک سمندر ہے جو قابل عبور نہیں ایک لہر ہے جو انسان کے دل کے اندر اٹھتی ہے اور اسے طوفان آشنا کرتی ہے، عشق باغوں کو بہار دیتا ہے، عشق جنگلوں کو ستاروں کی مانند پیچ در پیچ کلیاں اور رنگ برنگے غنچے عطا کرتا ہے، عشق کے سورج کی ایک کرن سمندر کی گہرائی کو چیر سکتی ہے، عشق سمندر میں موجود مچھلی کو سمندر کی گہری تہوں میں راستہ دیکھنے والی آنکھ بخشتا ہے گویا کائنات میں ہر جگہ عشق ہی کی جلوہ گری ہے، عالم عشق میں چند لمحوں میں وہ بات حاصل ہوسکتی ہے جو عمر بھر کی ذہنی کاوشوں اور عمر بھر کی بے ریا سطحی ریاضتوں سے بھی حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس عالم میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ ایک آدمی جو دنیاوی اعتبار سے، لوگوں کی نظر میں راندہ ہوا ہو اس پر کسی عشق والے کی کیمیا اثر نظر پڑی اور اس کی کائنات تبدیل ہوگئی اور لمحوں میں، اسے دیکھنے والے کسی دوسری ہی دنیا کا انسان سمجھنے لگے فیضان نظر سے پہلے اور بعد کی دنیاؤں میں زمین آسمان کا فرق نظر آ گیا۔ ایسے کرشماتی نظارے صرف عشق ہی کی بدولت نظر آتے ہیں۔ عشق تمام امراض ظاہری و باطنی کا علاج ہے۔ اپنی شہرۂ آفاق مثنوی میں مولانا رومؒ عشق کی انہی صفات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

شاد باش اے عشق اے سودائے ما
اے طبیب جملہ علت ہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما
اے تو افلاطون و جالینوس ما

ترجمہ: اے میرے جنون اے میرے جذبۂ عشق تو ہمیشہ توانا رہے تو میرے تمام امراض کا علاج ہے، بلکہ تو تو میرے جملہ امراض کی دوا ہے۔تو میرے ہونے، میری پہچان، میری انا اور میری فکر میں ترقی کا سبب ہے،تو میرا غرور ہے، میری متاع غرور ہے جس پر میں فخر کرسکتا ہوں۔تو میرے لئے سب سے بڑی دولت ہے،تو میرے لئے دنیا کے بڑے اور عظیم حکماء واطباء ودانشوروں (افلاطون وجالینوس جیسے) سے زیادہ بڑا ہے۔''۔

یہ جذبہ جس کی اتنی پرزور وکالت مولانا رومؒ اوران کی طرح ان سے پہلے اور بعد کے زمانوں میں بیشتر مختلف مکاتب کے مختلف مذاہب کے علماء، فقہاء،صوفیاء ،فلسفیوں اور دانشوروں نے کی ہے ذیل کی سطروں میں دراصل اسی کا تذکرہ کرنے کا اہتمام ہے۔اس کیلئے سب سے پہلے تو ہمیں یہ جاننا ہے کہ ''عشق'' ہے کیا؟ کیا یہ محض ایک حرف ہے یا عادت، یہ کوئی جذبہ ہے یا کوئی اصطلاح ؟ اس کا پتہ چلانے کیلئے سب سے پہلے ہم لغات کا سہارا لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

جیسا کہ اس لفظ کی ظاہری ہئیت کا تعلق ہے اس اعتبار سے لفظ ''عشق'' عربی زبان کا لفظ ہے۔جس کے لغوی مطالب ''حب'' love،passion،جنون، وغیرہ ہی ہیں۔لیکن ان مطالب میں ''جنون'' اہم ہے،سوعشق ایک اعلیٰ اور برتر جذبہ ہے، یہ محبت میں شدت، کسی منزل کے حصول میں بھرپوراور پورے خلوص کے ساتھ،مکمل صلاحیتوں کے استعمال، اپنی پوری توانائی کے ساتھ جدوجہد کا احاطہ کرتا ہے۔عشق صفت ہے اس کا فاعل متصف عاشق اور مفعول معشوق، بالفاظ دیگر چونکہ دنیا میں ہرنظریئے ، ہرخیال کو علت ومعلول کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے، ہرمعلول اپنی علت سے ایک نسبت قوی رکھتا ہے۔یہ نسبت عشق ومحبت سے تعبیر کی جاسکتی ہے۔

عربی لغت میں عشق کا لفظ دوقراُتوں میں نظرآتا ہے ''العِشْقٌ '' اور '' اَلْعُشُقٌ '' اول الذکر کے معنی ہیں ''وفورمحبت'' اور موخرالذکر کے معانی (۱) دماغی عارضہ، ذہن کا ماؤف ہونا (۲) عشق کی ایک منزل جب عاشق خود سے اور اردگرد سے بےخبر ہوجاتا ہے .(۱).

مزید برآں لفظ ''عشق'' کی تشریح ''دائرہ معارف اسلامیہ'' مرتبہ پنجاب یونیورسٹی میں اس طرح بیان کی گئی ہے: ''۔'عشق' (ع) محبت، وفور شوق، اگرچہ یہ لفظ قرآن پاک میں نہیں آیا تاہم وسیع تر معنوں میں اس نے عربی ادب میں خاصی اہمیت حاصل کر لی ہے۔۔ 'الدّیلمی' کے مطابق ''ہر قسم کے لوگوں نے محبت اور عشق پر، جو محبت کی سب سے زیادہ متحرک شکل ہے، اپنے اپنے خیالات بیان کئے ہیں''۔عشق کی تعریف بیان کرنے کی اولین کوششوں میں 'الجاحظ' کے ''رسالة فی العشق'' کا نام لیا جاسکتا ہے (رسالہ ۱۱، ص ۱۶۱ تا ۱۶۹، رسائل، طبع السندوسی، ص ۲۶۶ تا ۲۷۵)۔اس مسئلے میں لوگوں کا انتہائی انہماک تھا یہاں تک کہ یحییٰ البرمکی کی موجودگی میں مختلف مذہبی رجحانات کے تیرہ نمائندوں نے جن میں ایک 'موبذ' (زرتشتی عالم دین) بھی شامل تھا، اس بحث میں حصہ لیا۔اس نے ان کی پیش کردہ تعریفیں مُـــرُوج (۲:۳۶۸ تا ۳۸۶) میں نقل کی ہیں اور ان کے علاوہ جالینوس، بقراط وغیرہ کے اقوال بھی بیان کیے ہیں۔'الدیلمی' (ابوالحسن علی بن محمد الشافعی) نے ان میں سے بعض کو دہرایا ہے۔۔ایک عام طور پر مسلمہ تعریف کی رو سے عشق کسی محبوب شے یا ہستی (معشوق) کے حصول کی ناقابل مزاحمت خواہش (شوق، تشویق) کا نام ہے'' (۲)

سوال یہ ہے کہ کیا عشق دو چیزوں یا دو مختلف نفسوں کے درمیان ایک دوسرے کی جانب میلان کو کہتے ہیں؟ کیا عشق محض ایک جنسی کشش ہے؟ کیا یہ کوئی جذباتی ہیجان ہے؟ جیسا کہ جوش ملیح آبادی اور اس قبیل کے دوسرے دانشوروں کا خیال ہے۔یا یہ کوئی روحانی جذبہ ہے؟ جیسا کہ تمام مذاہب کے فلسفہ ہائے تصوف میں اس کا تصور پاکیزگی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ملتا ہے۔عشق کا لفظ زبان پر آتے ہی یا عشق کے متعلق سوچتے ہی یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ عشق اصل میں ہے کیا؟، یہ جنس کا کوئی مسئلہ ہے، کوئی نفسیاتی عارضہ ہے، کوئی فلسفہ ہے، کوئی جذبہ ہے، کوئی جسمانی یا روحانی تحریک ہے یا کچھ اور ہے؟ جس کی تعریف و توصیف میں، جس کی تشریح و عمل میں دفتر کے دفتر صرف ہوئے ہیں، اگرچہ عشق لغوی اعتبار سے تو محبت، حب، جنون passion، پریم، پریت، پریتی، رومان۔اور اسی قبیل کے دوسرے

الفاظ کا ہم معنی لفظ ہے۔

ہاں بائیبل میں اس کیلئے ایک اور اصطلاح استعمال ہوئی ہے" AGAPE" جس کا لغوی مطلب محبوب کیلئے ترک دنیا، ترک معاملات، وغیرہ یعنی دنیا اور اس کے متعلقات سے لاتعلق ہو جانا۔ بائیبل کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

"AGAPE" is selfless, sacrificial, unconditional love, the highest of the four types of 'Love' in Bible.This Greek word,"agap"and variations of it are frequently found in the old testament.

Agape,Christ has for perfectably described the kind of 'love' Jesus,Father and for His children.

children

(۳) ROME 12:10 Bible " God is Love"

تفہیم:۔''اگیپ'' ترک نفس، ایثار اور غیر مشروط محبت سے عبارت ہے۔ محبت کی یہ قسم بائیبل میں مذکور محبت کی چار اقسام میں افضل ترین ہے۔ اور اس کے مندرجات و اثرات، اس کی مختلف ہیئتیں عہد نامہ جدید میں بیشتر مقامات پر ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ AGAPE یونانی زبان کے لفظ'AGAP" سے ماخوذ ہے اور ایسی محبت کیلئے استعمال ہوا ہے جو (ان کے عقیدے کے مطابق) یسوع مسیح اپنے دل میں خداوند اور اپنے مقلدین کیلئے محسوس کرتے ہیں''۔

عہد نامہ جدید (انجیل) میں عشق یا محبت (Love) کی دو اور متبادل اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں ان میں ایک Phillia ہے اور دوسری EROS ہے جو خداوند کی بجائے اس مخلوق کے مابین دیگر رشتوں کے درمیان کشش کی علامت ہیں؛ یہ سب علامات اور الفاظ یا اصطلاحات روحانی محبت کی عکاس ہیں۔ یہ روحانی محبت کیا ہے؟۔ یہ تربیت یا تعلیم ہے جو عقیدوں کے ماتحت ہے۔ ہر مذہب کسی نہ کسی تصور کے تحت اس دنیا اور اس کے بعد کسی جزاء وسزا کے دن کو ماننے کے عقیدے کا حکم دیتا ہے، یہ بھی مانا جاتا ہے کہ روحوں کا وجود ہے

اورانہیں فنانہیں اور یہ بھی کہ روحیں کسی معبود یا خالق کے حکم کے تحت ہیں۔ ہر روح اپنے اصل کی جانب کشش یا میلان رکھتی ہے۔ سو روحوں اور ان کے درمیان یہ کشش ہی دراصل روحانی محبت یا عشق کہلائی جاسکتی ہے جس کا اوپر بیان کیا گیا ہے۔ اس روحانی محبت کا ذرا زیادہ گہرائی سے مطالعہ کرتے ہیں:

روحانی محبت:

گویا عیسائی عقیدے میں بھی پاکیزہ محبت (جس میں دنیاوی لذت وہوس کی آمیزش نہ ہو) کا ایک وجود ہے ان کے مذہبی عقیدے کے صحیح یا غلط تصور پر بحث کئے بغیر یہی پاکیزہ محبت ان کے ہاں بھی خداوند، یسوع مسیح اور پیروؤں کی مذہبی عقیدت یا ''ایمان'' کی غایت اولیٰ ہے۔

AGAPE کے لفظی معانی بھی قریب قریب وہی ہیں جو عربی کی پرانی لغت میں ''**العُشُق**'' کے معانی ہیں یعنی ایک بیماری، ایک دماغی عارضہ۔ اس لفظ کے لغوی معانی کی کایا کلپ بالکل اسی طرح ہوئی جس طرح لفظ ''خودی'' کی۔ 'خودی' عربی، فارسی اور اردو لغت میں ایک زمانے تک اپنے منفی معنوں (تکبر، غرور) میں استعمال ہوتا رہا تا آنکہ علامہ اقبال نے تصور خودی دے کر اس کی لغت ہی تبدیل کردی، اب یہ عرفان نفس اور عرفان ذات کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح 'AGAPE اور ''عشق'' کی لغت بھی تبدیل ہوئی ہے۔ اب Agape کے معنی دماغی عارضے کے برعکس The spiritual love اور عشق **وفور المحبة یا اشدّالمحبة** کے معانی دیتا ہے اس طرح یہ الفاظ اپنی اپنی زبانوں میں منفی معانی کے بجائے مثبت معانی میں تبدیل ہوئے۔ تاہم تشنۂ تشریح ابھی تک ہیں۔

ہماری مذہبی زندگی کے علاوہ سماجی، معاشرتی زندگی میں محبت کے مختلف روپ ہیں ان میں شفقت، مامتا، مؤدت، عقیدت، پیار، احترام، قرابت، وغیرہ جیسے الفاظ مستعمل ہیں جو مختلف رشتوں اور واسطوں کے درمیان (محبت) کشش کا باعث ہیں۔

زندگی کے مختلف اعمال ونظریات میں اس عشق کی سب سے زیادہ بہتر تصویر اسلامی

فلسفۂ حیات کے عقیدے ''ایمان'' کے تصور میں نظر آ سکتی ہے۔ ایمان جو محض زبان سے اقرار ہی نہیں دل کی گہرائیوں سے یقین کا نام ہے۔ ایمان ایک طرح کی خود سپردگی ہے۔ یہ ایمان ایک یقین ہے ایک قوت کے وجود کا یقین، ایک ایسی قوت کے وجود کا یقین جو چشم انسانی کے احاطے میں نہیں آ سکتی نہ انسان کے کسی اور احساس کے دائرے میں آ سکتی ہے۔ خوگر پیکر محسوس نظر سے اعراض کرتے ہوئے، اپنے حواس سے بالاتر سوچ، ایمان بالغیب اور وہ بھی پوری شدت کے ساتھ پوری حرارت اور دل کے مکمل اطمینان کے ساتھ۔ سو عشق کی پہلی حالت ہوگی، یقین کرنا، اور محبوب کی بات کو بے دھڑک، پورے اطمینان کے ساتھ مان لینا، محبوب کی بات کا سو فی صد یقین کر لینا۔ اس کے اشارۂ ابرو کو سمجھنا اور اس پر فوراً بغیر کسی تامل یا ہچکچاہٹ کے، عمل کیلئے مستعد ہوتا ہے؛ (۴)

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی
عشق فرمودۂ قاصد پہ سبک گام عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنیٔ پیغام ابھی

عشق یعنی (فرمودۂ قاصد پہ سبک گام عمل ہونا)، اور (آتش نمرود میں بے خطر کود پڑنا) والا عشق یا خالق (حسن ازل) کی بے پناہ محبت پر یقین۔ لیکن اس کا اظہار لازمی نہیں، یہاں نظر، نظر کا اعتبار کرتی ہے، زبان، زبان کیلئے معتبر ہے اور دل دل کا معتمد ہے ۔۔

مولانا عبدالسلام ندوی (اقبال کامل میں) کہتے ہیں:

'' کائنات کا پہلا نظریہ یہ ہے کہ کائنات کی بنیاد عشق و محبت پر قائم ہے کیونکہ دنیا میں علت و معلول کا سلسلہ قائم ہے اور ہر معلول اپنی علت سے عشق و محبت رکھتا ہے اور علت کو اس پر غلبہ و اختیار حاصل ہوتا ہے لیکن چونکہ ایک ہی چیز دو حیثیتوں سے علت و معلول دونوں ہوتی ہے اس لئے ہر چیز میں قہر اور مہر دونوں پائے جاتے ہیں'' (۵)

یہ قہر و مہر کم زیادہ ہوتے رہتے ہیں۔ عشق و محبت کا یہ نظریہ پوری حیات پر محیط ہے، یعنی

زندگی کے کسی ایک شعبے سے متعلق نہیں بلکہ اس کے محیط میں روز وشب، ماہ وسال اور صبح سے شام تک کے تمام معمولات زندگی شامل ہیں۔ انسانی زندگی کے جتنے عوامل ہیں، جتنے اعمال یا افعال ہیں اگر وہ کسی مقصد کے تحت ہیں تو عشق ان میں کسی نہ کسی درجے میں موجود ہوگا بصورت دیگر وہ بے مقصد فعل ''لایعنی'' میں شمار ہوگا۔ فلسفۂ عشق یا تصور عشق کو سمجھنے کیلئے سب سے پہلے لفظ عشق کا سمجھنا بہت ضروری ہے کیونکہ:

گرچہ تفسیر بیاں روشن گر است
لیک عشق بے زباں روشن تر است
عقل در شرحش چو خر در گل بخفت
شرح عشق و عاشقی ہم عشق گفت

(۶)۔

ترجمہ: ''اگرچہ علم کی بنیاد پر زبان سے عشق کی تشریح، ایک روشن شے اور روشنی پھیلانے والی شے ہے مگر دل کے اندھیرے میں پلنے والے جذبے تشریح کے محتاج نہیں ہوتے'' خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری'' کے مصداق عشق بے زباں (ایسا عشق جس کا اظہار محض زبان سے نہ کیا جائے بلکہ اپنے عمل سے، اپنی وارفتگی ومحویت سے ثابت کرنا جو ظاہر ہے دل کے اندر کے پختہ یقین کے بغیر ممکن نہیں) خموش عشق زیادہ روشن ہوتا ہے۔ عقل جب عشق کی شرح کرنے لگے تو ایسا ہے جیسا کسی گدھے نے پھولوں میں سر دے دیا ہو۔ یا وہ دلدل میں پھنس گیا ہو۔ عشق کی شرح کیلئے تو عشق ہی کی زبان درکار ہوتی ہے''۔

فلسفی اور دانشور اپنی تمام تر دانش کے باوصف، نقاد سالوں کے تجربے کے باوجود اس لفظ یا اصطلاح کی تعریف بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ اقبالیات کے ماہر اور معروف نقاد عمیق حنفی علامہ اقبال کے فلسفۂ عشق کے حوالے سے کہتے ہیں:

''میں اقبال کے عشق کی کوئی واضح اور مستقل فلسفیانہ تعریف Definition اب تک نہیں پا سکا۔ یہ عشق ایک خلاق قوت ہے، جسے Creative urge بھی کہا جا سکتا ہے اور

''Elan Vital'' کا مترادف بھی۔ یہ ایک وجدانی رو ہے۔ مجھے اس اصطلاح میں کبھی Involvement کا عکس نظر آتا ہے اور کبھی Commitment کا عکس نظر آتا ہے اور کبھی Engagement کی پرچھائیاں''۔(۷)

عقل کا تعلق انسان کی حسیات سے ہے اور عشق کا تعلق وجدان سے۔ عقل حس ادراک میں آئی ہوئی کیفیت یا شے کو بھی بے چون و چرا تسلیم نہیں کرتی اس پر بھی کیوں، کہاں، کیسے، وغیرہ کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد یقین کرتی ہے اور بسا اوقات ایک کی عقل کے مشاہدات و تجربات دوسرے کی عقل کے تجربات و مشاہدات سے مختلف حتیٰ کہ متضاد ہوتے ہیں لہٰذا بحث در بحث کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور یہ بحث دنوں سے مہینوں، مہینوں سے سالوں کے عرصے تک پھیل جاتی ہے۔ عشق اس قسم کی بحثوں کی فضول مشق میں نہیں پڑتا اسے اپنے مطلوب تک پہنچنا ہوتا ہے اور عشق کا جذبہ خود اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ سو عشق ہی مسافر بھی ہے اور سفر بھی، یہ بدرقہ بھی اور راحلہ و زاد بھی۔ بقول شخصے ''عشق انّھے واہ ہوتا ہے''

عمیق حنفی کہتے ہیں:

''عشق کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ تیز و تند سیل رواں ہے جو وقت کے قہار دھارے کے سامنے سینہ سپر ہو جاتا ہے اور ان دو تلواروں کی ٹکر سے پیدا ہونے والی چنگاریاں نقوش کو رنگ ثباتِ دوام دے جاتی ہیں''

''عشق خارج سے درآمد نہیں کیا جاتا بلکہ جوہر خودی کا عرض ہوتا ہے، یہ وہ کچی شراب ہے جسے گھر میں کھینچا جاتا ہے اور پھر مٹی کے پیالے میں ہم مشربوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے''۔ (۸)

لیکن عشق؟ سوال اپنی جگہ برقرار ہے کہ عشق کیا شے ہے؟ جس کی اتنی ساری تعریفیں کی گئی ہیں؟ جس کی اتنی بات ہو رہی ہے، بے شمار اہل اللہ نے، دنیا کے ان گنت فلسفیوں، دانشوروں، علم النفس، تصوف، ادبیات اور دیگر علوم کے شناوروں نے اس لفظ یا اس کے ہم معنی الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ کیا عشق کوئی فلسفہ ہے؟ کیا کوئی ترکیب ہے؟ کیا عشق کوئی مفرد

لفظ ہے؟ کیا عشق کوئی جذبہ ہے؟ یہ عشق آخر چیز کیا ہے جس کی اتنی دھوم ہے؟

کیا عشق ایک پاک جذبہ ہے ایک جنون ہے، یا کیا عشق جنون ہی کی کوئی قسم یا شکل ہے؟ یا کوئی جسمانی یا دماغی عارضہ؟ اس کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ عشق کو محض جنون قرار دینا درست نہیں اس لئے کہ جنون پاگل پن، دماغی اختلاج، دماغ کے جسم پر کنٹرول نہ ہونے ،کسی دماغی بیماری کی علامت یا نتیجہ، کسی قسم کے کینسر یا سرطان سے دماغ کا بیکار ہوجانا وغیرہ لیا جاتا ہے گویا محض جنون ایک طبیعی یا طبی عارضہ ہے جس کیلئے انگریزی زبان کا لفظ madness استعمال ہوتا ہے یا neurological disorder یا پھر Physical obcession کا لفظ مستعمل ہے۔ اسے ہم عشق کا مترادف نہیں قرار دے سکتے ۔ ہاں جنون کا لفظ اگر ان معنوں میں استعمال کیا جائے کہ فلاں شخص کے سر میں کسی چیز کا سودا سما گیا ہے، یا فلاں شخص کسی چیز کیلئے پاگل ہوا جارہا ہے، یا فلاں شخص کسی کے پیار میں پاگل ہورہا ہے ،تو اس کا مطلب یہ لیا جائے گا کہ وہ اپنے کسی جذبے کی شدت کے بلند ترین مقام پر ہے، سو ایسا جنون ''عشق'' ہی کہلائے گا۔ یہی جنون انسان کو جان کی پرواہ نہ کرنے کی ترغیب دیتا ہے، اس کے دل کے اندر ایسی لو لگ جاتی ہے کہ اسے اپنی منزل کے علاوہ کوئی چیز سجھائی نہیں دیتی، کوئی رکاوٹ اس کا راستہ روکنے کے قابل نہیں ہوتی۔ اسے کوئی خوف یا خطرہ لاحق نہیں ہوتا۔ (**لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون**) والی کیفیت شاید ایسے ہی (اہل ایمان) عشاق کیلئے بطور بشارت بتائی گئی ہے۔ یہ کیفیت ایک عام جسم و اعضاء کے حامل شخص کو سینکڑوں مسلح دشمنوں کے مقابلے میں لڑوا سکتی ہے، اس سے کوہ بے ستون ایک تیشے کی مدد سے کھدوانے اور دودھ کی نہر بہالانے پر کمر بستہ کرسکتی ہے، یہ کیفیت اسے کچے گھڑے پر دریا عبور کرنے پر مجبور کرسکتی ہے، اسے تپتے صحرا میں دن رات پیدل چلاسکتی ہے اس طرح کہ اس کے جسمانی اعضاء کو ذرا سی تکلیف بھی محسوس نہ ہو۔ عشق انسان کو بلند ترین مقاصد کے حصول کی راہیں آسان بنا کر دیتا ہے۔ عشق عرش معلیٰ کی سیر کرواسکتا ہے۔ جہاں فرشتے بھی اس کی ہمرکابی سے عاجز جائیں۔ بقول حضرت علامہ اقبالؒ:

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور، اے ہمت مردانہ

ترجمہ: میرے جنون کے میدانوں میں حضرت جبرئیلؑ جیسا جلیل القدر اور طاقتور فرشتہ بھی (میرے جنون یا عشق کا) شکار بن جاتا ہے جب جنون یا عشق مزید ترقی پا کر زیادہ طاقتور ہو جاتا ہے تو اس (انسان کے زور عشق) کا اگلا ہدف اللہ کی ذات ہوتی ہے، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے وصل کیلئے جدوجہد کرتا ہے۔

اس طرح کا جنون ہی تو عشق کے زمرے میں آئے گا، ورنہ کوئی ناقص الفہم اس منزل تک کیسے جا سکتا ہے سو جنون جب passion کے طور پر استعمال ہوگا تو اس کا مطلب شدید محبت یا عشق ہی لیا جائے گا پاگل پن ہرگز نہیں۔ علامہ اقبالؒ ارشاد فرما ہیں:

دل من روشن از سوز درون ست
جہاں بیں چشم من از اشک خون ست
ز رمزِ زندگی بیگانہ تر باد
کسے گو عشق را گوید جنون ست

ترجمہ: میرا دل باطن کی آنچ سے روشن ہے۔ میری آنکھ سوز درون (عشق) کے سبب خون کے آنسوؤں سے (دنیاوی تماشے سے پاک ہوتے ہوئے) عالم کی حقیقتوں کو دیکھتی ہے۔ وہ شخص جو عشق کو پاگل پن کہتا ہے اللہ کرے زندگی کی اس حقیقت سے، اس رازِ حقیقت (عشق۔ جدوجہد وصل الی الحق) سے ہمیشہ بے خبر رہے۔ (۹)

(بعض صوفیائے کرام عشق کی اس منزل کو عشق کی آخری منزل قرار دیتے ہیں اور اس کیلئے "الھیوم" یا "الھیام" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں)

جنون کے علاوہ عشق کے لئے استعمال ہونے والے متبادل الفاظ میں سب سے زیادہ بولا اور لکھا جانے والا لفظ "محبت" ہے، محبت یا 'حب' عشق کے مدارج میں سے ایک درجہ بھی ہے حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ کے نزدیک "محبت یا حب" عشق کے مدارج میں سے چھٹی

منزل ہے صاحب' مجمع السلوک' شارح 'رسالہ مکیہ' کے نزدیک بھی اس کا درجہ چھٹا ہے، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے نزدیک ساتواں، حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ کے ہاں نواں درجہ ہے اور یہ حب مطلق ہے اور ان کے نزدیک یہی عشق کا آخری درجہ یا منزل ہے، ہم یہاں اسے درجوں کے امتیاز کے باوجود عشق کا مترادف یا متبادل لفظ فرض کرتے ہیں گویا حقیقی محبت عشق کا مترادف لفظ ہے (یہاں حقیقی کا لفظ دانستہ استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ محبت صرف زبانی اظہار کا نام نہیں اپنا سب کچھ تج دینے کا نام ہے)۔ کیونکہ عشق کا لفظ ایک عرصے کے بعد استعمال میں آیا لہٰذا جب تک عشق کے لفظ نے محبت کی اصطلاح کی جگہ نہیں لی، ہم ''محبت'' کو ''عشق'' ہی کا مترادف قرار دیتے ہوئے تذکرہ عشق جاری رکھیں گے۔

حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ (۸۶۱ء نہاوند۔۹۴۶ء بغداد) فرماتے ہیں، ''محبت کا نام اس لیے محبت رکھا گیا ہے کہ وہ دلوں سے محبوب کے سوا سب کو مٹا دیتی ہے'' نیز محبت کے متعلق کہتے ہیں کہ (**لِاَنَّہٗ غِلَیَانُ الْقلْبِ عند الاشیاقِ الیٰ لِقآءِ المحبوبِ**) یعنی: ''وہ محبوب کی ملاقات کے لیے دل کا شوق واضطراب ہے'' جیسا کہ قیام جسم سے ہوتا ہے اسی طرح حب کا قیام محبوب کے دیدار ووصل سے ہوا کرتا ہے نیز کہتے ہیں کہ ''محبت کے معانی ہیں دوستی میں صفائی واخلاص کیونکہ عرب لوگ چشم انسان کی سفیدی میں جو صفائی ہے اس کو ''**حبۃ الانسان**'' کہتے ہیں۔ ویسے بھی دل کے نقطۂ سیاہ کو **حبۃ القلب** کہتے ہیں پس ایک محبت کا مقام ہوا اور دوسرا روایت کا۔ اس معنی سے ثابت ہوتا ہے کہ محبت اور دوستی کے معاملات میں دل اور آنکھ آپس میں خاص ربط رکھتے ہیں اور اس معنی میں کوئی صاحب عشق و حال کہتا ہے ''دل میری آنکھ میں لذتِ نظر کو پاتا ہے اور آنکھ میرے دل میں لذتِ فکر کو پاتی ہے۔'' (۱۰).

دنیا کی ساری زبانوں کا اساطیری اور عصری ادب محبت کی داستانوں سے بھرا پڑا ہے۔ خود ہمارے اردگرد زبانوں میں جیسے عربی، فارسی، ترکی، اردو، سنسکرت اور اس کے علاوہ برصغیر میں بولی جانے والی دیگر تمام علاقائی زبانوں میں محبت کی داستانیں (شعری یا نثری تخلیقات)

ہرنوک قلم یا نوک زبان پر ہیں، ان سب داستانوں میں یہ سبق ملتا ہے کہ ''محبت'' امر ہے۔ ان داستانوں کے مرکزی کردار اپنی اپنی زندگی گذار کر اس دنیا سے (اکثر) بظاہر بے مراد چلے جاتے ہیں لیکن ان کے دلوں میں پنپنے والی محبت کے جذبے کی شدت ان داستانوں کو پڑھتے ہوئے صدیوں بعد آج بھی محسوس ہوتی ہے۔ شعر ہو یا نثری ادب سب کی بنیاد محبت ہی ہوتی ہے بہت کم زندگی کے دوسرے مسائل سے بحث ہوتی ہے۔ یہ محبت جو ایک انسان کو ایک دوسرے انسان سے ہوتی ہے۔ اگر اتنی شدت اپنے اندر رکھتی ہے تو انسان کو اگر اپنی اصل سے محبت ہو جائے تو اس کی شدت کتنی ہو سکتی ہے؟ شاید زمین کے اندر ابلتے ہوئے لاوے سے زیادہ، وہ لاوہ جو ایک لمحے میں دنیا کو تہہ و بالا کر سکتا ہے۔ محبت کی اس درجے کی شدت ہی دراصل عشق کہلاتی ہے۔

کشف المحجوب میں حضرت سید علی ہجویریؒ (۱۰۱۰ء ۔۱۰۷۲ء) معروف بہ حضرت داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں: ''زاہدوں کے نزدیک محبت اجتہاد سے واضح تر شے ہے اور توبہ کرنے والوں کے نزدیک محبت آہ وزاری سے زیادہ آسان ہے، اور ترکوں کے نزدیک محبت فتراک یعنی تسمۂ شکار سے زیادہ مشہور ہے، اور عرب کے ہر قبیلہ میں محبت کا مضمون وقصہ اس کی خوشی یا غم، فتح یا شکست سے زیادہ اہم اور مشہور ہے'' (۱۱)

اس بیان سے مراد یہ ہے کہ نوع انسانی کی کوئی قوم اور قبیلہ ایسا نہیں۔ جس کے دل میں محبت کی عظمت و کشش اور فرحت وانبساط نہ ہو، اور محبت کے سرور سے سرشار نہ ہو، اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ دل کی ترکیب سوز و بے قراری سے ہے، اور عقل بھی دوستی واُنس کے تاثرات سے وجد میں رہی ہے، پس جو دل محبت سے بیگانہ ہو، وہ خراب و ویران ہے اور محض نفس۔ ان لطائف سے جو محبت کے باعث دل پر وارد ہوتے ہیں، آگاہ نہیں ہے اور عمر بن عثمانؒ کی محبت کے باب میں لکھتے ہیں'' خداوند کریم نے دلوں کو جسموں سے ستر ہزار برس پہلے پیدا فرمایا۔ اور قرب و وصل کے مقام میں جگہ دی اور ان کی رُوحوں کو دلوں سے ستر ہزار سال پہلے پیدا فرمایا اور انہیں انس کی درجہ میں رکھا اور ہر روز تین سو ساٹھ مرتبہ سروں پر اپنی تجلی فرمائی اور تین

سو ساٹھ مرتبہ روحوں پر رحمت و کرم کی نظر فرمائی اور انہیں محبت کا کلمہ سُنایا، اور ہر روز دلوں پر محبت کے تین سو ساٹھ لطیفے ظاہر فرمائے، یہاں تک کہ ایسے صاحب دل لوگوں نے تمام جہان پر نظر کی، اور اپنے سے زیادہ کسی کو فضیلت والا نہ پایا۔ اور ان صفات کی بنیاد پر اللہ تعالےٰ نے بھی انہیں تمام مخلوقات پر برگزیدہ فرمایا اور ان کے وجود پر ملائکہ نے بھی فخر کیا بعد ازاں دنیا میں بطور انبیاء بھیجے شریعتیں عطا کیں، مقدس کتابیں نازل فرمائیں پھر ہر سعادت مند شخص اپنے اس ازلی مقام کی جستجو میں محو ہوا۔ اور اس جستجو کو کامیاب کرنے کے لئے اللہ تعالےٰ نے اوامر و نواہی صادر فرمائے تا کہ ان کی اطاعت و مخالفت سے دل اپنی ازلی صفت یعنی محبت کو ضبط و محفوظ کر لیں۔''

محبت کا عالم ایک عجیب عالم ہے، جہاں محبّ ہی صاحب وجود ہے اور محبّ کے علاوہ ہر چیز معدوم نظر آتی ہے، بلکہ صرف محبوب ہی محبوب ہے محبّ یا عاشق کی ذات بھی محبوب میں ہی شامل ہے (شاید یہی انا الحق کا مرحلہ ہے)۔ محبوب کے ساتھ متحد ہونے کا سخت شوق محبّ کے دل میں ہر لمحہ انگڑائیاں لیتا رہتا ہے۔ یہ شوق اسے کسی لمحے قرار نہیں لینے دیتا۔ محبّ وصال کے انتظار میں ایک ایک لمحہ سخت جان کنی جیسے عالم انتظار میں گذارتا ہے۔ لیکن جب اسے وصال کا لمحہ میسر آتا ہے تو یہ وصال بھی اس کی تکلیف کو رفع نہیں کر سکتا بلکہ اس کی محبت میں اور شدت آجاتی ہے۔ وہ محبوب کو گلے لگائے یا اس کے ساتھ باتیں کرے، اس کی محبت کی شدت میں کمی کی بجائے زیادتی ہوتی ہے۔ اس کا شوق اور بڑھ جاتا ہے شاید اس شوق کی منزل دونوں کی روحوں کا ملاپ ہی ہو سکتا ہے۔ بعض اوقات وصال محبت کے زائل ہونے کا سبب بھی بن جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے محبّ بعض اوقات اس قسم کی دعا کرتا ہے: (۱۲)

خدا کرے کہ کبھی ختم ہو نہ ہجر کی شب
کہ وصل موت ہے یادوں کی دلربائی کی
نہال ہوں کہ تری یاد کے حصار میں ہوں
خدا کرے کوئی صورت نہ ہو رہائی کی

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کہتے ہیں:

''انسان کے ظاہری حواس کے علاوہ کچھ باطنی حواس بھی ہیں جو ہستی کے بعض ایسے پہلوؤں کو منکشف کرتے ہیں جن تک عام عقل کی رسائی نہیں، کشفِ حقیقت کا سب سے بڑا ذریعہ عشق ہے جو محض تاثر یا جذبہ نہیں بلکہ مصدر بصیرت و معرفت ہے زندگی کا مقصد اسی عشق کو ترقی دینا ہے جس سے ظاہر و باطن کی خامیاں رفع ہو جاتی ہیں اور اس کی بدولت جو عرفان نفس پیدا ہوتا ہے وہ خود شناسی اور جہاں شناسی کے علاوہ خدا شناسی کی راہیں بھی کشادہ کر دیتا ہے''۔ (۱۳)

یہ ضروری نہیں کہ محبوب کوئی ہستی، کوئی متنفس ہی ہو یہ کوئی شوق، شغل، کوئی مقصد بھی ہو سکتا ہے کوئی ہدف بھی جس کے حصول میں محبّ اپنے آپ سے بے پرواہ ہو سکتا ہے اگر محبوب فانی ہے یا محبوب کوئی منزل ہے اور محبوب کا وصال عاشق کی منزل ٹھہرے، اور اسے وہ منزل حاصل ہو جائے تو اس لمحے کے بعد عاشق کی زندگی کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ اس کے علاوہ یہ عشق ہی ہے جو کبھی ''حرم قرطبہ'' کو وجود بخشتا ہے (اے حرم قرطبہ عشق سے تیرا وجود) اور کبھی ممتاز محل کی قبر کو ''تاج محل'' کا روپ دے دیتا ہے۔ ماضی بعید اور ماضی قریب میں اس کی کئی مثالیں تاریخ کے اوراق کی زینت ہیں مثلاً: سلطان صلاح الدین ایوبی کو ایسے وقت (بیت المقدس فتح کرنے کی جدوجہد بالکل آغاز میں) سل یا دق جیسا مرض لاحق ہوا جب اس کا کوئی علاج نہیں تھا اور اس کا انجام یقینی موت تھا لیکن سلطان کا جذبہ، اور عزم مصمم تھا کہ وہ بیت المقدس کو فتح کر کے دم لے گا اور یہی اس کا عشق تھا یہی اس کے عشق کی منزل تھی سو اس کے مرض کی تشخیص کے بعد وہ بیس برس تک جیا اور اس عرصے میں وہ اپنوں سے بھی لڑا (جو اس کے سدراہ تھے)، غیروں سے مسلسل لڑتا رہا، فدائین، حشیشین نے اس پر بے شمار جان لیوا حملے کئے لیکن اس کے ارادے، اس کے عشق نے اس کے راستے کی ہر رکاوٹ کو دور کیا آخر جب بیت المقدس فتح ہو گیا تو فتح کے بعد ایک ہفتے کے اندر اندر اس کو بخار ہوا اور چند دن بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

سلطان محمود غزنوی نے سومنات کی فتح کا خواب دیکھا۔ سومنات کی فتح کو اپنا اصلی ہدف یا جنون یا عشق ٹھہرالیا اسے بھی سل کا مرض تھا اس مرض کو جسم میں پلتے ہوئے اس نے ہندوستان پر بارہ تیرہ حملے کئے ہر بار فاتح رہا لیکن وہ سومنات تک نہ پہنچ سکا، جب تک اس نے سومنات کو فتح نہیں کرلیا اس کا مرض اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا اور سومنات کی فتح کے تھوڑے ہی عرصے بعد اس کے جسم و روح کا رشتہ آپس میں منقطع ہوگیا۔ قائداعظم بھی 1930 کے عشرے میں اسی مرض میں مبتلا ہوگئے تھے اس وقت بھی اس مرض کا علاج ممکن نہیں تھا۔ لیکن پاکستان کا قیام ان کا مقصد تھا، ان کا جنون تھا اور اسی مقصد سے انہیں عشق تھا، پاکستان ان کا عشق تھا سو جب پاکستان بن گیا تو وہ بیمار رہنے لگے اور بالآخر اسی مرض نے (تشکیل پاکستان کے) بارہ تیرہ ماہ بعد ان کی جان لے لی۔

یوں عشق کسی سے بھی ہو کسی مقصد سے یا کسی متنفس یا کسی غیر مرئی قوت سے، عاشق کے دل و دماغ میں ہر لمحہ محبوب ہی کا تصور ہوتا ہے، یہ تصور ہر لمحہ اس کی زندگی پر چھایا رہتا ہے گویا اس کا حصول ہی اس کی زندگی ہے، اس عالم میں اسے اپنے اردگرد اپنا محبوب ہر لمحہ محسوس ہوتا ہے، کبھی تصور میں کبھی حقیقت کے لباس میں، یہی محبت ہے، یہی عشق ہے جب عاشق یا محبّ اپنی ذات کو معشوق یا محبّ کی ذات میں گم کردے، عاشق کو محبوب کی ہر بات سے پیار ہوتا ہے محبوب کی ہر متعلق چیز سے انسیت ہوتی ہے اس سے اسے محبوب ہی کی خوشبو محسوس ہوتی ہے محبوب کی گلیوں سے، اس کے شہر سے، محبوب کے نقوش پا سے، یہی تو عشق ہے۔

اَمُرُّ عَلَی الدِّیارِ دِیارِ لَیْلیٰ
اقبل ذوالجدار و ذوالجدارا
وما حبّ الدیار شغفن قلبی
ولٰکن حب من سکن الدیارا

ترجمہ: ''میں جب لیلیٰ کے شہر سے گذرتا ہوں تو کبھی اس دیوار کو چومتا ہوں کبھی اس دیوار کو چومتا ہوں۔ مجھے کسی شہر یا اس کی دیواروں سے محبت نہیں لیکن میں ان دیواروں کو اس

لئے چومتا ہوں کہ یہ لیلیٰ کے شہر کی دیواریں ہیں (اور لیلیٰ کے جسم کو چھونے والی ہوائیں ان دیواروں سے مس کرتی ہیں اور مجھے ان دیواروں سے لیلیٰ کی خوشبو آتی ہے۔)'' (۱۴)۔

سو محبّ کو ہر کہیں محبوب کی تصویر دکھائی دیتی ہے، ہر تصویر میں اسے محبوب کی شکل دکھائی دیتی ہے، وہ جہاں جائے، جہاں ہو محبوب کی تصویر اس کا تصور اس کے ساتھ ہوتا ہے۔

اس قدر تیرا تصور کبھی بڑھ جاتا ہے
آئینہ دیکھوں تو منہ تیرا نظر آتا ہے

محبت سے زندگی کی سختیاں آسانیاں معلوم ہوتی ہیں محبت میں سولی چڑھ جانے میں زندگی دکھائی دیتی ہے، اہل محبت کو سولی کی لکڑی تخت شاہی دکھائی دیتی ہے، محبت خام سونے کو کندن بنا دیتی ہے،

بقول مولانا رومؒ:

از محبت تلخ ہا شیریں شود
از محبت مسّ ہا زرّیں شود

یعنی محبت میں کانٹے پھول لگتے ہیں، درد، سرور دیتا ہے، تلخی شیرینی کا ذائقہ دیتی ہے، محبوب کے دربان کی تلخ کلامی، گالیاں نغمگی کا احساس دلاتی ہیں محبت میں پتھر اور سنگریزے ہیرے جواہر لگتے ہیں، جب یہ برسائے جائیں تو پھول لگتے ہیں۔ محبت انسان کو کچھ بھی پاس نہ ہوتے ہوئے دل کا غنی کر دیتی ہے، محبت گدلے پانی کو صہبائے شفاف اور درد کو شفا کا روپ دے دیتی ہے، محبت محبّ کو زندگی کا ہر مزہ دیتی ہے۔ محبت غیر مانوس ماحول، ناموافق حالات اور بیگانگی کو انسیت، موافقت اور اپنائیت میں تبدیل کرنے میں طاق ہے، محبّ اپنے درد کے اظہار کو بھی دوسروں کیلئے سبق آموز بنانے کا ہنر جانتا ہے۔ محبت محبوب کی طرف سے سرزنش میں بھی سرور محسوس کرتی ہے۔ عشق کے رمز شناس مرزا اسد اللہ خان غالبؔ کہتے ہیں:

از پیکرت بساط صفائے خیال یافت
وصلِ تو، از فراق تو، نتواں شناختن

(اب تیرے جسم کی موجودگی نے ہمارے بساط بزم کو تخیّل کی سی جلا بخش دی ہے اب ہر گوشۂ بساط میں تیری غیر حاضری (عدم) سے تیری موجودگی (تیرے وجود) کا احساس ہونے لگا ہے۔اب وصل اور فراق کا امتیاز اٹھ گیا ہے۔)

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں
واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں
عشق سے طبیعت میں زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی ، درد لا دوا پایا

محبت سے انسانی زندگی اور اس کے زاویہ ہائے نگاہ بدل جاتے ہیں۔انسان کو دکھتا کچھ ہے محسوس کچھ ہوتا ہے۔جو دکھائی دیتا ہے وہ شاید ہو لیکن جو دکھتا نہیں وہ بھی ہوتا ہے۔محبت انسانی زندگی کے قصیدے کا منظر نامہ ہے جہاں ہمیشہ بہار اور صبح ہی کا منظر ہی موجود رہتا ہے۔وصل تو وصل ہے ہی، فراق بھی وصل کی صورت میں محسوس ہوتا ہے۔

محبت دل میں جاگزیں ہو تو قید خانہ بھی باغ محسوس ہوتا ہے جہاں ہر سمت بہار ہی بہار ہو، رنگ ہی رنگ بکھرے ہوں اور خوشبوؤں کا بسیرا ہو، اور اس کے برعکس اگر دل میں محبت کی کوئی کرن نہ ہو تو ایسے شخص کو اگر پر بہار باغ میں رکھا جائے تو اسے وہاں بھی تنگی اور گھٹن کا احساس ہوگا۔ یہ عشق یا محبت کا جذبہ ہی ہے جو بے معنی زندگی کو بھی بامعنی اور کارآمد بنا دیتا ہے۔وہ یعنی عاشق اپنے سفر عشق کے آغاز و انجام سے بے پرواہ ہوتا ہے اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ اس کے سفر کا اختتام کہاں اور کیا ہوگا؟ وہ خود کو سراپا راز ہستی مانتے ہوئے جہانِ راز کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے، اسے آس پاس کی خبر نہیں رہتی، اس راستے میں وہ کہیں بھی تذبذب کا شکار نہیں ہوتا۔ بلکہ پورے یقین اور اعتماد سے وہ اپنا عمل جاری رکھتا ہے یہی عشق کی صفت اور عاشق کی پہچان ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ کا نظریہ محبت یہ ہے ''عاشق کا اپنی صفات ترک کر کے محبوب کی صفات کو قبول کر لینا'' اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا بھی یہی مفہوم ہے کہ ''فاذا اَحْبَبْتُهٗ كنتُ لهٗ سمعاً وَّ بصيراً . القرآن'' (جب میں اس (بندے) سے محبت کرتا ہوں تو اس کی سماعت اور بصارت بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور دیکھتا ہے)۔ سو بندۂ مومن اللہ کا عاشق صادق ہے اسی لئے علامہ اقبال نے ارشاد فرمایا:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

خلیفہ عبدالحکیم کہتے ہیں:

'' قلبِ ماہیت اور تبدیلی ہیئتِ محبت کی ہر صورت کیلئے ایک عالمگیر قانون ہے خواہ محبت ادنیٰ قسم کی ہو یا اعلیٰ قسم کی، محبت ہی نار کو نور اور دیو کو حور بنانے والی چیز ہے'' مثل مشہور ہے کہ 'اگر کسی گدھی پر بھی دل آجائے تو وہ اس کو پری معلوم ہونے لگے، چڑیل کا حور دکھائی دینا محبت ہی کا کرشمہ ہے'' (۱۵)۔

محبت یہ نہیں دیکھتی کہ اسے کس سے، کیوں اور کیونکر محبت ہے۔ محبت کرنے والا بس محبوب کو کائنات میں عظیم تر، خوبصورت تر دیکھتا ہے، اگر محبوب حقیقی (حسن ازل) ہو تو اسے اعظم و اکبر تسلیم کرتا ہے اور اسی کو اپنی ساری کائنات سمجھ لیتا ہے، محبت محبّ سے سخت سے سخت کام لیتی ہے اور اسے کامیابی کے سنگھاسن پر بٹھا دیتی ہے۔

==========

حضرت جنید بغدادیؒ (حضرت ابوالقاسم الجنیدؒ بن محمد الہز ازالقواریری۔ پ ۲۲۰ھ وفات ۲۹۷ھ بحوالہ ا: ''تذکرۃ الاولیاء''۔ حضرت خواجہ فریدالدین عطارؒ نیشاپوری۔ 2. A Literary History of persia: by : Browne, Edward Granville

عشق را جز بہ عشق نتواں یافت
علم از وآگہی بہ ایماں یافت
حدش از حد وصف بیرون است
نتواں گفت چند یا چون است''

ترجمہ: عشق کو عشق کے بغیر پایا ہی نہیں جا سکتا، عشق کے بارے میں علم یا شعور دل کے یقین سے ملتا ہے۔ عشق کی صفت بیان کرنا ناممکن ہے کیونکہ عشق حد وصف سے باہر ہے۔ اور اس کی پیائش نہیں ہوسکتی ہے کہ عشق کتنا ہے اور کیوں ہے؟ ۱۶

عشق صرف عشق کی زبان سمجھتا ہے۔ اسے عشق کے علاوہ کسی اور طریقے سے پایا نہیں جا سکتا۔ اس کی حد کسی بیان کے دائرے میں نہیں آتی، وہ کیوں، کیسے اور کیونکر جیسے سوالوں سے ماوراء ہے۔ اسے کسی دلیل کی حاجت نہیں۔

از محبت سنگ، روغن می شود
از محبت حزن ، شادی می شود
بے محبت موم، آہن می شود
و ز محبت غول، ہادی می شود

ترجمہ: محبت سے سخت پتھر پگھل کر سیال بن سکتا ہے، محبت میں غم، خوشی کا روپ دھار سکتا ہے اور اگر محبت نہ ہو تو موم لوہا بن جائے گا اور اس پر ساری محنت بے نتیجہ رہ جائے گی، انسان اگر محبت کے ساتھ (پورے خلوص کے ساتھ اپنی منزل کو روانہ ہو اور اسے منزل کا پتہ نہ ہو) تو غول بیابانی بھی اس کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ (۱۷)۔

اگر کسی کے دل میں اس کام سے محبت ہو جو وہ کر رہا ہے اور کام میں اس کا دل لگا ہوا ہو تو پتھر کو بھی پگھلا سکتا ہے پتھر بھی اس کے سامنے موم بن سکتے ہیں، جیسے فرہاد کیلئے کوہ بے ستون کو کھودنا، مہینوال کا کچے گھڑے پر دریائے چناب کو عبور کرنے کی بظاہر لا حاصل سعی وغیرہ۔ محبت غم کو شادمانی میں تبدیل کر دیتی ہے، محبت سخت ترین مراحل کو بھی آسان بنا دیتی ہے۔

لیکن اس کے برعکس اگر کام میں دل لگا ہوا نہ ہو، کام بے دلی سے یا بیگار سمجھ کر کیا جا رہا ہو تو موم جیسی نرم و نازک شے بھی پتھر سے زیادہ سخت ہو جاتی ہے، اگر منزل کی جانب خلوص، محبت و عشق سے سفر کیا جائے تو ہر رکاوٹ آسانی میں ڈھل سکتی ہے حتیٰ کہ اگر راستہ معلوم نہ ہو تو بھی، غول بیابانی جیسے ڈراؤنی اور غیر مرئی مخلوق بھی راستے کی رہنمائی کرے گی۔ یہ وہی جذبہ ہے جو حضرت خالد بن ولیدؓ کی قیادت میں دس جانبازوں کو اجنادین میں نوے ہزار کے لشکر کے مقابلے میں کھڑا رکھ سکتا ہے۔ وہ دس جوان پورا دن ایک دائرے کی شکل میں دشمن کا مقابلہ کرتے رہے اور ان میں سے کسی ہلکی سی خراش تک نہ آئی جبکہ عیسائی لشکر کے لشکری کٹ کٹ کر گرتے رہے۔ شام کو یہ دس جوان ہنستے کھیلتے ہوئے واپس لشکر میں آ گئے۔ ان پر دشمن کی ہیبت طاری ہوئی، ان پر دشمن کی اکثریت اثر انداز نہ ہوئی۔ (۱۸)

یہ اس حقیقی محبت کا کرشمہ تھا جو مومن کے دل میں ان کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیلئے تھی، آپؐ کے لائے دین کیلئے تھی، دین کی حقانیت ان کے دلوں میں رچی ہوئی تھی۔ ان کیلئے زندگی تو زندگی تھی ہی، موت بھی ان کو اس لئے پیاری تھی کہ وہ شہید ہو کر اپنے پیارے رسول اور ان کے ساتھیوں سے ملیں گے اور ان کے ذریعے وہ اللہ سے ملاقات کر سکیں گے یہی وصل، عشق حقیقی کی منزل ہے۔

محبت زندگی میں آسانیاں پیدا کرتی ہے جب کہ محبت سے تہی زندگی آسائشیں ہونے کے باوجود تلخ ہو جاتی ہے۔ محبت مردہ دلوں کو بھی زندہ دل بنا سکتی ہے یہ مٹی اور گارے سے بنا ہوا آدم بھی محبت ہی کی بدولت نورالانوار اور روح الارواح کے قرب کا حقدار بنتا ہے، محبت ہی کی بدولت یہ قرب الٰہی کا حقدار ہو سکتا ہے پس یہ محبت ہی ہے جو آدمی کو انسان بنا کر نیابت الٰہی کی گدی پر بٹھا سکتی ہے۔

محبت ایک کشش مقناطیسی ہے جو کسی کو کسی کی جانب کھینچتی ہے کسی میں حسن و خوبی کی ایک جھلک دیکھ لینا اور اس کی جانب طبیعت کا مائل ہو جانا، دل میں اس کی رغبت اس کا شوق، اس کی طلب و تمنا اور اس کیلئے بے چینی کا پیدا ہونا، اسی کے خیال میں شب و روز

رہنا، اسی کی طلب میں تن، من، دھن سے منہمک ہونا، اس کے فراق سے ایذا پانا، اس کے وصال سے سیر نہ ہونا اس کے خیال میں اپنا خیال، اس کی رضا میں اپنی رضا، اس کی ہستی میں اپنی ہستی کو گم کر دینا یہ سب عشق و محبت کے کرشمے ہیں۔ جب محبت صفا کو پہنچ جاتی ہے یعنی جب حد کمال تک آجاتی ہے تو وہ اپنے تمام اوصاف و کمالات کے ساتھ محبوب کی جانب مائل ہو جاتی ہے عاشق کے تمام اوصاف محبوب کے اوصاف میں ضم ہو جاتے ہیں دونوں یک جان ہو جاتے ہیں ،حضرت امیر خسروؒ کا ایک مشہور شعر اسی کیفیت کی نشاندہی کرتا ہے:

من تو شدم تو من شدی، من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

ترجمہ: میں تُو ہو جاؤں تُو میں ہو جا، میں جسم بن جاؤں تو روح بن جائے تا کہ اس کے بعد کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ تو کوئی اور ہے میں کوئی اور ہوں۔ ایک عربی شاعر نے بھی اسی مضمون کو نظم کیا ہے ۔ (شاعر نامعلوم)

انا من اھویٰ ومن اھویٰ انا نحن روحان خللنا بدنا
فاذا البصرتنی البصرتُہ فاذا البصرتہ البصرینا

ترجمہ :وہ مجھ میں تبدیل ہو گیا اور میں اس میں بدل گیا ہم روحیں تو دو تھیں لیکن ایک ہی بدن میں سمائی ہوئی تھیں مراد یکھنا اس کا دیکھنا اور اس کا دیکھنا میرا دیکھنا بن گیا۔

یہ طے شدہ بات ہے کہ محبّ کو ہر حسین وجود، محبوب کا وجود نظر آتا ہے، کبھی مکمل کبھی جزوی، کبھی اس مجسم کا کوئی ایک پہلو، کوئی ایک حرکت اسے اپنے محبوب سے مشابہ نظر آئی تو وہ اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ کبھی کوئی ادا ہی اسے اس کی جانب مائل کر دیتی ہے۔

محبّ اس وقت اس مجسم کے عشق میں نہیں اپنے اصلی محبوب کے تصور میں اس کے قریب تر ہونے کی جدوجہد کرتا ہے، ادھر دوسری جانب حسن یا محبوب خود کو عاشق کے آئینے میں دیکھتا ہے، اس کے اپنے سامنے رکھا ہوا آئینہ اسے اس کے حسن کا منظر تو دکھا سکتا ہے اس کے حسن کے بارے میں زبان سے اظہار نہیں کر سکتا۔ اور حسن داد کا طالب رہتا ہے سو حسن کی

طلب عشق ہے اور عشق کی طلب حسن، یہ دونوں ایک دوسرے کے طالب بھی ہیں اور ایک دوسرے کے مطلوب بھی ہیں۔ بقول احمد الغزالیؒ:

''حسن کی آنکھ اپنے جمال سے دور ہوگئی ہے کہ اپنے حسن کے کمال کو نہیں پا سکتی لیکن عاشق کے عشق کے آئینے میں یقیناً حسن کو عاشق حاصل کر لیتا ہے تا کہ معشوق اپنے حسن سے عشق کے آئینے اور عاشق کی طلب میں اضافہ کر سکے'' (۱۹)

محبت کے بارے میں حضرت صوفی، مصنف، فلسفی ذوقی شاہؒ (پ۔۱۸۷۸ء وفات ۹ ذوالحجہ ۱۹۵۱ء مکہ مکرمہ عرفات اور وہیں مدفون ہوئے) سر دلبراں میں فرماتے ہیں:

''محبت ایک نسبت ہے درمیان محبّ اور محبوب کے، محبت کوئی چیز نہ ہوتی اگر اس کے یہ دو پہلو نہ ہوتے، محبی و محبوبی سے محبت ظہور میں آئی اور پہچانی گئی، محبّ و محبوب کی نسبت لوازم وعوارض ذات محبت سے ہیں، لیکن حقیقتِ محبت اپنی ذات میں تقیّد اور تنزہ سے مبرا و منزہ ہے۔ محبت معرفت کی محتاج ہے اور معرفت محبت کی، محبت کو معرفت پر تقدیم حاصل ہے اور معرفت کو محبت پر۔ محبت معرفت کا نتیجہ ہے اور معرفت محبت کا، یعنی بلا معرفت کے محبت پیدا نہیں ہوتی اور بغیر محبت کے معرفت میں ترقی نہیں ہوتی۔ محبت سے قبل صرف اجمالی معرفت کی ضرورت ہوتی ہے، اور بعد محبت کے حق تعالیٰ کی جانب سے انعام کے طور پر تفصیلی معرفت عطا فرمائی جاتی ہے۔'' (۲۰)

شیخ العارفین حضرت امام سہل بن عبداللہ تستریؒ (پ ۲۰۰ھ شوستر، اہواز، ایران، وفات ۲۶۱ھ بصرہ) فرماتے ہیں:

''محبت یہ ہے کہ محبوب کے احترام میں اس کے اوامر و احکام کی مکمل اطاعت کی جائے اور اس کے نواہی یعنی منع کئے ہوئے کاموں سے ہمیشہ اجتناب کیا جائے'' (۲۱)

ایک بات سمجھنے کی ہے کہ جذبۂ عشق از خود پیدا نہیں ہوتا یا عشق کا انفرادی وجود ممکن نہیں عشق کا دراصل کوئی محرک ہوتا ہے اور وہ محرک حسن کے علاوہ کچھ اور نہیں، عشق حقیقی ہو یا مجازی، دونوں صورتوں میں حسن ہی دراصل عشق کا محرک ہے۔ عشق حقیقی میں حسن ازل ہی

محرک ہے۔حدیث قدسی ہے: کنت کنزاً مخفیا. ۔۔۔الخ (محققین حدیث کے مطابق یہ حدیث ضعیف ہے۔اور صوفیاء اسے تساہلاً پیش کرتے ہیں)

ترجمہ :''میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں پس میں نے مخلوق کو پیدا کیا کہ (اس کے ذریعے) پہچانا جاؤں''

''یہ چھپا ہوا خزانہ عشق کی ذات ہے اور اس کا حسن اس کا ذخیرہ ہے کہ جو معشوق کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور عشق کے آئینے میں جلوہ گر ہوتا ہے گویا عشق کی معرفت دو چیزوں سے متعلق ہے ایک حسن جو جلوہ گری کرتا ہے اور دوسری وہ شے جس کی صورت آئینہ دکھاتا ہے کیونکہ عشق اور حسن دونوں ایک ہی ذات سے ہیں ان کی حقیقت ایک ہی ہے۔'' ۲۲

یہ عام دیکھنے اور سننے میں آیا ہے کہ عین عبادت کے دوران بھی انسان کے سامنے، اس کے خیال وتصور میں اس کی تصویر آجاتی ہے جس سے اس کا دلی تعلق ہوتا ہے۔وہ کوئی چیز بھی ہوسکتی ہے۔محبوب ہستی، کوئی محبوب شے، دکان، کاروبار، زمین، منصب، اقتدار و اختیار وغیرہ۔ بقول حافظ شیرازی:

در نمازم خم ابروئے تو، چوں یاد آمد
حالتے رفت کہ محراب بفریاد آمد

ترجمہ :نماز کی حالت میں جب مجھے تیرے ابرو کی محراب کی یاد آئی تو مجھ پر ایک ایسی حالت (رقت) طاری ہوگئی کہ محرابِ مسجد بھی فریاد کرنے لگ گئی۔ (۲۳)

یہاں یہ تذکرہ شاید بے محل نہ ہو کہ اس خاکسار کی زندگی کے پینتیس چھتیس سال کھیل کے میدان میں گذرے، یہ زمانہ میرے لڑکپن اور جوانی کا زمانہ تھا اور اس دوران میرے خوابوں میں بھی کھیل بسا رہا اور بعض اوقات میں نے خواب میں دوسرے دن ہونے والے سپورٹس مقابلے کی منصوبہ بندی کی۔اور جس جس طرح میں نے خواب میں دیکھا تھا دوسرے دن کے واقعات بعینہٖ ویسے ہی پیش آتے رہے اس زمانے میں کھیل میرا passion تھا کھیل کا تصور میرے دل و دماغ پر ہر لحہ چھایا رہتا تھا گویا مجھے کھیل سے عشق تھا، سو یہ اسی عشق کی

کارستانی تھی۔

مومن کوحکم ہے کہ جب وہ اپنے رب کی عبادت کرے، اس کا ذکر کرے یا نماز کیلئے کھڑا ہوتو ایسے کہ وہ اپنے رب کو دیکھ رہا ہے یا کم از کم یہ کہ اس کا رب اسے دیکھ رہا ہے اس کیلئے ایک ریاضت کی ضرورت ہے اور یہی ریاضت ایمان کی محنت کہلاتی ہے (اگر یہ تصور ذہن میں رہے کہ وہ اللہ اکو دیکھ رہا ہے تو اسے خوش کرنے کیلئے، اس کی توجہ کے حصول کیلئے کام یا عبادت پورے خشوع وخضوع سے کرے گا اور اگر یہ تصور ذہن میں رہے کہ اللہ اس کو دیکھ رہا ہے تو وہ غلطیوں سے دور رہے گا۔ برائیوں سے بچے گا)

میر تقی میر کے والد علی متقی نے بیٹے کو وصیت کرتے ہوئے کہا تھا ''بیٹا عشق اختیار کرو کیونکہ عشق زندگی ہے عشق ہی سوز وساز ہے دنیا میں جو کچھ ہے عشق ہی کا ظہور ہے'' (۲۴)

عشق انسان کے دل میں ایک ہی وقت میں جن متضاد جذبوں کو پیدا کرتا ہے ان میں صبر اور بے کلی، اطمینان وعدم اطمینان، ہمت، حوصلہ اور کم حوصلگی، کم ہمتی اور اس طرح کے بے شمار متضاد رویے پیدا کرتا ہے اس کے علاوہ عشق درد بھی ہے دوا بھی، زہر بھی ہے تریاق بھی۔ میر تقی میر کہتے ہیں:

درد ہے خود ہی، خود دوا ہے عشق
شیخ کیا جانے تو کہ کیا ہے عشق
عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو
سارے عالم میں بھر دیا ہے عشق
کوہ کن کیا پہاڑ کاٹے گا
پردے میں زور آزما ہے عشق

پس یہ عشق ہی ہے جو ترقی کرتے کرتے اس درجے تک آجاتا ہے جب منفی جذبے اس سے بالکل منفی ہوجاتے ہیں۔ اور رہ جاتا ہے بس ایک ہی جذبہ اور وہ ہے لگن۔ یہ عشق یا محبت ہی ہے جس سے انسان کو حوصلہ وہمت عطا ہوتے ہیں تاہم:

بقول قاضی سلیمان منصور پوری: (۲۵)

''صبر، زہد، حیااور فقر سب محبت کے بغیر بے معنی ہیں۔ محبت ہی قوت قلب ہے، محبت ہی روح کی غذا ہے، محبت ہی قرۃ العین ہے، محبت ہی حیات الابدان ، دل کی زندگی، زندگی کی کامیابی کو دوام بخشنے والی، غرض محبت ہی سب کچھ ہے، محبت سے علاقہ پیدا ہوتا ہے، اس تعلق کو ارادہ قوی بناتا ہے، اب کشش اور جذب پیدا ہوتا ہے، اس کے بعد سوزش اور وقتی جلن، اس کے بعد پیار پیدا ہوتا ہے، اور وداد سے دل آشنا ہوتا ہے، اس میں ترقی ہوتی ہے تو شغف کا تسلط ہوتا ہے، اور محبت کا اثر قلب تک پہنچ جاتا ہے۔ مصائب کی برداشت آجاتی ہے، اور موانع سبک نظر آنے لگتے ہیں قرب کی تدبیر کی لگن ہوتی ہے، محبوب کے علاوہ سب تفکرات اور تصورات ختم۔ محبوب کی محبت دل پر حکمران۔ اس سے اگلی حالت ''عشق'' ہے اس سے بھی آگے 'تیم' کا درجہ''۔ ایک مشہور قول ہے'' **العشق نارٌ وتحرق ما سویٰ** ''(عشق ایک ایسی آگ ہے جو خود یعنی جذبہ عشق کے علاوہ ہر غیر (جذبے) کو جلا ڈالتی ہے)''۔

حافظ شیرازی نے بھی عشق کو ایک آگ قرار دیا تھا بلکہ آگ کی آگ، ایک آگ وہ ہے جو شمع کے شعلے میں ہے اور جس میں پروانہ جل کر خاکستر ہو جاتا ہے یہ آگ تو زندگی سے محروم کر دینے والی ہے اسے حافظ نے عشق کی آگ قرار نہیں دیا بلکہ ان کے ارشاد کے مطابق عشق وہ آگ ہے جو دل پروانہ کے اندر جلتی ہے اور وہ آگ زندگی بخش ہے، وہی آگ روح کی توانائی کا سبب ہے یہی آگ داستان عشق کی ابتداء بھی ہے انتہا بھی ہے: (۲۶)

عشق آں نیست کہ بر شعلۂ او خندد شمع
عشق آں است کہ اندر دل پروانہ زدند

ترجمہ: عشق وہ (آگ) نہیں کہ جس کے شعلے پر شمع ہنستی یا روشن ہوتی ہے (تن پروانہ جس آگ میں جل کر خاک ہوتا ہے اس کے جلتے جسم کے شعلے پر شمع ہنستی ہے اور تھوڑی دیر تک اس کے شعلے یا روشنی میں اضافہ ہوتا ہے)، بلکہ عشق وہ آگ ہے جو پروانے کے دل میں محبت کی صورت میں بھڑکتی ہے۔

ازاں بدیر مغانم عزیز می دارند
کہ آتشے کہ نمیرد ہمیشہ در دل ماست

ترجمہ: آتش کدے میں آتش پرست مجھے اسی لئے عزیز گردانتے ہیں (میری عزت افزائی کرتے ہیں) کہ میرے دل میں بھی آگ آتش کدے کی طرح مستقلاً جلتی ہے، کبھی بجھتی نہیں اسی عشق کی آگ والے مقولے کو اردو شعراء نے بھی موضوع سخن بنایا: (۲۷)

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالبؔ
جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

اردو کے ایک اور عظیم شاعر میر دردؔ آتش عشق کے حوالے سے کہتے ہیں:

اخفائے نار عشق نہ ہو آب اشک سے
یہ آگ وہ نہیں جسے پانی بجھا سکے
آتش عشق جی جلاتی ہے
یہ بلا جان ہی پہ آتی ہے

سو عشق آگ کا دریا ہے، جس کی گہرائی کا اندازہ نہیں، جس میں کودنے والے کیلئے آگے بڑھنا انتہائی خطرناک ہے قدم قدم پر جل جانے کا اندیشہ ہوتا ہے لیکن ایک دفعہ اس میں کود جانے کے بعد واپسی کا کوئی راستہ نہیں رہتا۔ عشق کے راستے میں آئی ہوئی موت بھی قیمتی ہوتی ہے، یہ تصور کرنا کہ ہر کسی کو موت نے آلینا ہے۔ عاشق سوچے کہ اس سے پہلے کتنے سونے جیسے ہیرے جیسے لوگ اس دنیا سے سدھار چکے ہیں۔ قیمتی وہی ہیں، تاریخ میں نام انہی کا ہے جن کے سامنے کوئی منزل رہی اور انہوں نے اس کیلئے جدوجہد کرتے ہوئے جان دی۔ جنہوں نے دنیا میں آکر عشق کا مزہ نہیں چکھا وہ دنیا میں ویسے ہی آگئے بے مقصد۔ جس دل میں عشق نہیں (ان کے دل میں اپنے خالق سے تعلق نہیں اور عشق رسولؐ نہیں) ان سے کتے اچھے ہیں کہ وہ اپنے مالک کے وفادار تو ہیں اور اسی کے در پر بھوکے ننگے پڑے رہتے ہیں مالک کا در چھوڑ کر کسی اور کے در پر دستک نہیں دیتے۔ نہ اپنی وفاداری تبدیل کرتے ہیں۔

رومیٔ کشمیر میاں محمد بخشؒ اپنی شہرۂ آفاق مثنوی سفر العشق معروف بہ 'سیف الملوک' میں انہی خیالات کو نظم کرتے ہوئے عشق کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں: ۲۸

کیہہ کجھ بات عشق دی دساں قدر نہ میرا بھائی
ایہہ دریا اگی دا وگدا، جس دالاہتگ نہ کائی
جس نے قدم اگیرے دھریا سو یو سڑیا سڑیا
پر اتھے سڑ مرن حیاتی، اینویں گل نہ اڑیا
جنہاں عشق خرید نہ کیتا اینویں ہی آ بھگتے
عشقے باجھ محمد بخشا کیا آدم کیا کتے
جس دل اندر عشق نہ رچیا کتے اس تھیں چنگے
مالک دے گھر راکھی کردے، صابر بھکھے ننگے

عشق ایسا جذبہ ہے جو عظیم انسانی کارناموں کے وجود کا اصل باعث ہے۔ ایسا جذبہ جو مخلوق کو خالق سے ملانے کا سبب بنتا ہے یا اسے قریب تر لانے کا موجب ہوتا ہے۔ یہ عشق ہی ہے جو بالآخر انسان کی نیابت، خلافت کے حصول کی وجہ بنتا ہے۔ آدمی کو انسان بنانے والا دراصل عشق ہی ہے۔ عشق کوئی سفلی جذبہ نہیں نہ یہ ہوس سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ''شیوہ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا''۔

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات
عشق سکون وثبات، عشق حیات ومات

جو کوئی اس راہ عشق کا مسافر ہوگا وہی اس کائنات کے سربستہ راز کھولنے کی صلاحیت کا حامل ہوگا وہی ہے جو کائنات کا قائد کہلا سکتا ہے اہل عشق کی زندگی غیر فانی ہے اور موت اس زندگی کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ عشق زندگی کی بنیاد ہے، اصل حیات ہے، موت اس کیلئے معدوم ہے۔ موت اس پر حرام ہے۔ عشق کا جذبہ کبھی مر نہیں سکتا۔ اگرچہ زمانے میں حالات کتنے ہی ناموافق کیوں نہ ہوں عشق ان سے نبرد آزما ہونے اور کامیابی سے ہم کنار ہونے کی صلاحیت

رکھتا ہے۔عشق کسی ایک زمانے تک قید میں نہیں رہنا چاہتا۔نہ کسی زمان ومکاں میں محبوس ہو سکتا ہے۔اس کے پاس بے شمار زمانے ہیں جن کو کھوجنا ابھی باقی ہے۔اس کی تشریحات بجائے خود تشریح کی طالب ہیں۔اس کا ہر جز و تفصیل طلب ہے۔

عشق کی حکومت عالمگیر ہے،ابتدائے کائنات سے جو جذبہ اس کائنات کے رگ و پے میں جاری اور اس کی زندگی کی ضمانت رہا ہے وہ صرف اور صرف عشق ہے، یہ جذبہ ہر زبان میں مختلف ناموں سے صاحب شعور حضرات کی زبانوں پر رہا ہے،ان کی تحریروں میں رہا ہے ہم زبانوں کے جس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اس میں شروع کے عرصے میں لفظ ''حب'' یا ''محبت''،عشق کے متبادل کے طور پر مستعمل رہا ہے۔بعد ازاں شارحین،متصوفین،صوفیائے کرام نے اسے لفظ ''عشق'' سے تعبیر کیا۔اس کے مدارج ترتیب دیئے اور اپنی اپنی فہم کے مطابق ان مدارج کے نام رکھے۔لیکن ان تمام مدارج کی آخری کڑی ''عشق'' ہی رہی۔سو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ساری کائنات محبت (عشق) ہی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ **الحبُّ** (عشق) کے ظہور سے کائنات کا آغاز ہوا اور اسی حب کی آخر تک فرماں روائی رہے گی، ذرہ ذرہ میں محبت کے آثار اور محبت کے اثرات نمایاں ہیں، جمادات و معدنیات اور وہ اشیاء تک جنہیں عام طور پر غیر ذی روح قیاس کیا جاتا ہے محبت کی ہمہ گیری سے محفوظ نہیں' سوال یہ ہے کہ عشق کیا ہے؟۔کیا یہ بقول شاعر ایسا کوئی جذبہ ہے؟:

عاشقی چیست؟ بگو بندۂ جاناں بودن
دل بدست دگرے دادن و حیراں بودن

ترجمہ:

عاشقی کس کو کہتے ہیں؟ یہ کہ محبوب کا غلام ہو جانا؟ اپنا دل کسی اور کے حوالے کرنا اور حیراں ہونا؟۔

یہ امر غور طلب ہے کہ کیا عشق کا مطلب ایک نفس کا کسی دوسرے نفس کو محبوب قرار دینا ،اس کی ذات کی تلاش یا اس کے حصول میں پوری توانائی سے کوشش کرنا ،اس کی تلاش میں

سرگرداں رہنا، حیراں رہنا، پریشاں نظری کا شکار ہونا ہے یا پھر یہ کہ حسن (محبوب) تک پہنچنے کی کسی مثبت جدوجہد کا نام ہے؟ یہ درست ہے کہ عشق حسن سے ہے اور حسن عشق سے، حسن کے بغیر عشق معدوم ہے اور عشق کے بغیر حسن مجحوب۔ یہ دونوں ایک دوسرے کیلئے لازم وملزوم ہیں یہ دونوں حقیقتیں ازل سے ہیں اور ابد تک رہیں گی، ایک دوسرے کے بظاہر بالمقابل بھی اور بباطن متصل بھی، عشق کے درجات حسن کے انتخاب اور اس کے حصول کی منزل سے مشروط ہیں، محبوب جس درجے سے متعلق ہے عشق کی منزل بھی اسی درجے تک محدود ہوگی، فانی حسن سے عشق فانی اور لافانی حسن سے عشق لافانی، اور اس میں ہوس کی کوئی جگہ نہیں، ہوس عشق کے مقابلے میں ایسے ہی ہے جیسے سچ کے مقابل جھوٹ، حقیقت کے مقابل بطلان۔ روشنی کے مقابل اندھیرا۔ پس عشق ایک مثبت جذبہ ہے جو انسان کو وہاں پہنچا سکتا ہے جہاں اس کے گمان کا گذر بھی نہیں ہوتا، مافوق وماوراء سے بھی پرے، وہ مقام جس کی جستجو انسان کی روح کو ہے اپنی اصل کی جانب لوٹنا۔ اور وہ مقام یقیناً قرب الٰہی کا ہے، نیابت الٰہی کا ہے۔ نیابت الٰہی کے سمندر کے بڑے غواص انبیاء کرامؑ ہیں اور پھر ان کے عہد کے سچے پیرو اور پھر ان کے بعد کے لوگ، سب سے بڑے غواص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم، ان کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنھم، اہل بیت پھر تابعین، پھر تبع تابعین (**خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم**) (: سب سے اچھا میرا زمانہ ہے پھر اس کے بعد کا زمانہ اور پھر اس کے بعد کا زمانہ۔ عہد مصطفویؐ سے مکانی یا روحانی کے قرب کی طرح زمانی قرب بھی وقیع تر ہے۔

یہاں تک جو گفتگو ہوئی اس کا ماحصل یہی ہے کہ اس کائنات کی تخلیق کی غایت اولیٰ عشق ہے، سارا نظام کائنات اسی عشق کی تفسیر وتشریح ہے اور اسی عشق کا اظہار ہے اور یہی حسن ازل (خالق کائنات) کی طلب ہے جس کو کمال تک پہنچانے کا سہرا جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ اور آپؐ کی حیات طیبہ کے سر ہے۔ ایمان بالقلب اسی کی دلیل ہے کہ وہ عشق جو دل سے شروع ہو کر دل کے راستے ذات الٰہی تک پہنچے، وہی عشق جو حضرت

ابراہیمؑ کو اپنے واحد بیٹے کی قربانی سے ایک لمحے کیلئے بھی ہچکچانے نہیں دیتا جو آتش نمرود میں بے خطر کود پڑنے کی ترغیب دیتا ہے۔ پس یہی عشق ایمان کامل ہے اور اس عشق میں عقل کہیں بھی نظر نہیں آتی، کہ وہ تاویلات میں الجھا سکتی۔ ہاں اس عشق کے کسی حکم کی تعمیل کے راستے میں روڑے اٹکانے کیلئے کہیں کہیں سود وزیاں سمجھانے کی ناکام کوشش کرتی نظر آتی ہے جس کا رد مسلمان ہر سال جمرات میں کنکریاں مار کر کرتے ہیں۔

جان قربان کرتے ہوئے "فزت و رب الکعبہ" (رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا) کا نعرہ عقل کا کام نہیں یہ تو دل کا سودا ہے اسی لئے انبیاء کرامؑ کا ہدف ہمیشہ دل رہے ہیں، اولیاء علماء اور صلحاء ہمیشہ دلوں کی جانب متوجہ ہوتے اور متوجہ کرتے رہے۔ کہ یہی اللہ کے گھر ہو سکتے ہیں۔ ورنہ عقل؟ عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے۔ ہزار تاویلات اور حیلے بہانوں سے دامن چھڑا کے نکل جاتی ہے۔

عشق، خالق کی ودیعت کردہ صفت ہے اور چونکہ خالق ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا وہ لافانی اور باقی ہے سو اس کی صفت ہونے کے سبب عشق بھی لافانی ہے، امر ہے، عشق ازلی ہے، ابدی ہے، سارے زمانے اس کے ہیں اور اس کا اپنا سارا زمانہ ایک آن کے برابر ہے، ایک لمحے پر محیط ہے اسے دنیا پر سورج کے طلوع وغروب سے پیدا ہونے والے دنوں، مہینوں، سالوں، صدیوں سے نہیں ماپا جا سکتا، یہ ماہ وسال سے بے پرواہ ہے اس کا ایک لمحہ کائنات کی زندگی سے طویل تر ہے، لامتناہی ہے اس کے سامنے زمان کی یا مکاں کی کوئی رکاوٹ رکاوٹ نہیں، ہماری نظر، عقل یا احساس میں بس جانے والے پہاڑ، سمندر یا صحرا عشق کے سد راہ نہیں ہو سکتے اس لئے کہ سب زمانے، سب مکاں اس کے اپنے ہیں۔

باز بہ پیمانۂ لیل و نہار
فکر تو پیمود طول روزگار
تو کہ از اصل زماں آگاہ نہ
از حیات جاوداں آگاہ نہ

اصل وقت از گردش خورشید نیست
وقت جاوید است وخور جاوید نیست
وقت را مثل مکاں گسترده ای
امتیاز دوش و فردا کرده ای

ترجمہ:

تو سورج کی حرکت کے پیمانے سے رات اور دن کی پیائش سے دور رہ (لوٹ آ، باز رہ)، کہ تیرا یہ عمل یا فکر اس صرف دنیاوی زندگی کی لمبائی ماپ سکتی ہے اور کچھ نہیں، تو اس طرح زمانے کی اصل حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا اور نہ لافانی زندگی کی حقیقت کو جان سکے گا وقت سورج کی گردش سے نہیں ماپا جا سکتا کیونکہ وقت ایک لافانی حقیقت ہے اور سورج ایک فانی آلہ ہے۔ یہ دنیا وقت کیلئے مثل مکاں آراستہ کی گئی ہے اور اس میں ماضی اور مستقبل کے (دو کھلونے) زمانے پیدا کئے گئے ہیں۔

اس دنیا اور اس دنیا سے پرے ہر دنیا میں عقبیٰ میں عشق کا راج ہے وہ سب اس کی فرمانروائی میں ہیں۔ وہ جو ربّ اعلیٰ نے کہا" **لا تنفذ ون الا بسلطان**" (اور اسے تم عبور نہیں سکتے مگر سلطان کے ذریعے) تو عشق سلطان ہے عشق ایسی قوت ہے جو لامکاں پر شبخون مار سکتی ہے۔ بقول مولانا رومؒ:

بزیر کنگرہ ٔ کبریاش مردانند
فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

علامہ اقبال نے اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے:

در دشت جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بہ کمند آور، اے ہمت مردانہ

سو ہر زماں یا ہر مکاں عشق کی آماجگاہ ہے۔ وہ ہر جگہ شکار کرتا ہے اسے تسخیر کی جبلت تفویض کی گئی ہے۔ اس کی آخری منزل ذات مطلق ہے اور اس کی خودی کی تسخیر ہے۔

عشق کبھی قبر نہیں دیکھتا اسے کبھی موت نہیں آسکتی۔حتیٰ کہ جس جسم کے دل میں عشق نے بسیرا کرلیا ہو ان جسموں کو مٹی پر حرام کردیا گیا ہے۔مٹی ان کے کفن تک میلے کرنے کی جرأت نہیں کرسکتی۔وہ جسم عشق کی بدولت زندہ رہتے ہیں اور انہیں وہیں ''رزق'' دیا جاتا ہے(یہاں رزق سے مراد روٹی یا جسمانی غذا ہی نہیں بلکہ دیگر نعمتیں بھی ہیں)وہ مزے میں رہتے ہیں،وہ صاحبِ عشق دل جن میں خالق اپنی صفات کی تجلی کرتا ہے جیسے اس نے طور پر تجلی کی،طور تو برداشت نہ کرسکا جل کر سرمہ ہوگیا۔مگر یہ دل اس تجلی سے روشن تر ہو جاتے ہیں اور ان دلوں کی دنیا کو روشنی میسر آتی ہے،ہدایت کی روشنی،علم کی روشنی،محبت کی روشنی۔یہ جان لینا ضروری ہے کہ عشق جسمانی قوت کا نام نہیں،سوال یہ نہیں کہ تن کتنا طاقتور ہے؟اس کے اعصاب کتنے تنے ہوئے ہیں؟یہ سب عشق کی ضرورت نہیں،عشق کی تخلیق ہوا،مٹی،پانی یا آگ سے نہیں ہوئی کہ تن کی قوت کا احساس کیا جاسکتا،عشق تو روح کی قوت ہے اور روح ''من امراللہ'' ہے،عناصر اربعہ یا دوسرے عناصر سے تخلیق پانے والی ہر مخلوق اور تمام مظاہر،عشق کے مطیع ہیں۔اس کیلئے مسخر کردیئے گئے ہیں،عشق کی بدولت آگ گلزار میں تبدیل ہوسکتی ہے۔عشق سمندر میں دیواریں کھڑی کرسکتا ہے۔عاشق (نبی) کی مخالفت کرنے اور اسے ایذا دینے والے نمرود جیسے عالمگیر بادشاہ کا سرفخر مچھر جیسی کمزور مخلوق جھکا سکتی ہے،عشق راکھ بھی ہے اور شعلہ بھی۔اس میں جلال بھی ہے اور جمال بھی،ناز بھی ہے، نیاز بھی۔عشق کا کام علم الکلام،علم البیان اور عقل و دانش سے بڑھ کر ہے۔یہ اشارۂ انگشت سے چاند کو دو ٹکڑوں میں تبدیل کرسکتا ہے،ڈوبتے سورج کو پلٹا سکتا ہے۔یہ عشق ہی ہے جسے حسن کی حضوری کا اعزاز حاصل ہوا۔حسن ازل کے حضور بیٹھنے کی سعادت نصیب ہوئی (**ثم دنیٰ فتدلیٰ ثم قاب قوسین او ادنیٰ**'')۔عشق ہی باعث تخلیق عالم ہے،عشق ہی نے حسن سے عالم کو آگاہ کیا ورنہ حسن تو حجاب میں تھا۔

یہ کمال صرف اور صرف حضور اقدس ﷺ کو حاصل ہے اس لئے کہ عشق اور وہ بھی عشق الٰہی کی انتہاء تک،صرف آپ ﷺ ہی کی ذات مبارک پہنچی۔باقی سب کو جو جتنے رتبے کا

بھی ہو، جس کمال کا بھی ہو اسے عشق الٰہی تک پہنچنے کیلئے نبیٔ پاک ﷺ کی ذات کا واسطہ لازماً درکار ہے ہر انسان کو پہلے حضور ﷺ کے عشق میں کمال تک پہنچنا لازم ہے یہی عشق اسے بالآخر عشق الٰہی تک لے جا سکتا ہے۔

استاد شہیدی مرتضٰی مطہری'' انسان کامل، مکتبہ عرفان وتصوف'' میں رقم طراز ہیں:

''نبیٔ پاک ﷺ جو بلا شبہ اسلام کے انسان کامل کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں۔ اگر ہم کامل انسان بننا چاہیں اور اپنے آپ کو انسان کامل کے درجہ پر پہنچانا چاہیں تو فقط اسلام کی تعلیم و تربیت کے تحت ہی ممکن ہے۔ کامل انسان کا پہچاننا ہم مسلمانوں پر اس لئے لازم ہے کہ وہ علم انسانیت کیلئے نمونہ اور مثل کا حکم رکھتا ہے۔ انسان کامل وہ ہے جو جو تمام انسانی اقدار میں کمال رکھتا ہو اور جس کی شخصیت میں تمام اقدار اسلامی تعلیم و تربیت کے ذریعے پرورش پا کر ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر کمال کو پہنچتی ہیں۔ مکتب عشق جو در حقیقت مکتب عرفان ہے اس میں انسان کا کمال عقل کی بجائے عشق میں سمجھا جاتا ہے (وہ کمال) جس تک عشق، انسان کو پہنچاتا ہے اور اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات سے عشق ہے۔''(۲۹)

حضرت شیخ احمد الغزالیؒ (م ۔ ۵۲۰ھ صاحب کنوز الاسرار و رموز الاحرار۔ برادر صغیر حضرت امام غزالیؒ) کہتے ہیں:

''عشق کو عشق کے علاوہ نہیں پایا جا سکتا۔ علم نے اسی عشق سے ایمان کی آگاہی حاصل کی اس کی حد، وصف کی حد سے باہر ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کتنا اور کیوں ہے؟ عشق اسم اور رسم سے باہر رہا ہے۔ علم کو اس سے دو قسمیں ملیں، عشق قدموں میں بیٹھنے والا پرندہ ہے، اس کی قوت کبھی وجود ہے کبھی عدم۔۔

عشق را جز بہ عشق نتواں یافت
علم از وآگہی بہ ایماں یافت
حدش از حد وصف بیرون است
نتواں گفت چند یا چون است''

ترجمہ: عشق صرف عشق ہی کے ذریعے مل سکتا ہے، اس کے بارے میں ہر طرح کی خبر صرف یقین کی بدولت حاصل ہوتی ہے، اس کی صفت، صفت کی حدود سے باہر ہے (اس کی صفات کا اندازہ کرنا ممکن نہیں) عشق کے بارے میں کیوں، اور کیسے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (۳۰)

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر لفظ حب یا محبت ان معانی کو کفایت کرتے تھے تو ''عشق'' کا لفظ کس طرح اور کب سے استعمال ہونا شروع ہوا اور وہ بھی اتنے زور شور سے کہ 'محبت' اور 'حب' کہیں بہت پیچھے رہ گئے اور عشق ایک لفظ سے بڑھتے ہوئے ایک مکمل فلسفہ اور دبستان کا روپ دھارتا چلا گیا اور اس کے ہم معنی الفاظ نے شکست تسلیم کر لی، یہ سب کچھ کتنے عرصے میں ہوا اور اس کا آغاز کب اور کہاں ہوا؟ مولانا عبدالسلام ندوی نے ''اقبال کامل'' میں اس کا سراغ لگانے کی کامیاب کوشش کی ہے جس کی تائید ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے بھی ''فکر اقبال'' میں کی ہے، مولانا عبدالسلام ندوی کہتے ہیں:

''عشق اگرچہ عربی زبان کا لفظ ہے لیکن قرآن، حدیث اور شعرائے جاہلیت کے کلام میں یہ لفظ نہیں آیا ہے متاخرین شعرائے عرب نے بھی اس لفظ کا بہت کم استعمال کیا ہے اور عشق کی وہ اہم خصوصیات جو فارسی شاعری میں نظر آتی ہیں ان کا تو عربی شعراء کے کلام میں وجود ہی نہیں اس لئے ہمیں تاریخی حیثیت سے یہ پتہ لگانا چاہئیے کہ فارسی شاعری نے عشق کو اس قدر اہمیت کیوں دی ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ سب سے پہلے عشق اور عشق کی تمام خصوصیات کو فلسفۂ اشراق نے نمایاں کیا اور ان کو نہایت اہمیت دی۔'' (۳۱)

چنانچہ شیخ الاشراق (حضرت شہاب الدین سہروردیؒ) 'حکمۃ الاشراق' میں لکھتے ہیں :

ہر بلند نور کو نیچے کے نور پر غلبہ و اقتدار حاصل ہے اور نیچے کا نور بلند نور سے محبت رکھتا ہے اور اسی قہر و مہر سے نظام عالم کا وجود وابستہ ہے اور جب بہت سے انوار جمع ہو جاتے ہیں تو بلند نور نیچے کے نور پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے اور نیچے کے نور کو بلند نور کا شوق اور عشق ہو جاتا ہے۔ اس لئے نور الانوار یعنی خدا کو اپنے ماسوا تمام موجودات پر غلبہ حاصل ہے اور وہ اپنی

ذات کے سوا کسی سے عشق نہیں کرتا کیونکہ وہ وہ ہر چیز سے زیادہ خوبصورت اور مکمل ہے اور اس کو خود اپنا کمال نظر آتا ہے۔ اس لئے وہ عاشق بھی ہے اور معشوق بھی اور چونکہ خدا سے زیادہ پاکیزہ کوئی چیز حسین اور مکمل نہیں اس لئے کسی چیز کو بھی دوسری چیز کے عشق میں وہ لطف نہیں حاصل ہوتا جو عشق الٰہی میں ہوتا ہے'' (۳۲)

چھٹی صدی ہجری تک یہی نظریۂ عشق صوفیائے کرام کے ہاں راج کرتا رہا۔ صوفیائے کرام کے ہاں رائج دونوں فلسفوں یا نظریات (وحدت الوجود اور بعد ازاں وحدت الشہود) کی بنیاد یہی نظریہ رہا، صوفیاء کرام سے یہ فلسفہ ایرانی شعراء نے اچک لیا۔ انہوں نے جب فلسفۂ عشق کے نقطۂ نظر سے کائنات کو دیکھا، اور روحانی کیفیات کو جب مادی کیفیات پر منطبق کرنا شروع کیا تو جہاں اور جن جن چیزوں میں انہیں ایک دوسرے کیلئے کشش نظر آئی ان کو باہم عاشق و معشوق بنا دیا۔ بلبل کو گلاب کا، کبک کو چاند کا، پروانے کو شمع کا، قمری کو سرو کا وغیرہ۔ اور اس طرح کئی ایک عاشق و معشوق ڈھال لئے گئے۔ ایرانی شاعری سے یہ تمام نظریات غزل کے ذریعے اردو میں داخل ہوئے۔ پھر اردو شاعری بالعموم اور اردو غزل بالخصوص عشق کی نمائندہ بن گئی اور اظہار و بیانِ عشق کا وسیلہ بن گئی۔ عشق جو پہلے صرف اصل ذات کی کشش کا نکتۂ نظر تھا اب عموم میں داخل ہو گیا اور اس میں ہوس، جنس اور اس کے دیگر پسندیدہ و ناپسندیدہ لوازمات در آئے۔ اس پر غلیظ جذبات و احساسات کی گرد چڑھتی چلی گئی اور اصلی عشق کی شکل اسی گرد میں گم ہوتی گئی۔ عشق کے حقیقی مقام یا رتبے سے متعارف کروانے اور سالکان رہ عشق کی صحیح رہنمائی اور حقیقی عشق کی تشریح کیلئے طبقۂ شعراء میں چند ایک شخصیات نے زبردست کوششیں کی۔ ان میں شیخ سنائی، شیخ عطارؒ، پیر رومیؒ، حافظ شیرازیؒ، شیخ سعدیؒ اور برصغیر میں پہلے حضرت امیر خسروؒ، میرزا عبدالقادر بیدل، حالی اور پھر علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے سفلی جذبات کی آلودگیوں سے نظریۂ عشق کو پاک کرنے کی بساط بھر کوشش کی تاہم فارسی اور اردو کے دانشوروں میں مولانا رومؒ اور علامہ اقبالؒ ہی حقیقی عشق کے پیشوا، امام، فقیہہ و مجتہد نظر آتے ہیں۔ اقبال سے پہلے کچھ اردو شعراء نے اپنی

متصوفانہ شاعری کے ذریعے اپنے دامن کو نچوڑنے کی کوشش ضرور کی، لیکن وہ اس آلودگی سے اپنا دامن مکمل طور پر نہ بچا سکے حالانکہ انہوں نے دعوے تو بہت کئے اور تعلّی میں اتنا تک کہا:

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

لیکن ان کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوئی اور اگر یہ کامیاب بھی قرار دی جائے تو یہ محض انفرادی کوشش ہے اور خود کو عوامی عدالت میں بے گناہ ثابت کرنے کا ایک بیان ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ اس سے بعد کے لوگوں نے کوئی سبق حاصل نہ کیا۔۔

عشق کے مزید بیان سے پہلے یہ سوچنا ضروری ہے کہ عشق از خود پیدا نہیں ہوتا اور نہ از خود پنپتا ہے بلکہ عشق کیلئے کسی محرک وجود کا ہونا لازم ہے، عشق کی جو تعریف بڑوں نے کی ہے اس کے مطابق عشق کشش حسن سے عاشق یا شاہدِ حسن کے وارفتگی کے جذبے سے نظارگی اور حسن کی جانب میلان کو کہتے ہیں۔ عشق کا تذکرہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک عشق کے محرک یعنی حسن کا ایک سرسری سا تذکرہ نہ کیا جائے۔

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر (صاحب اسلامی ثقافت) لکھتے ہیں ''قرآن مجید کی تصریحات سے پتہ چلتا ہے کہ حسن ایک مطلق و عالمگیر اور حرکی و ارتقائی جمالیاتی قدر ہے اور 'تسویّہ وتعدیل' کی جمالیاتی قدروں کا مرکب ہے۔ تسویہ کے معانی ہیں: موزونی وہم آہنگی: اور اعتدال میں توازن وتناسب کا مفہوم پایا جاتا ہے علاوہ بریں حسن اپنی تاثیر کے اعتبار سے سرور وطمانیت اور حیرت واستعجاب کی مطلق و عالمگیر قدر ہے''۔ ۳۳

حسن کی اس تعریف کو حسن مطلق یا حسن خالق اور حسن مخلوق دونوں پر منطبق کیا جاسکتا ہے۔ یہی حسن دراصل عشق کا محرک ہے۔ وہ حسن مطلق ہو یا حسن منفرد، حسن منفرد حسن مطلق کی ذیل ہے، خواہ وہ کسی شکل یا وجود کی صورت میں ہو، حسن مطلق بالفاظ دیگر حسن ازل کی جلوہ آرائیاں جو کائنات کے ہر ذرے میں موجود ہیں ان کی کشش، نظارہ کرنے والے کے دل

میں تحریک پیدا کرتی ہے، نظارے کی خواہش یعنی خواہش دید کی یہی تحریک ''جذبہ عشق'' کہلاتی ہے۔ اب عشق شاہد حسن کے دل میں تمناؤں کو بیدار کرتا ہے آرزوؤں کی آبیاری کرتا ہے، جوش وخروش کی نمو کا ذمہ دار ہے، عشق حسن سے قریب سے قریب تر ہونے کی جدوجہد میں محو ہو کر بعض اوقات اپنے گردوپیش سے بے خبر اور خود سے بھی بیگانہ ہو جاتا ہے۔

حسن کا کوئی نہ کوئی وجود ہوتا ہے لیکن عشق تو ایک جذبہ ہے جو دراصل شہود کے بطن ہی سے پیدا ہوا ہے۔ یہی شہود یا خواہش دید آگے جا کر عشق کی شدت کا تعین کرتی ہے، گویا اگر حسن موجود نہ ہوتا یا اگر اس کے اندر دیکھے جانے یا چاہے جانے کی خواہش نہ ہوتی تو عشق کا وجود ممکن نہیں تھا۔ غالبؔ نے اسی جانب یعنی حسن کی خود بینی کی خواہش کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا:

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

حسن ظہور کا طالب بھی ہے اور شہود کا بھی، اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ شاہد سے مقتضی بھی ہے کہ وہ اپنے شہود، اپنی دید، حسن کی جانب میلان اور شدت خواہش نظارگی کا اظہار بھی کرے یہی اظہار جب متوازن اور مدلل بیان کی صورت میں سامنے آتا ہے تو بے شمار شاہدین حسن کے اظہارات کے مطالعے کی بنا پر جمالیاتی نظریے وجود پذیر ہوتے ہیں۔ پھر ان کی موضوعیت اور معروضیت کی بنا پر تقسیم کی جاتی ہے، اس کے بعد اس تقسیم در تقسیم کے نتیجے میں متعدد اور طرح کے نظریات جنم لیتے ہیں پھر ان کی تفہیم وتسہیل کے دفتر کھل جاتے ہیں، بات شروع اس سے ہوتی ہے کہ شاہد نے حسن کا نظارہ کیا، وہ نظارگی کے وقت کس کیفیت سے دوچار ہوا؟ اس کے بعد اگر اس نے اپنے شہود کا اظہار کیا تو کس درجے کا کیا؟ اسے اپنے اظہار پر قدرت تھی کہ نہیں، اس نے کیا اور کس طرح دیکھا؟ وغیرہ وغیرہ۔۔

مغربی دانشوروں نے جتنے نظریات قائم کئے ان کا موضوع نفسیاتی ہی رہا جیسے فرائیڈ کے جنسی جبلت کے نظریے کے علاوہ رابرٹ وشر، لپس، والکاٹ، شلر، ہربرٹ سپنسر، کارل

گروس، کانراڈ لینگے: ان میں سے کچھ اس نظریے کے حامی ہیں کہ حسن شاہد کے متعصب تحت الشعوری احساسات کے معروض میں ظل پذیر ہونے سے پیدا ہوتا ہے، ایک دوسرا گروہ اس نظریے کا حامی ہے کہ حسن، شاہد کی بصارت کا رہین منت ہے وہ حسن کو جیسا دیکھنا چاہتا ہے اسے ویسا ہی نظر آتا ہے، ایک اور گروہ یہ کہتا ہے کہ حسن، شاہد کی فعلیت تخیّل کے اظہار سے پیدا ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ 'کروشے' جس کا نظریہ تھا کہ حسن، شاہد کے اظہار تام کا نام ہے۔ ان کے برعکس مغرب سے برگساں اور مشرقی ارباب فکر و دانش بالخصوص مولانا رومؒ اور ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ کے خیال کے مطابق حسن کا موضوع نفسیاتی نہیں مابعد الطبیعیاتی ہے، حسن سے مراد حسن مطلق یا حسن ازل ہی ہے وہی حسن ابدی ہے اور اسے فنا نہیں۔ فطرت کے جتنے مظاہر ہیں وہ سب اسی حسن ازل ہی کے کرشمے ہیں، جیسا کہ ایک معروف فلسفی اور ماہر اقبالیات میاں محمد شریف نے علامہ اقبال کے جمالیاتی ادب کا تجزیہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے

''حسن کے بے شمار درجے ہیں مگر ان سب کی اصل وہی حسن مطلق ہے نا قابل تغیر اور غیر فانی، ادھر حسن منفرد قابل تغیر و فنا پذیر ہوتا ہے لیکن اُلوہی حسن ابدی ہے اس لحاظ سے ہر حسین شے ابدی ہے، کیونکہ وہ الوہی حسن میں شریک ہوتی ہے، یا یہ کہ الوہی حسن اس شے میں ظہور پذیر ہوتا ہے، فطرت حسین ہے اس لئے کہ وہ حسن قدیم و واحد میں شریک ہے، ہر حسین شے کا نظارہ ہمیں حسن ازل کی یاد دلاتا ہے، اور یہی بِنا ہے اس پراسرار حظ، جذبے اور خوشی کی جو کسی حسین شے کو دیکھ کر ہمیں حاصل ہوتی ہے، حسن ازل ان لوگوں پر ایک حیرت افزا جلوہ کی مانند ظاہر ہوتا ہے جو اسے محبوب رکھتے ہیں اور جن میں تاب نظارہ ہوتی ہے، جو اس کی معرفت سے ہمکنار ہوتے ہیں اور آخر دم تک اس کا کلمہ پڑھتے ہیں''۔ ۳۴۔

حوالہ جات

۱۔ قاموس اللغات ، المنجد ع ، ش ق

۲. ایضاً

۳۔ بائبل باب : ''محبت خدا ہے''۔

۴۔ بانگ درا غزلیات حصہ سوم غزل ۳

۵۔ اقبال کامل ۔مولانا عبدالسلام ندوی صفحہ 283

۶۔ مثنوی مولانا رومؒ مولانا جلال الدین رومی دفتر اول تمہید

۷۔ عمیق حنفی : ''اقبال اور مسجد قرطبہ''

''فکر اقبال کے منور گوشے'' :مرتبہ: ڈاکٹر سلیم اختر صفحہ ۲۶۱

۸۔ 'ایضاً''

۹۔علامہ اقبال ۔پیام مشرق لالۂ طور ق ۲

۱۰۔عوارف المعارف، حضرت شہاب الدین سہروردیؒ

۱۱. کشف المحجوب: حضرت سید علی ہجویریؒ باب المحبت

۱۲۔کدل : شفیق راجہ شعری مجموعہ

۱۳۔حکمت رومی: ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم: محولہ بالا

۱۴۔شاعر :نامعلوم؛ فضائل اعمال شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ

۱۵۔ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم:حکمت رومی ص ۸

۱۶۔مثنوی مولانا رومؒ جلال الدین

۱۷۔ایضاً

۱۸۔''اللہ کی تلوار''، خالد ابن الولید لفٹیننٹ جنرل (ر) آغا ابراہیم اکرم

۱۹۔احمد الغزالی م ۱۱۲۶ء مضمون:حسن و جمال اور عشق

۲۰۔۔حضرت ذوقی شاہؒ سرِّ دلبراں، مکتبہ ذوقیہ کراچی ۔ص ۲۸۰۔۲۸۱

۲۱۔ **کشف المحجوب** :حضرت سید علی ہجویریؒ **:باب المحبت**
۲۲۔عرفانی فارسی شاعری اور عطار پر ایک طائرانہ نظر از ڈاکٹر محمد شریف۔
(پیغام آشنا شمارہ ۵۴۔۵۳ اپریل تا ستمبر ۲۰۱۳ء)
۲۳۔دیوان حافظ شیرازی غزل ردیف 'د'
۲۴۔منتخب تنقیدی مضامین '
میر تقی میر کی غزلیہ شاعری'۔ ڈاکٹر سینہ اویس اعوان
۲۵۔''قاضی محمد سلیمانؒ منصور پوری۔رحمۃ اللعالمین'' جلد ۳
۲۶۔دیوان حافظ ردیف 'د' غزل ۵۵ شعر ۸
۲۷۔ ایضاً ردیف 'ت' غزل ۴ شعر ۸
۲۸۔سیف الملوک۔حضرت میاں محمد بخشؒ
۲۹۔عرفانی فارسی شاعری اور عطار پر ایک طائرانہ نظر از ڈاکٹر محمد شریف
۳۰۔ایضاً (پیغام آشنا شمارہ ۵۴۔۵۳) بحوالہ استاد شہیدی مطہری
۳۱۔فکر اقبال ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم
۳۲۔ بحوالہ 'اقبال کامل' ندوی، مولانا عبدالسلام
'صفحہ ۲۶۲۔۲۶۱ ناشر 'الفیصل' لاہور
۳۳۔(نصیر احمد ناصر، ڈاکٹر، اسلامی ثقافت۔ ص۔۲۶۱
۳۴۔میاں محمد شریف: مترجمہ سجاد رضوی 'جمالیات اقبال کی تشکیل' ۵۴
کتاب فلسفۂ اقبال باب اول بزم اقبال لاہور 1984
بحوالہ (پیغام آشنا شمارہ ۵۴۔۵۳ اپریل تا ستمبر ۲۰۱۳ء)

اسلام میں عشق کا تصور

اسلام کے خلاف مغربی دانشوروں کا پروپیگنڈہ پندرہ صدیوں سے جاری ہے، اسلام کے خلاف بعض مغربی حکماء وفلاسفرز نے اس تصور کو عام کیا کہ اسلام ایک خشک مذہب ہے اور اس میں فکر وتاثیر کی گہرائی نہیں ہے۔ اسلام کے متعلق گہرا مطالعہ کرنے والوں کو ہی بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ آخر وہ کون سا ایسا جذبہ ہے وہ کون سی تحریک ہے جو، اکیس سالوں کے اندر ہی اندر لوگوں بلکہ پتھر دل لوگوں کو موم کر پائی، ایسے لوگ جو اپنی معصوم ننھی بچیوں کو زندہ در گور کرنے میں ذرا سی بھی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے۔ معمولی معمولی باتوں کیلئے سالوں جنگیں لڑتے تھے اس وقت کی دو سپر طاقتوں جو ترقی یافتہ تہذیبوں کی نمائندہ تھیں ان کے نزدیک یہ لوگ (عرب) اس قابل بھی نہیں تھے کہ ان پر حکومت کی جائے، ایک دھائی میں ان کی کایا کلپ ہوگئی وہ مہذب ہو گئے، نظم وضبط کے پابند ہو گئے اور ایک امت، ایک وجود کے طور پر پہچانے جانے لگے، سامنے کی بات ہے جیسا کہ نعمانؓ بن مقرن نے شہنشاہ ایران یزدگرد کے دربار، ربعیؓ ابن عامر اور مغیرہؓ ابن شعبہ نے سپہ سالار ایران رستم کے دربار میں جواب دیئے جب ان فخر وتکبر والوں نے عربوں کی جہالت کا تذکرہ کیا اور ان کی تہذیبی برائیاں بیان کیں تو انہوں نے کہا: ہاں جو کچھ تم نے کہا ہم ایسے ہی تھے لیکن اللہ نے ہم پر فضل واحسان کیا اللہ کو ہم پر رحم آیا اور اس نے ہماری ہدایت کیلئے ہم میں ایک رسولؐ مبعوث کیا جس نے ہمیں راہ راست کی ہدایت کی اور مخالفین دین کو زیر کیا اور کل روئے زمین پر فتح دینے کا دعویٰ کیا ہے''۔ پس اسلام ہی وہ قوت تھی جس نے ایک غیر مہذب، اور منتشر گروہ یا قوم کو ایک مہذب اور متحد قوت میں تبدیل کیا، اسلام کے دین کی روح دراصل عشق یا ایمان کا

جذبہ ہی تھا۔ اللہ سے عشق، اللہ کے رسولؐ سے عشق، اللہ سے ملاقات (وصل) پر ایمان اور موت سے پہلے کی اس زندگی کو حجاب سمجھنا، اللہ کے وعدوں پر سو فیصد یقین یہ سب کچھ عشق کے بغیر ممکن نہیں، اگر دل، زبان کی بات کی عملی گواہی نہ دے جو صرف عشق ہی کی بدولت دی جاسکتی تو باقی صرف لفظوں کی بت گری رہ جاتی ہے۔ لفظ (یقین کے بغیر) محض الفاظ کے بت بن کر رہ جاتے ہیں۔ علامہ کے ارشاد کے مطابق::

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

مغرب کے دانشوروں اور مفکرین کے ہاں کل کائنات انسان کا ظاہری جسم اور اس کی ضروریات ہیں اور علم ابتداء و انتہاء کیوں، کیسے، کہاں، کیا وغیرہ الفاظ ہیں جو انسانی عقل کی پیداوار ہیں۔ ادھر عشق عقل کے مقابلے میں وجوہات کریدنے سے گریز کرتا ہے، عشق یا ایمان اسباب کے اختیار میں اتنا اتاؤلا نہیں، دین اسلام میں سادگی اصل ہے۔ کھانے پینے کی سادگی، رہنے میں سادگی، پہننے میں سادگی، بناوٹ سے اجتناب، عہد حاضر میں مغربی تہذیب کے ہتھیاروں (بناوٹ، تصنع، فریب، مکر و دجل، شراب، شباب، عریانی، فحاشی وغیرہ) سے اعراض کی تعلیم دین اسلام کی تعلیمات کا حصہ ہے اسی لئے غیر مسلم مفکرین اسلام کو ایک خشک مذہب سمجھتے ہیں اس حوالے سے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم غیر مسلم مفکرین کے قول دہراتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''بالفاظ دیگر اسلام ایک بے روح جسم کی مانند تھا جس میں حکمائے اسلام نے جو یونانی حکمت سے متاثر تھے اور صوفیاء جو غیر اسلامی، حیات گریز نظریات کی عملی اور فکری تلقین میں مصروف تھے، انہوں نے حکمت اور روحانیت کو داخل کر کے ایک نیا مرکب بنا دیا جسے ہر ایک اکسیر حیات سمجھنے لگا۔ اس خیال نے ایک جزئی حقیقت کو کامل تحقیق بنا کر اسلام کے باہمی تعلق کی بابت گمراہ کن افکار کی ایک تعمیر کھڑی کر دی ہے۔''(۱)

حقیقت یہ ہے کہ دین اسلام کی تعلیمات کے مطابق ہر متنفس کی زندگی کا مقصد خالق کی

محبت اور اس کے قرب کا حصول ہے۔ اور اس کو ''خشکی'' سے تعبیر کرنا کسی اعتبار سے درست معلوم نہیں ہوتا۔ سنجیدگی سے اپنی منزل کی جانب متوجہ ہونا خشکی نہیں۔ کسی کھیل کے کسی مقابلے کے دوران اگر کھلاڑی میدان سے باہر کسی نظارے میں محو ہو جائیں تو وہ کھیل کی جانب توجہ نہیں دے سکتے اور نتیجہ اس کھیل میں ہار یا شکست کے علاوہ کچھ نہیں۔ سو انسان اس دنیا کے میدان میں ایک کھلاڑی کی طرح ہے اور اسے اپنے حصے کا کھیل کھیلنا ہے۔ اس کی ذرا سی عدم توجہی اس کی شکست کا سبب بن سکتی ہے۔ پوری توجہ سے، مکمل صلاحیتوں کے ساتھ، ساری توانائیوں کے ساتھ کھیل میں محو رہنا اس کھلاڑی کے تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔ اور یہی عشق ہے۔ اسے کوئی سا بھی نام دیا جائے حقیقت یہی رہے گی۔

یہ بات یہاں تک درست ہے کہ قرآن پاک اور حدیث مبارکہ میں کسی جگہ لفظ ''عشق'' فی نفسہٖ استعمال نہیں ہوا۔ کیونکہ اس وقت تک عربی زبان میں اس لفظ کے متبادل بے شمار دوسرے الفاظ تھے۔ لیکن اسلام کی بنیاد عشق خدا اور عشق رسولؐ ہے یہ حقیقت ہے۔ قرآن پاک کا یہ ارشاد ''**والذین آمنو اشدُّ حباً للّٰہ**'' اور وہ لوگ جو ایمان لائے وہ اللہ سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔ لیکن یہ محبت بلا واسطہ نہیں بالواسطہ ہے۔ مومنین کی محبت نبیٔ پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نقوش پا کی اتباع میں مضمر ہے، وہ حضور اقدس پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی والہانہ پیروی ہی سے عشق الٰہی کی منزل کی جانب سفر کر سکتے ہیں وگرنہ نہیں، قرآن پاک میں ارشاد ہے: **قل ان کنتم تحبون اللّٰہ فاتبعونی یحببکم اللّٰہ** :ترجمہ: اے رسولؐ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ کی محبت کے طالب ہو تو میری اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا'' اس سے عشق رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا مقصد عشق الٰہی سمجھ آتا ہے۔ سو عام مسلمانوں کیلئے عشق الٰہی بالواسطہ اور خود نبیٔ پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا عشق الٰہی بلا واسطہ ہے۔ اس عشق کی انتہاء یہ ہے :

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

یا جیسا ارشاد علامہ ہے :

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

ازل سے ابدتک تمام انسانوں (بلکہ ساری مخلوق) کا عشق مل کر بھی نبیؐ کے عشق کے برابر نہیں پہنچ سکتا۔اس لئے کامل واکمل عشق صرف حضوا قدس پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے۔

عشق وعرفاں کا کمال یہ ہے کہ: عاشق کا اٹھنا، بیٹھنا، سونا جاگنا، کھانا پینا پینا، بات کرنا خاموش رہنا، غرضیکہ کہ روزمرہ زندگی کا ہر عمل، اس کے تمام افکار واعمال وجذبات کا محور محبوب کا عشق اور اس کا تصور ہو۔اور یہ کہ محبّ کی مرضی محبوب کی مرضی میں ضم ہو جائے۔خود لفظ اسلام اس کی غمازی کرتا ہے۔اپنے آپ کو سپرانداز کرنا، سرتسلیم خم کرنا، اپنی مرضی کو مالک کی مرضی کے مطابق ڈھال لینا، اپنی چھوڑ کر مالک کی خو کو اپنا لینا۔یعنی خالق کی مشیت کے سامنے مخلوق کی کامل تسلیم مشیت نبی کی زندگی میں یہ مقام مقرر ہو جاتا ہے تو اعلان نبوت ہوتا ہے اور اس کے بعد "وما ینطق عن الھویٰ ان ھوالا وحیٌ یوحٰی" (۲)

ترجمہ: وہ یعنی رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی مرضی اور خواہش سے کوئی بات نہیں کہتے بلکہ وہ جو بات بھی کرتے ہیں وہ اللہ کی طرف سے وحی کی ہوئی ہوتی ہے

وما رمیت اذ رمیت ولٰکن اللّٰہ رمیٰ..ترجمہ : اور اے نبیؐ جب آپ کنکریاں پھینک رہے تھے تو وہ آپ نہیں تھے بلکہ اللہ (خود) کنکریاں پھینک رہا تھا۔یہ ہے نبیؐ کا عشق۔جب عاشق اور معشوق محبوب اور محبّ من تو شدم تو من شدی کا مرحلہ عبور کرتے ہیں۔دوسری طرف متبعین کا عشق چونکہ باالواسطہ ہے لہٰذا ان کے عشق کے درجے کا تعین ان کی اتباع کے درجے سے ہوتا ہے۔

جس طرح کا عشق حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ سے تھا اسی طرح کا عشق صحابہ کرامؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تھا۔صحابہ کرام کی زندگی کے سینکڑوں ایسے

واقعات ہیں جب ان کے انتہائی عشق اور جذب کی کیفیتوں کا اظہار ہوتا ہے۔صحابہ کبارؓ میں کوئی ایسا شخص دکھائی نہیں دیتا جو استدلال کی بناء پر یا کسی خرق عادت معجزے کی وجہ سے رسول پر ایمان لایا ہو،ان لوگوں میں عشق،رسولؐ کی صحبت اور محبت سے پیدا ہوا اور اس محبت میں ایسی شدت تھی کہ باپ بیٹے،میاں بیوی، بھائی بہن اور والدین کی محبتیں اس محبت کے مقابلے میں قابل اعتنا نہیں تھیں حضرت ابوعبیدہؓ نے اپنے نام کے ساتھ اپنے مشرک باپ کا نام نہیں جوڑا بلکہ اپنے دادا جراح کے نام سے پہچانے گئے۔یہی نہیں بلکہ انہوں نے غزوۂ بدر میں اپنی تلوار سے اپنے باپ کو ہلاک کیا حضرت عمرؓ نے اسی غزوے میں اپنے سگے بھائی کو قتل کر دیا حضرت ابوبکرؓ صدیق اور ان کے بیٹے عبدالرحمٰن بن ابوبکر کے درمیان (حضرت عبدالرحمٰنؓ کے اسلام لانے کے بعد) مکالمہ تاریخ کا حصہ ہے جب بیٹے نے باپ کو کہا کہ ''اباجی بدر میں آپ دو تین بار میری تلوار کی زد پر تھے میں چاہتا تو آپ کو قتل کر سکتا تھا لیکن میں نے باپ سمجھ کر آپ کو چھوڑ دیا'' باپ کمال اطمینان اور صمیم قلب سے جواب دیتا ہے ''بیٹا اگر تو اس معرکے میں ایک بار بھی میری تلوار کی زد پر آیا ہوتا تو قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے میں تجھے کبھی نہ چھوڑتا'' غزوۂ احد میں جب نبیٔ پاکؐ کی شہادت کی خبر عام ہوئی تو مدینے سے ایک صحابیہؓ (حضرت ام خنساءؓ) میدان کی طرف دوڑ پڑیں وہ نبیٔ پاکؐ کا پوچھتی پھرتی تھیں لوگوں نے انہیں یکے بعد دیگرے ان کے چار بیٹوں کی شہادت کی اطلاع دی گئی لیکن ان کی جذباتی کیفیت میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی وہ بدستور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں استفسار کرتی رہیں آخر جب انہیں حضورؐ کی زندگی کے بارے میں پکی خبر موصول ہوئی اور انہوں نے حضورؐ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا جیسے ان کو قرار آ گیا ہو۔انہوں نے اپنے بیٹوں کی شہادت کی اطلاع پر کہا کہ اگر ان کے مزید بیٹے ہوتے تو ان کو حضورؐ پر نثار کر کے خوشی محسوس کرتیں۔یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ موجود ہیں تو ہمیں کسی دیگر رشتے کی ضرورت نہیں''۔

یہ تو ان اصحاب کے چند واقعات ہیں جو روزانہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر رہتے تھے اس عشق میں وہ حضرات بھی تھے جنہوں نے ابھی تک نبیؐ پاک کو دیکھا تک نہیں تھا حضرت اویس قرنیؓ اور حضرت مالک الخولانیؒ کہنے کو (لغوی اعتبار سے) تابعی ہیں لیکن ان کے عشق کی شدت کسی بھی اعتبار سے صحابہؓ سے کم نہیں تھی۔ اس میں کون شک کر سکتا ہے کہ اسلام عشق سے پیدا ہوا، عشق سے پھلا پھولا اور اس کی بقا کا راز بھی عشق ہی میں مضمر ہے۔ گویا عشق ہی کا دوسرا نام ایمان یا اسلام ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس عشق کا مقصود کیا ہے؟ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کہتے ہیں:

''آخری منزل ''خدا کا وصال کامل'' ہے جس پر وجود کا کوئی تصور قابل اطلاق نہیں اس لئے صوفیاء نے اس بقا کا نام عدم رکھ دیا ہے جس کے معنی اثبات کامل ہیں نہ کہ نفی ہستی:

پس عدم گردم عدم چوں ارغنون
گویدم کا انّا الیه راجعون

صوفیاء کے ہاں خدا کے پاس واپس لوٹنے کے عام ظاہری اور شرعی معنی نہیں بلکہ ذات الٰہی میں واصل اور یک رنگ و یک آہنگ ہونا ہے جو تمام جنتوں اور تمام اجروں سے افضل کیفیت اور ہر ہستی کی منزل مقصود ہے۔ منزل ما کبریاست'' (۳)

اسلام اس کائنات کو باطل، فریب ادراک یا ویدانت کی طرح ''مایا'' نہیں سمجھتا بلکہ قرآن پاک میں ارشاد ہے '' ربنا ما خلقت هٰذا باطلاً'' (۴)

ترجمہ: اے ہمارے رب تو نے اسے باطل (بے مقصد) تو نہیں بنایا۔ ایک اور جگہ ارشاد فرمایا گیا ''ہم نے اسے یوں ہی کھیل نہیں بنایا'' قرآن پاک میں خود انسان کو خطاب کرتے ہوئے ہوئے کہا گیا ''افحسبتم انّما خلقنا کم عبثاً وَّ انّکم الینا لا ترجعون. 0 (۵)

ترجمہ: کیا تم یہ گمان کر بیٹھے ہو کہ ہم نے تمہیں یونہی، بے کار، بے مقصد، بے مصرف پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری جانب لوٹ کے آؤ گے ہی نہیں؟''۔

دانشوروں کے خیال کے مطابق یہ ایک سنجیدہ اور معنی خیز حقیقت ہے جس کا مشاہدہ اور جس کے آئین خلاّق حیات و کائنات کی نشاندہی کرتے ہیں اسی حکمت کو قرآن 'خیر کثیر' کہتا ہے۔ قرآن میں ارشاد باری ہے:

۔'' یؤتی الحکمة من یشاء ، ومن یؤت الحکمة فقد اوتی خیراً کثیراً. وما یذّکر الّا اولوالالباب O ٦

ترجمہ: وہ (اللہ) حکمت جسے چاہتے ہیں اسے دے دیتے ہیں اور 'سچ تو یہ ہے کہ' جسے حکمت مل گئی اسے خیر کثیر مل گئی اور نصیحت تو وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہوتے ہیں)

حکمت صرف انہی کو ملتی ہے جن کے دلوں میں اس کی طلب ہو، جو اس کو چاہیں اور قدرت بھی ان کو اس خیر کثیر کے اہل سمجھے اور حکمت کوئی عام صفت یا محض ایک خوبی نہیں یہ تو خوبیوں کا ایک خزانہ ہے جس سے دماغوں اور دلوں کو نئی راہیں سجھانے میں مدد ملتی ہے، حکمت کا یہ خزانہ نئے نئے تخیلات کے 'ورود' کا پیش خیمہ ہے نئے معانی سمجھاتا ہے نئے زمانوں سے آشنا کرتا ہے اور حکمت سے صرف دانشور ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں حکمت اسی چیز کا نام ہے جسے سائنس اور فلسفہ اپنا مقصود سمجھتے ہیں۔

''اسلام کا تقاضا تو یہ تھا کہ اطاعت، عبدیت یا عبادت عشق کے درجے تک پہنچ جائے اور عبد، عابد عاشق بن جائے لیکن یہ عشق ایک طرف علم یا معرفت کی بدولت پیدا ہوا اور دوسری طرف معرفت اس عشق کو صراط مستقیم سے نہ ہٹنے دے''۔

ارشاد ہوا ''کل شئیٍ یرجع الیٰ اصلہٖ'' :(ہر چیز اپنی اصل کی جانب لوٹتی ہے)۔ تمام ارواح خدا سے صادر ہوئی ہیں۔ اور ان کی جو ماہیت ہے وہ الوہی ہے اس لحاظ سے ارواح بھی غیر مخلوق اور قدیم ہیں خدا سے لے کر جمادات تک موجودات کا ایک تدریجی نظام ہے ہر روح خدا سے جدا ہو کر پہلے اسفل السافلین میں گرتی ہے لیکن اپنی اصل کی طرف رجعت کا میلان اس میں بتدریج باقی رہتا ہے۔

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش
باز جوید روزگارِ وصل خویش

''عشق انسان کے اندر بصیرت اور قوت دونوں کا اضافہ کرتا ہے اور اسے ایسی حقیقت سے آشنا کرتا ہے جو زمانی اور مکانی نہیں عقل عالم مادی کو مسخر کرنے میں ید طولیٰ رکھتی ہے عقل خاراشگاف ہے مگر عشق، عالم مادی کو گھاس کے تنکے کے برابر سمجھتا ہے عشق کی قوت، طبیعات کے علم سے نہیں پیدا ہوئی اس کا ماخذ روح انسانی ہے جس کی باطنی قوتیں لامتناہی ہیں'' (۷)

ہر ذرہ ٔ کائنات اللہ کی مخلوق ہے اور اسی کی فرمانروائی میں ہے۔ اسی کی تسبیح و تحلیل میں دن رات مصروف ہے۔ انہی میں ایک جنس کی مخلوق انسان بھی ہے، جسے خلافت الٰہیہ کیلئے منتخب کیا گیا۔ انسان کو بھی اللہ کی بندگی کا پابند بنایا گیا ہے۔ اللہ کی عبادت کیلئے اللہ سے لو لگانے کو لازم قرار دیا گیا۔ کیونکہ یہی لو یا محبت یا عشق عبادت حقیقی کا اصل جوہر ہے اور جس عبادت میں عشق کا عنصر نہ ہو وہ عبادت محض اعضاء کی جنبش ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ محبت ہی ظلمت میں نور کا ڑھنے کا کام کرسکتی ہے، عشق ہی اندھیرے کی دبیز تہوں میں روشنی فراہم کرتا ہے، عشق ہی دراصل بنی آدم کو خلافت کے منصب اعلیٰ تک پہنچانے کا ذریعہ ہے سو عشق ایمان بھی ہے، عبادت بھی، صراط مستقیم بھی ہے اور اپنے امتحانات اور آزمائشوں کے اعتبار سے پل صراط بھی۔ جس پر سے عشق کے جذبے سے بھرپور ایمان والے آرام سے گذر جائیں گے۔

اور یہ کوئی صرف قیامت تک منحصر نہیں جس طرح جنت، جہنم یا میدان حشر میں جو کچھ پیش آنا ہے وہ کسی درجے میں اسی دنیا میں بھی انسان کو پیش آتا ہے۔ دنیا میں پیش آنے والا حادثہ، ہر آزمائش، ہر امتحان ایک طرح کا پل صراط ہے جس پر سے وہی کامیاب پار اترتے ہیں جن کا ایمان مستحکم اور عشق کامل ہوتا ہے اسی طرح، غصے کی شدت، خوف، ڈر یہ ساری کیفیات وہی ہیں جو میدان حشر میں روز قیامت کی نسبت سے بڑھ کر انسان کے سامنے ہوں گی۔ یہ بالکل اسی طرح ہے کہ جس طرح ہمارے تعلیمی اداروں میں سالانہ بڑے امتحان سے

پہلے پورے سال ہاؤس ٹیسٹ، سہ ماہی، ششماہی یا نو ماہی امتحان ہوتے رہتے ہیں۔ پھران سب کا اعادہ سالانہ امتحان میں کیا جاتا ہے اور پاس فیل کا فیصلہ ہوتا ہے، پاس ہونے والے اگلے درجے میں ترقی پاتے ہیں گویا انہیں جنت دے دی جاتی ہے اور وہ وہاں بڑے مزے میں ہوتے ہیں۔ ''**کلما رزقو منها من ثمرة الرزقاً قالوا هذا الذی رزقنا من قبل و اتو بها متشابها .. الخ ۸**

ترجمہ: جو کچھ انہیں یعنی جنتیوں کو دیا جائے گا وہ کہیں گے یہی یا اس جیسا ہمیں اس سے پہلے کہیں دیا جا چکا ہے۔

سو اس کلیے کے مطابق اس دنیا میں حشر سامانیاں موجود ہیں، بے شمار آزمائشوں سے گذر کر ہی آدمی انسان کے درجے تک پہنچ سکتا ہے اور اس کی آزمائشوں سے کامیابی سے گذرنے کا اصل سبب عشق ہی ہے سو عشق آزمائش بھی ہے اور کامیابی کا ضامن بھی۔ یہ امتحان بھی ہے اور سند کامیابی بھی۔ اور اللہ نے اپنی نازل کی جانے والی کتب اور صحائف میں انبیاء (انسٹرکٹرز، رول ماڈل، احکام الٰہی پر احکام الٰہی کے تقاضوں کے مطابق مکمل عمل کرنیوالے) اور بے شمار تمثیلات کے ذریعے بنی آدم کی تربیت کی ترغیب دی ہے کیونکہ اللہ نے ہبوط آدم کے وقت ارشاد فرمایا تھا ''**قلنا اهبطو فاما یأتینکم منی هدیً فمن تبع هدایَ فلا خوف علیهم و لا هم یحزنون0 ۹**

ترجمہ ''کہا ہم نے کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ ہم وقتاً فوقتاً تم تک ہدایات بھیجتے رہیں گے۔ سو جنہوں نے ہماری ہدایات کے عین مطابق عمل کیا تو (ہماری سمت واپسی کے وقت) ان پر کسی قسم کا خوف یا ڈر نہیں ہوگا نہ وہ غمزدہ ہوں گے''۔

تاریخ عالم کی سب سے معتبر تماثیل یا داستانیں صحائف سماوی میں رقم ہیں، جن میں انبیاء کرام علیہم السلام کے تذکرے ہیں یہ قصص الانبیاء عشق کی اعلیٰ ترین مثالیں فراہم کرتے ہیں انبیاء کے علاوہ سابقہ امتوں میں ان انبیاءؑ کے ماننے والوں میں اور بعد ازاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے پیغام کو قبول کرنے والے صحابہ کرام کے مکی دور میں

بے شمار مثالیں نظر آتی ہیں۔خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اذیتوں کے پہاڑ توڑے گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جسمانی ایذا رسانی کی انتہا کی گئی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نجاست پھینکی گئی، گردن مبارک کو رسی سے باندھ کر کھینچا گیا، آپ پر پتھراؤ کیا گیا، شعب ابی طالب میں تین سال تک سماجی مقاطعہ کیا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب اور سرپرست چچا پر دباؤ ڈال کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دین کی تبلیغ سے روکنے کی کوشش کی گئی تو جو جواب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا وہ استقامت، استقلال اور پامردی عزم وحوصلے کی انتہاء تھی'' چچا جان اگر قریش مکہ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند رکھ دیں تب بھی میں اپنے کام سے نہیں ہٹوں گا'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم عشق الٰہی کا مکمل نمونہ ہیں۔اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا عشق تو کوئی کر ہی نہیں سکتا تھا۔سو یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا منصب تھا کہ آپ عشق کے ہر امتحان پر پورے اترے۔کیونکہ آپ کا عشق تو انتہائی اعلیٰ مرتبے کا عشق ہے اور اسے ہی عشق الٰہی کہتے ہیں۔

یہی عشق ہے اور یہ عشق اسلام کی معراج ہے اور ایمان کا مقصود بھی۔عشق نہ ہو تو ایمان نہیں اور ایمان نہیں تو عشق نہیں۔

عشق -ایمان -عشق

ہرکہ پیماں باھــو الــمــوجــود بست
گردنش از بند ہر معبود رست
مومن از عشق است وعشق از مومن است
عشق را نا ممکنِ ما ممکن است

ترجمہ: جس نے حاضر و ناظر و ہرلمحہ ہرجگہ موجود و قائم و زندہ اللہ سے اپنا رشتہ محبت استوار کرلیا اس کی بندش غیر کی ہر بندش سے آزاد ہوگئی۔ایسا متنفس مومن ہے اور مومن کی ہستی عشق سے وابستہ ہے اور عشق کا وجود مومن سے قائم ہے ہر وہ امر جو عشق سے خالی انسان کیلئے ناممکن ہے عشق سے لبریز مومن کے لئے ممکن ہے۔ (۱۰)

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

مومن وہی ہے جس کے دل میں اللہ اور اس کی محبت کا سمندر موجیں مار رہا ہو۔وہ ہر حالت میں، ہر کیفیت میں اللہ کے سوا کسی کی مدد کا طالب نہیں ہوتا۔تذبذب یقین کا متضاد حرف ہے،تذبذب کی کیفیت بھی یقین کی کیفیت سے متصادم ہے۔کسی اللہ والے نے ''الٰہ'' کی تعریف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ کسی شدت میں کسی کی توجہ جس کی جانب پہلے ہو وہی اس کا الٰہ ہے۔مرض میں ڈاکٹر یا دوائی، پیاس میں پانی، بھوک کی شدت میں کھانا یا جس کھانے کی امید ہو۔اگر ان ساری کیفیات میں انسان اللہ کی جانب متوجہ ہو تو اللہ ہی اس کا

الٰہ ہے۔اور یہ کیفیت اس وقت تک پیدانہیں ہوسکتی جب تک انسان کے دل میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ کی محبت راسخ نہ۔اور یہ محبت کسی کے فیضان نظر سے یا برسوں کے مجاہدات کے ذریعے ہی ممکن ہے۔یہ عشق اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مرد مسلماں بھی کافر و زندیق

عشق ایمان کے بغیر ''**قد خاب من دسّٰھا**'' کے مصداق ہے:ایمان سراسر طاعت ہے یعنی اپنے معبود اور اس کے پیامبر کی غیر مشروط طاعت۔،اتباع اور اس سے محبت،رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنی محبت کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم،ایمان والے کو اپنی جان سے، اپنے والدین سے،اپنی اولاد سے اور اپنے مال ومتاع سے زیادہ محبوب ہو جائیں یہی کمال ایمان ہے اور اس کے بغیر دعویٰ ایمان باطل ہے۔حدیث پاک کا مفہوم ہے کہ ''اس وقت تک تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں (محمدؐ) اسے اس کے والدین سے،اس کی اولاد سے اور اس کی جان سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں'' یہی محبت ذریعہ ہے عشق الٰہی کا۔ ارشاد خداوندی ہے '' **قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللّٰہ**.. (۱۱)

''اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم مومنین سے کہہ دیجئے کہ اگر تم مجھ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا''۔

ایمان کی طرح عشق یا محبت کوئی اختیاری چیز نہیں نہ یہ کسبی جذبہ ہے۔یہ وہبی ہے، ودیعت شدہ جذبہ ہے جو دل کی بسیط تہوں میں انسان کی تخلیق سے ہی موجود ہے گویا یہ in built chip ہے جو انسانی کمپیوٹر کے motherboard میں لگا دی گئی ہے۔سو محبت ہر ذی نفس کی روح میں موجود ہے،جس کے تحت وہ کسی دوسرے کی جانب مائل ہوتا ہے یا اس کیلئے کسی قسم کے پسندیدگی کے جذبات محسوس کرتا ہے۔تاہم اس کا اختیار ہے کہ اسے تزکئے کے ساتھ استعمال میں لائے یا فجور کے ساتھ۔جیسا کہ اللہ نے ارشاد فرمایا'' **و نفسٍ و ما سوّٰھا0 فالھمھا فجورھا و تقوٰھا0 قد افلح من ذکّٰھا0 و قد خاب من**

دسّٰھا .. (۱۲)۔

ترجمہ: اور نفس کو ہم نے متوازن بنایا اس میں ہم نے برائی کا مادہ بھی رکھا اور تقوے کا بھی اب جس نے تزکیے کا راستہ اپنایا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اس کے مخالف راستہ اپنایا وہ تباہ ہوا۔

محبت اگر تزکیہ والی ہے تو وقت کے ساتھ شدت اختیار کرے گی اس طرح ایمان ترقی کرے گا۔ اور اسے ہمیشہ ہمیشہ کی کامیابی نصیب ہوگی بصورت دیگر چند لمحوں کا تلذذ اور ہمیشہ ہمیشہ کی ناکامی اور رسوائی اس کا مقدر ہوسکتی ہے۔ گویا محبت ایمان کا سبب ہے اور ایمان محبت کی غایت اولیٰ۔ ایمان کا عشق کے بغیر کوئی تصور نہیں۔ یہ عشق رسولؐ اور عشق الٰہی ہی ہے جو ایمان والوں سے بدر سے حنین تک، یمامہ سے یرموک تک، اور عراق سے قادسیہ تک کے کارنامے انجام دلاتا ہے۔ علامہ اقبال ''رموز بے خودی'' (حریت اسلامیہ وسر حادثۂ کربلا) میں ارشاد فرماہیں:

مومن از عشق و عشق از مومن است
عشق را ناممکن ما ممکن است

ترجمہ: مومن کی ہستی عشق پر موقوف ہے اور عشق کا وجود مومن پر موقوف ہے، ہر وہ کام جو میرے لئے بحیثیت ایک عام انسان ناممکن ہے عشق (کی بدولت) ممکن ہوجاتا ہے۔

سو یہ عشق ہی ہے جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں سے محیر العقل کارنامے انجام دلا چکا ہے۔ ان بے شمار واقعات میں سے ایک عقل کو حیران کردینے حضرت خالدؓ بن ولید کی سالاری میں طے کیا جانے والا سفر ہے جو سوئی کی مہم کہلاتا ہے ایک ایسا راستہ جو سارے کا سارا صحرا کا سفر ہے جس راستے میں پانچ پانچ دن کی مسافت تک پانی کا نام ونشان نہیں۔ اس راستے کے رہبر حضرت نافعؓ بن عمیر الطائی تھے جو راستے میں آشوب چشم کا شکار ہوکر بینائی کھو چکے تھے۔ ایک ماہ سے زیادہ مسافت لشکر اسلام نے چودہ دنوں میں طے کی اور راستے میں دو معرکے بھی سر کئے، پورا لشکر عنایت الٰہی سے اپنی منزل تک بحفاظت پہنچ گیا۔ اس سفر کے آغاز میں جب

رستے کی مشکلات کا تذکرہ ہوا تو حضرت خالدؓ بن ولید نے کہا ''مجھے یہ راستہ طے کرنا ضروری ہے مجھے اس سے زیادہ کیا کام ہوگا کہ میں رومیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی مدد کرنے کیلئے جارہا ہوں۔۔میں نے اپنی جان اللہ کی راہ میں وقف کردی ہے۔(۱۳)۔

یہ وہ جذبہ ہے جسے عشق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔اور جو ایمان کی اعلیٰ ترین حالت کا غماز ہے۔اللہ اور اس کے رسولؐ سے شدید محبت اور اس محبت کے مقابلے میں اپنی جان کو نثار کردینا یہی ایمان ہے اور اسلام کا اصلی تقاضا بھی۔

قادسیہ میں ایرانیوں اور مسلمانوں کے مابین فیصلہ کن لڑائی لڑی گئی۔حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ اسلامی فوج کے امیر عسکر ہیں ان کی فوج کے ایک مجاہد کے بارے میں شکایت موصول ہوئی کہ وہ شراب کا عادی ہے اور شاعر بھی ہے اسے حد جاری کرنے کیلئے قید کرلیا گیا قادسیہ میں دوسرے دن لڑائی زوروں پر تھی جسے ''یوم اغواث'' کے طور پر جانا جاتا ہے مسلمانوں کی فوج تھوڑی دبتی نظر آرہی تھی ابو محجن ثقفی دور سے لڑائی دیکھ رہا تھا وہ مجاہد تھا اس کا دل میدان جنگ میں جانے پر مچل رہا تھا،کبھی میدان جنگ کی طرف دیکھتا کبھی اپنے پاؤں میں پڑی بیڑیوں کی طرف دیکھتا جب ضبط نہ ہوسکا تو سالار عسکر اسلامی حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ کی بیگم حضرت سلمٰی سے کہنے لگا ''خدا کے واسطے مجھے رہا کردو اگر میں زندہ بچ گیا تو واپس آکر اپنے ہاتھوں سے بیڑیاں پہن لوں گا اور اگر مارا گیا تو مجھے دفن کروادینا۔ حضرت سلمٰیؓ نے کچھ خیال نہ کیا تو ابو محجن ثقفی افسوس کے لہجے میں اشعار پڑھنے لگا جس کے دو شعر درج ذیل ہیں: (۱۴)

کفیٰ احزنا ان ترتدی الخیل بالقنا
وازنک مشدودا علی و ثاقبا
اذ قمت عنانی الحدید وغلقت
مصاریع من دونی تصم المنادیا

ابو محجن نے مزید کہا: (۱۵)

یقطّع قلبی حسرۃً ان اریٰ الدعی
ولا سامع صوتی ولا من یرانیاً
و ان اشھد الاسلام یدعو مغوّثا
فلا انجد الاسلام حین دعانیا
وقد کنت زا مال کثیراً و اخوۃ
وقد ترکنی واحداً لا اخی لیاً
سلیمی رعینیٰ اروِ سیفی من العدا
فسیفی اضحیٰ ویحہ الیوم صاریا
عینی اجلُّ فی ساحۃ الحرب جولۃ
تفرّج من ھمی و تشفی فوأدیا
وللّٰہ عھد لا احیف بعھدہٖ
لئن فرجتُ ان لا ازور الحوانیاً

ترجمہ: ''اس سے بڑھ کر اور کیا غم ہوگا کہ سوار نیزہ بازی کر رہے ہیں اور میں زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوں جب میں کھڑا ہونا چاہتا ہوں تو زنجیر اٹھنے نہیں دیتی بیڑیوں کی جھنکار مجھے ایسے گیت سناتی ہے جو پکارنے والے کو بہرہ کر دیتی ہے اور اس طرح دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں کہ کسی کو پکار و تو وہ سنتا ہی نہیں۔ اور قتل ہونے والی جگہ (میدان جنگ) مجھ سے دور کر دیا گیا ہے۔ (حالانکہ) میں بہت مال و متاع والا اور بہت بھائیوں والا تھا اور انہوں نے مجھے چھوڑ دیا اب میرا کوئی بھائی نہیں رہا''۔

سلمٰی کے دل پر ان اشعار کا اثر ہوا اور انہوں نے وہ بیڑیاں آ کر کاٹ دیں اور حضرت سعد کا خاص گھوڑا ''بلقاء'' نامی ان کو دے دیا ابو محجن ثقفی سوار ہو کر میدان جنگ میں جا نکلا اور نیزہ بازی کرتے ہوئے اللہ اکبر کہہ کر دشمن کے میمنہ پر حملہ کر دیا پھر تکبیر کہہ کر میسرہ

پر الٹ پڑا وہ اس زور شور سے حملہ کر رہا تھا کہ خود حضرت سعدؓ اور تمام لشکر اس کے مردانہ وار حملوں سے متحیر تھا حضرت سعد سوچ رہے تھے کہ لڑائی کا انداز تو ابو محجن کا ہے لیکن وہ تو قید ہے اور یہ گھوڑا تو میرا گھوڑا بلقاء کی مانند ہے یہ آخر ماجرا کیا ہے؟! یہ جری سوار آخر ہے کون؟! اس دن جنگ ختم ہوئی اور ابو محجن نہایت سرعت کے ساتھ واپس آیا اور اس نے آ کر بیڑیاں پہن لیں۔

سالار واپس آئے اور ابو محجن کو بیڑیوں میں دیکھا، گھوڑے کی طرف گئے تو وہ پسینے سے تر تھا سارا معاملہ سمجھ گئے بیوی سے پوچھا تو اس نے ساری بات بتا دی تو حضرت سعدؓ کہنے لگے ''واللہ جو شخص مسلمانوں پر ایسی جانثاری کرے دین کیلئے ایسی جرأت کا مظاہر کرے میں اس کو گرفتار نہیں رکھ سکتا نہ اس پر حد جاری کر سکتا ہوں اسے فوراً رہا کر دیا۔'' ابو محجن کہنے لگے ''امیر آپ گواہ رہیں میں نے شراب نوشی چھوڑ دی''۔

ذرا سوچئے ایک شخص جو قید ہے اور اس پر ایک اخلاقی جرم ثابت ہو چکا ہے صرف حد جاری ہونا باقی ہے اسے تو قید سے بھاگنے کی سوچنی تھی لیکن ایسا کون سا جذبہ ہے جو اسے بھاگنے سے باز رکھ رہا ہے اور اسے اپنی جان اپنے دین پر وار دینے کی بجھا رہا ہے پس یہ جذبہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ غیر متزلزل تعلق یا عشق ہے، اگر جذبۂ عشق ابو محجن کے سینے میں موجزن نہ ہوتا تو وہ جنگ کے دوران، میدان جنگ کی بجائے قید خانے کو عافیت کی جگہ سمجھتا اور جان بچانے کو غنیمت سمجھتا لیکن عشق میں جان کی پرواہ کسے ہوتی ہے؟ عشق معجز نما ہے جان ناتواں سے بھی ایسے کارہائے نمایاں انجام دلوا سکتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ عشق کا یہ انداز، یہ ادا، بیان کی محتاج نہیں۔ یہی عشق ایمان کی غایت ہے۔

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو مرد مسلماں بھی کافر و زندیق

تاریخ اسلامی میں اس کی کئی مثالیں مل سکتی ہیں۔ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت مدینہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے مشرک بدرقہ کا اخلاص، سراقہ

کا عمل اور اسے دی جانے والی نوید، اور جنگ صفین میں، جنگ خوارج میں عیسائی غلاموں کا حضرت علیؓ کی جانب سے داد شجاعت، واقعہ کربلا میں حضرت امام حسینؓ کی طرف سے شہداء میں ایک عیسائی غلام کا نام، دوسری جانب فاتح ایران اور عشرہ مبشرہ میں شامل حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ کے بیٹے عمرو بن سعد کا لشکر یزید کی سالاری، یزیدی فوج جو خود کو اسلامی لشکر سمجھتی تھی ان کا طرز عمل اور بہیمیت، تاریخ ہند میں پلاسی کی جنگ میں میر جعفر کا کردار، سلطان ٹیپو کے مشیروں میں میر صادق اور میر پورینہ جیسے مسلمانوں کے کردار کے مقابلے میں سلطان ٹیپو کے سالار ڈھونڈیا داغ (ایک مرہٹہ جنگجو سالار جو سلطان کی فوج میں شامل رہا اور وفاداری کی مثال بن گیا)۔ پانی پت کی تیسری جنگ میں پیسوں کی خاطر ایمان بیچنے والے مرہٹوں کے مسلمان توپچی ابراہیم گاردی کا کردار (مرہٹوں کی شکست کے بعد جب اسے گرفتار کر کے احمد شاہ ابدالی کے سامنے لایا گیا تو اس نے کہا کہ میں دولت کیلئے لڑتا ہوں تو احمد شاہ ابدالی نے اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کرتے ہوئے کہا مسلمان کبھی دولت یا حرص ارض کیلئے نہیں لڑتا وہ تو اپنے دین کیلئے لڑتا ہے اور یہی جہاد ہے۔)

وفاداری بشرط استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑھو برہمن کو

حضرت سید علی ہجویریؒ ارشاد فرما ہیں: ''محبت کا مفہوم اور وسیع بیان محض الفاظ اور عبارات سے ادا نہیں ہوسکتا اس لیے کہ محبت ایک حالی چیز ہے، اور کبھی قالی نہیں ہوسکتی، یہ عشق سراپا وجدان ہے اور بحث و گفتگو سے بالاتر، اگر کوئی تمام جان سے چاہے کہ محبت کو تکلف اور کوشش سے ضبط کرے، اور اپنا لے تو ایسا ہرگز نہیں کرسکتا۔ اسی طرح جن دلوں کو محبت اپنا مسکن بنا لے ان سے تکلف سعی کے ساتھ محبت کو دور کرنا چاہیں تو بھی نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ کشف وحال اللہ کی عنایات سے ہے نہ کہ بندہ کے کسبِ محنت سے۔ اور اگر تمام جہان محبت کو اس شخص کے لئے جو محبت کا طالب و آرزومند نہیں ضبط و مہیا کرنے کی کوشش کرے تو ہرگز مہیا نہ کر سکے گا۔ اسی طرح تمام لوگ اگر اس شخص سے محبت کو دور رکھنا

چاہیں، جوفطری وازلی طور پر محبت کا اہل ہے،تو وہ ہرگز نہیں کر سکتے۔اس لئے کہ محبت ایک خالصتاً الٰہی شے ہے اور آدمی لاہی (لہودلعب میں مصروف رہنے والا) ہے اور کوئی بھی محض خواہش یا کوشش سے الوہی نعمت کو نہیں پا سکتا۔عشق ومحبت پر مشائخ کے بہت سے اقوال ہیں۔اور صوفیا کا ایک گروہ بندوں کی طرف سے اللہ تعالےٰ کے عشق کو جائز اور روا رکھتا ہے،لیکن حق سبحانہ، کی طرف سے مخلوقات کے لئے اس کو روا نہیں رکھتا، وہ کہتے ہیں کہ عشق اپنے محبوب سے رو کے جانے کی ایک صفت ہے اور بندہ حق تعالےٰ سے روکا گیا ہے،اور حق تعالی بندہ سے نہیں روکا گیا ہے، پس عشق بندہ پر جائز ہوگا اور خدا پر روا نہ ہوگا، کیا تو نہیں دیکھا کہ جب یعقوبؑ حضرت یوسفؑ کی محبت میں محو ومستغرق ہو گئے تو اُس وقت آپ کی حالت فراق تھی،اور جب پیراہن کی خوشبو آئی تو آنکھیں روشن اور بینا ہو جائیں اور جب تک زلیخا کو حضرت یوسفؑ کے عشق نے حیران و پریشان رکھا، تب تک اُس نے ان کا وصل نہ پایا اور آنکھیں بینا نہ ہوئیں لیکن واصل ہوتے ہی اُسے دل کی تمام مرادیں مل گئی،اور یہ طریقہ بہت ہی عجیب ہے کہ محبت میں ایک تو خواہشات کو ترک کرتا ہے،اور ایک اختیار کرتا ہے اور یہ بھی کہتے ہیں کہ عشق کی ضد نہیں ہے،اور حق تعالےٰ کی بھی ضد نہیں ہے لہذا چاہیے کہ عشق ومحبت اس پر جائز ہو،اور کلام اللہ میں ایسی متعدد آیات موجود ہیں''۔ (۱۶)

حوالہ جات

۱۔۔۔فکر اقبال۔ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم۔۔صفحہ ۲۶۸

۲ القرآن (سورہ والنجم)

۳۔ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم۔'فکر اقبال')

۴ القرآن آل عمران

(۵).القرآن : المؤمنون ۱۱۵ ''

۵. القراٰن سورۃ الشمس ''

۶. القرآن سورۃالبقرۃ ۲۶۹)

۷۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مولانا رومؒ کا نظریہ ارتقاء:

فکر اقبال صفحہ ۲۶۴ تا ۲۶۶، ۲۷۳)

۸. القراٰن البقرۃ پارہ الٓمٓ

۹.ایضاً''

۱۰۔ علامہ اقبالؒ۔رموز بیخودی در معنیٔ حریت اسلامیہ۔۔۔

۱۱. القراٰن سورہ آل عمران

۱۲.القراٰن سورۃ الشمس ''

۱۳۔'' تاریخ ابن خلدون جلد اول ودوم معرکۂ سوئی وبہراء''

۱۴۔تاریخ ابن خلدون حصہ اول جنگ قادسیہ معرکۂ یوم اغواث۔۔فٹ نوٹ)

۱۵۔البدایہ والنہایہ جلد دوم (جنگ قادسیہ۔۔یوم اغواث)

۱۶۔ کشف المحجوب حضرت سید علی ہجویریؒ باب ۱۷ باب المحبۃ

عشق (محبت) کا تصور
مختلف مذاہب میں

جس طرح اسلام کا تصور حیات عشق سے عبارت ہے اور اسی طرح دنیا میں دین محمدی سے قبل کے ادیان جن میں سے اکثر دین اسلام ہی کی ابتدائی اشکال ہیں اور بعد ازاں ان کے مختلف دنیا پرست علماء سوء کی جانب سے تحریف کا شکار ہوئے اور آج ہمیں ان کی تحریف شدہ حالت ہی میں دستیاب ہے۔ ان ادیان میں تحریف عقائد، عبادات اور معاملات میں زیادہ ہوئی۔ تصورات وغیرہ نسبتاً کم ہوئی ہے۔ ہم ان میں عشق یا محبت کے تصور کی جستجو کرتے ہیں۔

ہندوازم یا ودیا سناتھن دھرم:

(دنیا کا قدیم ترین مذہب جس کا تعلق مولانا شمس نوید عثمانی اپنی کتاب ''اگر اب بھی نہ سمجھے تو'' میں حضرت نوحؑ سے جوڑتے ہیں اور اس مذہب کی کتابوں (وید) کو آسمانی صحائف کا درجہ دیتے ہیں اور یہ تسلیم کرتے ہیں یہ وید بھی تحریف سے بچ نہیں پائے اور یہ کہ ان کی تعلیمات خالصتاً توحید پر مبنی تھیں اور شاید اب بھی ان تعلیمات کا سراغ ویدوں میں مل سکتا ہے۔ ہندوازم کوئی مذہب نہیں بلکہ یہ ایک خالصتاً جغرافیائی حقیقت ہے دریائے سندھ (سین) اور دریائے برہم پتر کے درمیان کی سرزمین ہندوستان کہلاتی ہے۔ تاہم یہاں کا قدیم ترین مذہب ودیا سناتھن دھرم ہی کو ہندو مذہب قرار دیا جاتا ہے)

قدیم سنسکرت میں محبت کیلئے پریت، پریم کے الفاظ یا اصطلاحات استعمال ہوتی رہی ہیں، دور حاضر میں ان اصطلاحات کا اطلاق ہر قسم کی محبت پر ہوتا ہے جن میں جنسی محبت، ہوا و ہوس اور خالص روحانی تعلق جو ایک ہندو کا اس کے دیوی دیوتاؤں سے ہوسکتا ہے اس کی تخصیص نہیں۔ ویدوں کے حساب سے ''کاما'' دیوتا ہے جو پرمیشور کا اوتار ہے اکثر ہندو دبستانوں کے تحت جو تناسخ یا آواگون کے قائل ہیں ''کاما' زندگی کے تیسرے روپ کے

اختتام کی علامت ہے۔تاہم عام طور پر کاما جنسی محبت یا ہوا وہوس کی علامت ہے۔

''پریما یا ''پریم'' محبت کے نشان اور خالص محبت کی اصطلاحات ہیں ہندوازم میں محبت ایک مقدس جذبہ ہے۔جس کے تحت محبت کرنے والا پریمی اپنے پریتم کیلئے اپنا سب کچھ، اپنا جیون تک تیاگ دینے کیلئے آمادہ رہتا ہے۔پریتم کی خوشی میں اپنی خوشی اوراس کے دکھ میں اپنا دکھ سمجھتا ہے وہ پریتم کے دکھ کوسکھ میں تبدیل کرنے کیلئے کچھ بھی کرسکتا ہے۔شری رام کرشن اور رادھا کی داستان محبت شری رام کا بن باس اور شریمتی رادھا کی اگنی پرکھشا یہ سب کچھ ایک لازوال محبت کا حصہ ہیں۔''کاما''اور''ریتی''ان کے ہاں محبت کے دیوی دیوتا ہیں۔اور ہندوازم میں قابل پرستش ہیں۔دوسرے الفاظ میں محبت یا عشق ان کے ہاں عبادت کے مترادفات ہیں۔

یہودیت:

اس آسمانی مذہب کی الہامی زبان عبرانی یا آرامی ہے جس میں توریت یا بقول ڈاکٹر حمیداللہ یونانی لفظ''نوموس'' کا نزول ہوا۔یہودی روایات کے مطابق محبت یا عشق کا متبادل لفظ''اھاوا''"Ahawa"استعمال ہوا ہے۔عبرانی عربی شکم سے نکلی اور بعدازاں عربی نے عبرانی سے دوبارہ جنم لیا۔سو''اھاوا'' عربی میں آکر''ھواء'' یااھواء بن گیا۔عربی میں ان الفاظ کا مطلب خواہش یا خواہشات لیا جاتا ہے۔خواہش عشق کے درجات میں پہلا درجہ ہے۔عربی میں پہلے درجے کیلئے استعمال ہونے والا لفظ ذرا مختلف صوت سے عشق کا اتمامی درجہ بن گیا۔جس کا مطلب اللہ اوراس کی مخلوق سے بے غرض محبت ہے۔یہ ان کے ہاں خالصتاً ایک روحانی جذبہ ہے جسے دنیاوی یا جسمانی خواہشات کیلئے استعمال نہیں کیا جاتا۔گویا یہ لفظ عبرانی میں''عشق''ہی کا مترادف ہے۔

بدھ مت:

ہندو ازم یا سناتھن دھرم کی طرح بدھ مت میں بھی''کاما''دیوتا جنسی محبت یا ہوا وہوس کی علامت ہے۔بدھ مت کی پیروؤں کی اکثریت''کاما''کو سچی اور حقیقی محبت یعنی عشق حقیقی

کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتی ہے۔'' کاما'' خودغرضی کی بھی علامت ہے۔کاما بدھ مت میں شیطان کی طرح کا ایک کردار ہے۔ جیسے آتش پرستوں کے ہاں'' خدائے اہرمن''

'' کرونا'' محبت اور رحم کی علامت ہے جو دوسروں کی تکلیف کو رفع کرتا ہے یہ اخلاق، روح، شعور اور وجدان کی بھی علامت ہے جو عشق کے راستے کیلئے لازم ہیں۔

''ایڈویسا اور'' میتاہ'' آفاقی محبت کی علامت ہیں مخلوق کی خالق سے ایسی محبت یا عشق جو غیر مشروط ہو۔ یہ محبت بدھ مت کے پیروؤں کے مطابق انہیں نروان تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔اس میں وجدان، خودشناسی اور عرفان کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ یہ محبت (عشق) اس محبت سے قطعاً مختلف ہے جو انسانی ذہن کو ہیجان اور تذبذب کا شکار کرتی ہے۔اس میں جنسی میلان یا ہوس کی کوئی جگہ نہیں۔ بدھ مت میں ایسی محبت کرنے والا خود کی بجائے محبوب یا اپنی ذات کی بجائے آسمان والے کی ذات کی طرف زیادہ توجہ رہتی ہے۔ بدھ مت میں تسخیر نفس کے ساتھ ساتھ تسخیر عالم کیلئے یہ واحد ہتھیار ہے۔جس سے بدھ کے سچے پیروکار کو لیس ہونا ہوتا ہے۔

عیسائیت:

(بائیبل۔ عہدنامہ عتیق میں تصور محبت یا عشق):

Love in the Old Testament

مسیح (حضرت عیسیٰؑ) کہتے ہیں کہ''عہدنامہ عتیق میں سب سے عظیم حکم (فرض) یہ تھا کہ''تم اللہ سے محبت کرو، کیونکہ خدا تمہارے دلوں میں، تمہاری روحوں میں اور تمہارے شعور تمہارے وجدان میں موجود ہے۔'' (۱)

(Matthew 22:36ff; Deuteronomy 6:5).

دوسرا عظیم حکم (فرض) تھا کہ'' تم اپنے پڑوسی سے اس طرح محبت کرو جس قدر تم خود اپنے آپ سے محبت کرتے ہو'' (۲)

(Matthew 22:39; Leviticus 19:18)

پھر انہوں نے کہا کہ یہ دو امر ایسے ہیں کہ کہ یہ تمام پیغمبروں کی تمام تعلیمات کی اصل روح ہیں۔یعنی خدا سے محبت اور اس کی مخلوق سے محبت۔اور یہی الہامی دین کی اصل ہے۔

(Matthew 22:40) (۳)

God's Love

خداوند کی محبت

تم بتا سکتے ہو کہ ایک شخص (جنون محبت میں اپنے محبوب پر) پروانہ وار اپنا آپ یا اپنا کیا کچھ قربان کر سکتا ہے محبت کرنے والے شخص (محبّ) کے دل میں محبت کی کتنی قدر ہے یا اس کا جذبہ کتنا شدید ہے اس کا اندازہ اس کے طرز عمل اور اس کے جذبے کے اظہار سے کیا جا سکتا ہے۔یا محبّ کا طرز عمل اس کے جذبہ محبت کا عکاس ہوتا ہے عہد نامہ عتیق میں تفصیل سے درج ہے کہ اللہ کی عظیم ترین صفت اس کی اپنی ذات میں موجود عظیم ترین محبت ہے۔خدا اپنی ذات سے (اور اپنی مخلوق سے) بے پناہ، بے انتہاء محبت کرتا ہے۔ (۴)

(Isaiah43.7 یسعیاہ ۷۔۴۳)

Since God delights so fully in his glory-the beauty of his moral perfection-it is to be expected that he delights in the reflections of this glory in the world. He loves righteousness and justice

(Psalm 11:7; 33:5;)

چونکہ خداوند اپنی عظمت، اپنی علوے مرتبت کی صفات (اور ان کے بیان) سے بہت خوش ہوتا ہے جو اس کی ذات کی انتہائی خوبصورت صفات ہیں۔سو خدا کی ذات سے یہ امید وابستہ کی جاتی ہے کہ وہ اپنی علوے شان (رحمت، کرم، فضل) کی جھلک سے دنیا (اور دنیا میں بسنے والی مخلوق خصوصاً انسان) کو منور کرے اور یہ سب اس جھلک سے مستفیض ہوں۔خود

خداوند نیکی (اور نیکوکار)، اور عدل (اور عادل) سے بہت محبت کرتا ہے۔ (۵)

(سام ۱۱:۷، ۳۳: ۵)

عہد نامہ عتیق میں اللہ سے محبت اور اللہ کی اپنی مخلوق سے محبت کا تذکرہ متعدد مقامات پر ملتا ہے۔ یہی محبت دین کو مطلوب ہے اور یہی دین کی اساس ہے۔ انسان اللہ سے اس کا فضل طلب کرتا ہے اس کی محبت کی دعا مانگتا ہے۔ رحم وعفو کا طلبگار رہتا ہے۔ اور خود نیکی کی راہ پر چلنے کی توفیق کا طالب رہتا ہے۔ یہ سب کچھ عہد نامہ عتیق میں سام کے دعائیہ جملوں میں موجود ہے

''انسان پکار اٹھتا ہے اے خدا اپنی راہ نیکی کی راہ پر چلتے ہوئے میری اعانت فرما میری زندگی کی حفاظت فرما ۔ مجھے مصائب سے نجات عطا فرما ایسے مصائب سے جو مجھے تجھ سے محبت کرنے سے روکیں'' اللہ یقیناً اس محبّ کی دعا کو اپنی عظمت کی خاطر قبول کرے گا اور اسے ان مشکلات ومصائب سے نجات دے گا (۶)

, Psalm 143:11

"His delight is not in the strength of the horse, nor his pleasure in the legs of a man; but the Lord takes pleasure in those who fear him, in those who hope in his steadfast love"

(Psalm 147:10, 11; 103:13).

خداوند کی رضا کو ماپا، تولا نہیں جاسکتا نہ اس کا تقابل دنیا کی کسی چیز سے کیا جاسکتا ہے۔ خداوند نہ جسمانی طاقت سے خوش ہوتا ہے خواہ وہ طاقت گھوڑے جیسی ہی کیوں نہ ہو۔ نہ اس کی رضا یا خوشی کا تقابل انسان کی جسمانی طاقت (مضبوط رانوں) سے کیا جاسکتا ہے بلکہ خداوند کی رضا انسان کے دل میں اس کی خشیت میں ہے۔ ایسے لوگوں کی خشیت جو خداوند کی محبت میں غیر متزلزل یقین رکھتے ہیں۔ (۷)

(Psalm 147:10, 11; 103:13).

he "delights in truth in the inward parts"

(Psalm 51:6);

he loves his sanctuary where he is worshipped

وہ (خداوند) سچائی سے خوش ہوتا ہے۔ سچائی میں اس کی رضا ہے۔ محبت کے دعوے میں سچائی یا اخلاص اس کی رضا کا سبب ہے۔ وہ ایسی بندگی میں خوش ہوتا ہے (جس سے اس کی محبت نصیب ہوتی ہے) جو اخلاص کے ساتھ صرف اس کے لئے کی گئی ہو۔ وہ جگہ مقدس ہے جہاں اس کی بندگی کی گئی ہو۔ (۸)

(Malachi 2:11) and Zion, the "city of God" Psalm 87:2, 3).

==========

عشق یا محبت کا تصور

بائیبل میں مذکور سچی محبت (عشق حقیقی) کی تلاش میں سات مراحل کا ایک سرسری جائزہ

Seven Steps to Finding True Love

There is probably no topic which has captivated people throughout the centuries and from most every culture than the topic of love. We put a man on the moon, broke the speed of sound, and mapped the human genome, but love remains a complete mystery. Science has not been able to explain it. Mathematics cannot predict it. Poets still wrestle with adequate words to describe it.

It may have been more than two centuries ago, but Plato's words have never sounded more true, "Every heart sings a song, incomplete." We are all looking for love. At any given moment, we may be far from it but we never stop

on the horizon. We hoping the next opportunity is just over
are all looking for true love.
One of our frustrations with love is our complete inability to keep it. Like sand slipping between our fingers, the harder we grasp the faster it seems to fall through. It would be nice if love was as simple as baking a batch of cookies or building a bird house for the backyard; a simple set of ingredients, a logical list of steps to take. But we all know the truth; love cannot be manufactured. It cannot be bought or traded. It cannot be forced. It cannot be controlled. It cannot be plotted
do's on a map or broken down into a checklist of to
But, it is possible to find true love; even unconditional
love!

ترجمہ: غالبًا دنیا کے تمام مذاہب ،فلسفوں اور تہذیبوں کی زبانوں کے ادب میں صدیوں سے لوگوں میں ''محبت'' سے زیادہ کوئی موضوع دلچسپی کا حامل نہیں رہا۔انسان کے قدم چاند تک جا پہنچے، ہم نے آواز کی رفتار سے زیادہ تیزی سے فضا میں اڑنے کے قابل ہو گئے، ہم نے انسانی جسم کی نس نس سے واقفیت حاصل کر لی لیکن محبت ایک معمہ ہی رہی، ۔یہ معمہ ہے سلجھنے کا نہ سلجھانے کا۔سائنس اس معمے کو حل کرنے کے قابل نہیں ریاضی محبت کے ضمن میں کوئی پیشگوئی نہیں کرسکتی۔شاعر، ادیب ،اور نقاد اس لفظ ''محبت'' کے معانی بیان کرنے کیلئے ابھی تک لفظوں کے ساتھ کشتی میں مصروف ہیں۔وہ بھی ابھی تک محبت کی تعریف صحیح صحیح بیان نہیں کر سکے۔گویا محبت کا لفظ ابھی تک تشریح طلب ہے۔شاید دوسو سال پہلے تک افلاطون کے اس جملے سے زیادہ سچائی کے نزدیک تر بیان سامنے نہیں آیا کہ ''ہر دل ایک نامکمل گیت گاتا ہے'' ہم سب محبت کے متلاشی ہیں۔ہم لوگ محبت سے کتنے ہی دور کیوں نہ ہوں، امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔اور موقعے کی تلاش میں رہتے ہیں خواہ وہ افق کے اس پار ہی کیوں نہ ہو۔ہم سچی محبت (عشق حقیقی) کے متلاشی رہتے ہیں۔جذبوں

میں انتشار محبت کی ناکامی کی دلیل ہے۔ جیسے ہم ہتھیلی میں ریت کو تھام لیں وہ آہستہ آہستہ پھسلتی چلی جاتی ہے اگر ہم اپنی گرفت کو زیادہ مضبوط کریں تو ریت اتنی ہی تیزی سے ہاتھوں سے پھسلتی جاتی ہے۔ کاش محبت اتنی آسان ہوتی جتنی بسکٹ کا ایک پیکٹ بنانا یا اپنے صحن میں پرندوں کیلئے ایک چھوٹی سی کوٹھڑی بنانا، سادہ سی چیزوں کا ایک سیٹ بنانا جس میں آسان آسان سی چیزیں ہوتیں، لیکن ہم جانتے ہیں کہ سچ کیا ہے؟ محبت کوئی چیز نہیں ہے جسے بنایا جا سکے، محبت کی نہیں جاتی محبت ہو ہی جاتی ہے، محبت خریدی نہیں جا سکتی نہ بیچی جا سکتی ہے۔ محبت میں جبر نہیں کیا جا سکتا نہ محبت پر پہرے لگائے جا سکتے ہیں۔ محبت ایک آفاقی جذبہ ہے اسے دنیا کے کسی نقشے میں کوئی انگلی لگا کر نہیں دکھایا جا سکتا نہ اسے کسی فہرست میں کسی شے کی طرح درج کیا جا سکتا ہے۔ ہاں حقیقی اور غیر شروط محبت کو پانا یا اس کی منزل دریافت کرنا ممکن ہے۔ (۹)

سات اقدامات ایسے ہیں جن کے ذریعے آپ سچی محبت کی کی دنیا کو اپنے اندر محسوس کر سکتے ہیں ان اقدامات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ سچی محبت/عشق محبّ سے محبوب پر اپنا سب کچھ نثار کرنے کے جذبے کا اظہار ہے

۲۔ سچی محبت کی خواہش آپ کو مشکلات میں مبتلا کر سکتی ہے۔ ان مشکلات کا ادراک اور کو سہہ جانے کی سکت اور حوصلہ پیدا کرنا۔ س راستے کی مشکل گھاٹیوں کو عبور کرنے کا عزم صمیم، اور خلوص سچی محبت (عشق) کیلئے لازم ہے۔

۳۔ محبوب کی خواہش کا احترام اور اس کے احکام کے سامنے سرنگوں کرنا اور ان کو پورا کرنے کی پورے اخلاص و دیانت کے ساتھ اپنی سی کوشش کرنا۔

۴۔ اپنی خواہشات کو تج دینا اور محبوب کے اشارۂ ابرو کو سمجھنے کی صلاحیت کے ساتھ اس کو پورا کرنے کی سعی کرنا۔

۵۔ محبوب کی تعریف و ثنا، اس کا ذکر۔ اس کے صرف نظر کو وقتی اور عارضی جاننا، محوب کے صرف نظر کو برداشت کرتے ہوئے اس کی توجہ حاصل کرنی کی مسلسل پر خلوص کوشش کرتے

رہنا۔

۶۔یسوع مسیح کے اس ارشاد کو حرز جاں بنانا کہ عشق انسان کو ایک نئی زندگی دیتا ہے اور نئے جہانوں سے متعارف کرواتا ہے۔ یہ آپ کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتا ہے اور آپ کی ذات کو خداوند کے ہاں محفوظ و مامون بناتا ہے۔ (۱۰)

(Romans 8:31-32, 35, 37-39, The Message)۔

۷۔خدا وند سے عشق کے راستے میں مدد کی دعا کرنا۔

"God, right now I'm experiencing deep hurt and rejection. I realize that I have spent much of my life trying to find love and value in the wrong places. I don't want to go on living like this. Forgive me for trying to find my own way. Forgive me for neglecting You. I thank you that even before I was aware of it, You were demonstrating Your love for me in Jesus' death. I thank You that His death offers me a way to know You and to experience Your love. God, fill my heart with a sense of your love. Help me to realize that you are the source of my worth and value. I trust you with my life and my broken heart. Heal it. Help me to turn to you, and worship you. Amen."

==========

دیگر مذاہب (سامی و غیر سامی) میں محبت کا تصور:

عیسائیت یا یہودیت کے علاوہ دیگر مذاہب (اصنام پرست) میں سے اکثر نے محبت کو پوجا کا ایک ذریعہ جانا اور دیگر نے محبت کو اپنے خداوند کا مظہر سمجھا اور کچھ نے محبت اور خدا کو ایک دوسرے کا متبادل یا مترادف جان کر محبت کو خدا مان لیا اور خدا کو محبت۔ محبت کے حوالے سے دیوی دیوتاؤں کا سرسری تذکرہ حسب ذیل ہے:

- Áine: یہ محبت کی دیوی ہے جو آئرش اسطور میں جنون (عشق) اور بامقصد محبت

کی علامت ہے۔

Eros or Cupid : یہ محبت کا دیوتا ہے جس کی علامت ہر جگہ بنا ہوا دل اور اس میں پیوست تیر ہے: یہ رومن اساطیر میں محبت کی علامت ہے۔

Antheia: یہ یونانی اور آسٹرین اسطور میں محبت کی دیوی ہے جو باغات، پھولوں اور خوشبوؤں میں بستی ہے اور پھول اور خوشبو کی علامت ہے۔

Aonghus or Aengus یہ آئرش اساطیر میں محبت، جوانی اور خوبصورتی کا علامتی دیوتا ہے:

- Aphrodite: یہ دیوتا یونانی اساطیر میں محبت اور جنون 'عشق کی علامت ہے ۔
- Astarte : یہ قدیم کنعانی اساطیر میں محبت کی علامت دیوتا ہے: اسے ''تشب'' یا بآل حداد (قدیم سامانی یا آرامی ادب، مذہب میں نام) بھی کہا جاتا ہے۔
- Eros۔ یونانی اساطیر میں انتہائے محبت (عشق) کی علامت ہ دیوتا ہے۔
- Freyja۔ جرمن اساطیر میں محبت کی دیوی۔ جو طاقت اور محبت کی علامت ہے
- Hathor ؛ قدیم مصری مذہب میں محبت کی دیوی۔
- Inanna۔۔ قدیم بابل کے اساطیر میں پانی کا دیوتا جو محبت، جنگ، قوت کی علامت تھا۔ اسے اکارڈئین کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔
- Ishtar ۔ قدیم بابل کی ساطیر میں محبت اور جنگ کی دیوی۔
- Kama۔۔۔ قدیم ہندو اسطوری عہد میں جنسی محبت کی علامت دیوتا
- Mihr مہر محبت، عشق کا جذبہ جو قدیم پارسی اساطیر میں موجود ہے۔
- Rati رتّی ہندوازم میں عشق کی دیوی
- Venus۔ قدیم رومن مذہب یا اساطیر میں خوبصورتی کی علامت (اسے اردو یا فارسی میں ''زہرہ'' کا نام بھی دیا جاتا ہے)۔
- Xochipilli۔۔ قدیم میکسیکن تہذیب میں محبت کا دیوتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ (Matthew 22:36ff; Deuteronomy 6:5).

۲۔ (Matthew 22:39; Leviticus 19:18)

۳۔ (Matthew 22:40)

۴۔ (یسعیاہ ۴۳۔۷ Isaiah43.7)

۵۔ (سام ۱۱:۷، ۳۳: ۵)

۶۔ Psalm 143:11

۷۔ (Psalm 147:10, 11; 103:13).

۸۔ Malachi 2:11) and Zion,
the "city of God" Psalm 87:2, 3).

۹۔ (Romans 8:31-32, 35, 37-39
The Message) ۹۔

باب دوم

وجدان عشق

۱۔عشق اور تصوف

۲۔عشق مجاز سے حقیقت تک (صنم تا حرم)

۳۔عشق و ہوس (ایک تقابل)

عشق اور تصوف

تصوف اسلام ایک اجمالی جائزہ:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ آلہ وسلم نے نبوت کے ابتدائی تیرہ سال مکہ مکرمہ میں اسلام کی دعوت اور مسلمان ہو جانے والے افراد کی تربیت میں صرف کئے اس عرصے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سختیوں کے پہاڑ توڑے گئے اور ہر طرح کی اذیت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گذرنا پڑا۔ اس کے باوجود ان تیرہ سالوں میں لوگوں کو دین کی دعوت دینا، دعوت قبول کرنے والوں کے دلوں سے کفر و شرک کا زنگ اتارنا، انہیں اسلام کے سانچے میں ڈھالنا، ان کے دلوں کو مانجھنا اور ان کے اندر عشق کی شمع جلانا، یہ سارے کام صرف ایک ہستی یعنی خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستی ادا کر رہی تھی۔ اسلام میں یہ تیرہ سال بہت قیمتی تھے اور اس کے نتیجے میں بہت ہی قیمتی جماعت بن گئی تھی۔ جن کا اوڑھنا بچھونا، جن کی کل متاع، روز و شب، خوشی غم، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شدید محبت، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارۂ ابرو کو سمجھنا اور بغیر کسی تامل کے اس پر عمل پیرا ہونے کیلئے مستعد ہو جانا، اپنی ہر تکلیف، ہر خوشی کو اپنے محبوب کی تکلیف یا خوشی کے سامنے ہیچ سمجھنا، اپنا سب کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہر لمحہ قربان کرنے کیلئے ہمہ وقت تیار رہنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نظر اٹھا کر دیکھنے کو سوئے ادب شمار کرنا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے وقت ''فداک ابی و امی یا رسول اللّٰہ'' کہنا جیسے عمدہ خصائل بن گئے۔

ہجرت مدینہ کے بعد اگلے دس برس غزوات، معاہدات، امور مملکت، معاملات، معیشت اور زندگی کے دوسرے معاملات کی تربیت میں صرف ہوئے۔ پہلے تیرہ برس میں

بننے والی عشاق کی جماعت نے یہاں دعوت وتبلیغ ،تدریس،تعلیم ،تربیت،مشاورت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر طرح دل وجان سے اعانت کی ،تیئس برسوں کی محنت شاقہ کے بعد ایک ایسی جماعت معرض وجود میں آئی جن کی کل تعداد شاید سوا لاکھ سے اوپر تھی ان میں کچھ پکے لوگ تھے، کچھ ابھی کچے تھے اور کچھ ''طلقاء'' تھے۔ان میں سے آپ کے اصحابؓ پر رنگ مصطفویؐ غالب تھا ان حضرات کے دلوں میں عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور عشق الٰہی کی شمع جل رہی تھی ۔کچھ دلوں میں پوری توانائی کے ساتھ اور آخری درجے کے کچھ دلوں میں ہلکی سی لو کے ساتھ جل رہی تھی یا شاید ٹمٹمارہی تھی۔ دنیاوی معاملات اور دینوی معاملات ،عبادات سب کچھ دین تھا (بیت اللہ سے بیت الخلاء تک تمام افعال) ہر معاملہ حتیٰ کہ دوستی اور رشتہ مانگنے تک سب کاموں میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی یا ایما کو اولیت حاصل تھی۔

ایک دن ایک صحابیؓ (حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ ابن العاص) نے سرخ رنگ کی چادر اوڑھ لی نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا اور منہ مبارک دوسری طرف پھیر لیا انہوں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی کو محسوس کر لیا فوراً گھر گئے اور چادر کو جلا ڈالا اور پھر واپس آ گئے ۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا چادر کا کیا کیا؟ انہوں نے جواب دیا جلادی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جلایا کیوں ؟ گھر کی کسی عورت کو دے دیا ہوتا کیونکہ یہ رنگ تو صرف مردوں کیلئے ناپسندیدہ ہے عورتوں کیلئے تو نہیں صحابیؓ جواب دیتے ہیں یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری غیرت ایمانی اس بات کو گوارا نہیں کرتی تھی کہ جس چیز کو آپؐ ناپسند فرمائیں وہ چیز میرے گھر میں رہے۔ (۱)

ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک اور صحابیؓ کے گھر کے پاس سے گذرے اس نے گھر پر قبہ بنایا ہوا تھا حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف یہ پوچھا کہ یہ گھر کس کا ہے؟ ہاں اس وقت چہرے پر ایک غبار آیا اور گذر گیا تھا۔ان صحابی کو جب سارے واقعے کا پتہ چلا تو انہوں نے اپنے گھر کی چھت اکھاڑ پھینکنے میں ذرا دیر نہیں کی۔ ۲، ۲۔(ایضاً)

ایک بار حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راستے میں تشریف لے جا رہے تھے ایک صحابیؓ

(حضرت خزیمہؓ) خاموشی سے پیچھے پیچھے جا رہے تھے راستے میں ایک یہودی نے حضورؐ سے ایک گھوڑے کی خریداری پر تکرار شروع کی کہ میں نے آپ سے گھوڑے کا سودا نہیں کیا تھا اسی لئے میں نے وہ گھوڑا کسی اور کو بیچ دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بتایا کہ تمہارے ساتھ میرا سودا طے ہو گیا تھا اور میں گھر گھوڑے کی قیمت لینے کے لیے گیا تھا تو اس یہودی نے گواہ طلب کیا فوراً پیچھے سے آواز آئی ''میں گواہی دیتا ہوں کہ حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تمہارا سودا طے ہو گیا تھا'' یہودی شرمندہ ہو کر چلا گیا حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیچھے مڑ کر اس صحابی (حضرت ابوخزیمہ انصاریؓ) سے پوچھا تم نے گواہی کیسے دی حالانکہ جب یہ معاملہ ہوا تھا تو اس وقت تو کوئی دوسرا شخص موجود نہیں تھا۔ وہ صحابیؓ جواب دیتے ہیں ''یارسول اللہ میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہو جائیں یہ گواہی تو کوئی بڑی بات نہیں۔ آپؐ نے بتایا کہ ہمارا خالق مالک اللہ ہے ہم نے کہا آپؐ نے سچ کہا اور ہم ایمان لے آئے۔ حالانکہ ہم نے اللہ کو نہیں دیکھا، آپؐ نے کہا کہ قبر حشر ہے، جنت دوزخ ہیں ان میں سے کوئی چیز بھی ہم نے نہیں دیکھی پھر بھی آپؐ کی بات پر ہم نے گواہی دی کہ یہ سب کچھ ہے آپؐ سچوں کے سچے ہیں آپ کبھی جھوٹ بول ہی نہیں سکتے پھر یہاں آپؐ کیسے جھوٹ بول سکتے ہیں وہ یہودی جھوٹا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہوئے اور فرمایا کہ آج کے بعد تمہاری ایک گواہی دو شہادتوں کے برابر تصور ہوگی۔ سو حضرت ابوخزیمہؓ واحد صحابی ہیں جو ''ذو شہادتین'' ہیں، یعنی ان کی گواہی دو گواہوں کے برابر ہے۔ مسند احمد (امام احمد بن حنبلؒ حدیث نمبر ۲۱۴، ۲۱۵) (۳)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر ایک پیرو اسی درجے کے ایمان والا تھا۔ تو ایسی جماعت تیار ہوئی تھی جن کے دل مانجے ہوئے تھے، صاف تھے ان میں اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے سوا اور کچھ تھا ہی نہیں۔ وہ دنیاوی معاملات کو بھی دل کی آنکھ سے دیکھتے تھے۔ انہیں اپنی آنکھوں کے دیکھے، کانوں کے سنے پر اتنا یقین نہیں تھا جتنا فرمودہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر تھا، ان کیلئے یہی شریعت تھی یہی طریقت تھی یہی حقیقت تھی اور یہی

معرفت تھی ان چاروں (شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت) کے درمیان کوئی فرق یا حد فاصل نہیں تھی، ان میں سے کوئی مغلوب الحال نہیں وہ سب فنافی الرسول اور فنافی اللہ اور فنافی الدین تھے، ان کے سب اعمال خواہ وہ ظاہری ہوں یا باطنی حکم خداوندی اور سنت رسولؐ کے عین مطابق تھے۔

خلفائے راشدین کے زمانے میں جب دین اسلام کی اشاعت بہت تھوڑے عرصے میں بہت زیادہ علاقے تک پھیل گئی اور ہر سمت جہاد شروع ہو گیا تو تربیت کا نظام تھوڑا ڈھیلا پڑ گیا۔ اس عرصے میں اسلام کے عقائد کی اشاعت دعوت کے ذریعے کم اور مسلمان مجاہدین کے حسن سلوک اور احسن معاملات کی وجہ سے زیادہ ہوئی، سو تربیت کا جتنا حق تھا وہ اتنی نہیں ہو سکی مسلمانوں کے دلوں میں دین کا رنگ عشق کے رنگ میں نہیں گندھ سکا، ایسے عالم میں کچھ حضرات نے جو خود نبیؐ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ تھے اور ایمان کی حقیقت سے آگاہ بھی تھے انہوں نے اپنے اردگرد اسی درجے کے قریب تر نبی پاکؐ کی نہج پر تربیت کا نظام شروع کیا۔ وہ اپنے زیر تربیت افراد کو دین اسلام، قرآن، فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آثار و اقوال صحابہؓ کی تعلیم بھی دیتے تھے اور ایمان پر محنت بھی کرواتے تھے۔ یہ محنت انفرادی بھی تھی اور اجتماعی بھی، یہ دلوں کو مانجھنے کا کام بھی کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ یہ محنت تصوف کہلانے لگی، ایک خیال یہ ہے کہ آپؐ کی رحلت کے بعد لگ بھگ ایک صدی تک تصوف الگ سے کوئی چیز نہیں تھی بلکہ اسلام کا ہر پیروا اپنے اندر جامعیت رکھتا تھا وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ جب دنیا داری عام ہونا شروع ہوئی، ملوکیت، افراتفری، اور فرقہ واریت کا بازار گرم ہوا تو درد دل رکھنے والے وہ حضرات جو ہمہ وقت اللہ کی یاد میں محو رہنا چاہتے تھے تو وہ دنیا داری کو ترک کر کے تنہائی کی جانب راغب ہونا شروع ہوئے، پہلا شخص جس نے دنیا کو ترک کر کے یاد خدا سے لو لگانے کیلئے حجرہ آباد کیا وہ ابوالہاشم کوفی (م۔150ھ) تھا اس طرح اسلام میں شریعت کے بعد (پہلی مرتبہ) علیحدہ سے تصوف کی اصطلاح استعمال ہونا شروع ہوئی۔

یوں ''تصوف'' کے لفظ سے عالم اسلام ایک عرصے تک (دوسری صدی ہجری کے آخر تک) نا آشنا ہی رہا اسلام کی ابتدائی صدیوں میں کسی کیلئے اس سے زیادہ شرف کی بات کوئی نہ تھی کہ وہ مومن ہے، متقی ہے زہد وورع میں کتنا آگے ہے۔لفظ ''ولی'' کی تخصیص بھی بعد کی بات ہے قرآن کی تصریح میں ہر مومن ولی اللہ ہے اور اللہ ہر مومن کا ولی ہے۔تصوف کی وجہ تسمیہ کے متعلق متضاد آراء متعارف ہوئیں، اسی لئے آج تک اس کا کوئی فیصلہ نہ ہوسکا کہ یہ لفظ آیا کہاں سے؟ کوئی اسے اصحاب صفہ سے جوڑنے لگا، کوئی اسے دل کی صفائی اور دنیاوی لذات سے کنارہ کشی کی وجہ سے صفا سے اس کا تعلق قائم کرنے لگا، کہیں ذرا دور کے ڈانڈے ملائے گئے، کہا گیا کہ یہ لفظ یونانی زبان کے لفظ ''سوفی'' یا ''صوفی'' سے نکلا ہے جس کے معنی عرفان یا پہچان کے ہیں۔

صاحب ارشاد بزرگان دین نے لفظ تصوف کی بہت ساری جہتیں دریافت فرمائیں، حضرت سید علی ہجویریؒ تصوف کی بنیاد صفا قرار دیتے ہیں اور اس کیلئے متعدد دلائل دیتے ہیں وہ اپنی تصنیف ''کشف المحجوب'' باب سوئم زیرعنوان ''تصوف کی تشریح'' میں ارشاد نبویؐ کے حوالے سے ارشاد فرماتے ہیں: کہ ''رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا 'مَنْ سَمِعَ صَوتَ اَھلِ التصوُّفُ علیٰ دعاءِ ھم فلا یؤمن کُتِبَ عند اللّٰہ من الغافلین' جس شخص نے اہل صفا کی آواز پکار کے وقت سنی اور اس پر یقین نہ کیا وہ اللہ کے نزدیک غافلین میں لکھا گیا، لوگوں نے لفظ تصوف کی تحقیق میں بہت کلام کیا ہے ایک گروہ صوفی کو اس بنا پر صوفی کہتا ہے کہ وہ لوگ 'صوف' کے کپڑے پہنتے تھے اس لئے صوفی کے نام سے مشہور ہوئے ایک گروہ نے کہا کہ ''صوفی'' ''صفا'' سے مشتق ہے الغرض مختلف گروہوں نے تصوف کے معنی ومطلب کے متعلق بہت سے نکتے بیان کئے ہیں پس از روئے لغت دیکھا جائے تو لفظ ''صفا'' ہی ٹھیک بیٹھتا ہے اور یہی سب معنوں میں سب سے عمدہ ہے اس کی ضد کدورت' اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ذھب صفو َالدنیا و بقی کدرُھا' دنیا کا پاکیزہ اور صاف حصہ تو جاتا رہا اور باقی رہ گیا ناپاک عنصر۔عمدہ چیزوں کو بھی

''صفو'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ **من صفاہ الحب فھو صافٍ و من صفاہ الحبیب فھو الصوفی** '' وہ شخص جو محبت کے واسطے سے مصفا ہوتا ہے وہ صافی ہے اور جو شخص دوست کی محبت میں محو اور غیر دوست سے آزاد اور بے تعلق ہو وہ صوفی ہے۔''(۴)

حضرت علی ہجویریؒ کی تحقیق پر بات تمام نہیں ہوئی اس تحقیق نے صدیوں کا سفر طے کیا ہے یہ اس وقت ہمارا موضوع نہیں لہٰذا یہیں تک اکتفا کیا جا رہا ہے تاہم اب سارے مسلم اور غیر مسلم محققین اس بات پر صاد کر چکے ہیں کہ تصوف لفظ ''صوف'' ہی سے مشتق ہے جس کے معنی اون سے بنی ہوئی کملی یا گدڑی یا اون کا بنا ہوا لبادہ، ایک کھردری اون سے بُنی ہوئی کملی وغیرہ'' لفظوں کے تعین کے باوصف یہ محنت یعنی دلوں میں عشق الٰہی اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی جوت جگانے کی محنت و مشق ہے اور یہ سلسلہ یا کام جاری رہا اور اس محنت کے میدان دل ہی رہے۔ اور دلوں میں ایمان یا عشق کی شمعیں روشن کرنا ان کا کام رہا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد ہر ایک محفل ایک سلسلے میں ڈھل گئی اور پھر یہ سلسلے درسلسلے بنتے چلے گئے۔ اور خانقاہی نظام کی صورت میں سامنے آیا۔ تیسری صدی ہجری میں تصوف کا یہ سلسلہ درجوں میں تقسیم ہوا، ایک عالم تشریع اور ایک عالم تکوین کہلایا جانے لگا اس عالم تکوین میں رتبوں کا تخصص ہوا۔ یہ عہدے یا رتبے اس طرح تھے کہ سب سے بلند رتبے پر غوث اعظم، ان کے تحت غوث، قطب الاقطاب، قطب، ابدال اور ولی کے درجے مقرر ہو گئے۔ ایک ولی محنت اور مجاہدات کے ساتھ عشق کے عالم میں ترقی کرتے کرتے اوپر کے درجوں تک پہنچ سکتا تھا۔ پہلے پہل تو تمام اولیاء اپنے وقت کے مجتہد، محدث، امام، فقیہہ، اور عالم ہوا کرتے تھے (حضرت ابو مسلم بصریؒ ایک مشہور محدث ہیں وہ جب بغداد پہنچے تو ایک بڑے میدان میں حدیث کا درس شروع ہوا سات آدمی (بطور مکبر) کھڑے ہو کر (درس) لکھواتے تھے جس طرح عید کی تکبیریں کہی جاتی ہیں سبق کے بعد دواتیں شمار کی گئیں تو چالیس ہزار سے زیادہ تھیں۔۵

ایک اور روایت کے مطابق حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ درس

میں ان کے درس کو لکھنے والوں کی تعداد کا اندازہ کرنے کے لئے جب درس کے اختتام پر دواتیں شمار کی گئیں۔تو ان کی تعداد ساڑھے چار ہزار تھی) لیکن پھر آہستہ آہستہ تربیت اور تعلیم کی آپس میں دوری ہوتی چلی گئی۔ مدرسے الگ اور خانقاہیں الگ ہونے لگیں۔شریعت کی تعلیم جیسے فقہ، حدیث وغیرہ کی تعلیم الگ ہوئی اور تربیتی نظام خانقاہوں میں چلنے لگا دونوں طبقوں کے کچھ ناعاقبت اندیشوں کی بدولت یہ دوری حریفانہ کشمکش میں تبدیل ہوتی چلی گئی ۔یہ بھی ایک الگ موضوع ہے اس پر کسی اور جگہ گفتگو کی جائے گی۔

ہاں تصوف کا میدان ایک تربیتی میدان ہے جس میں شدید محنت سے فرد کے دل کو عشق کی سان پر چڑھا کر مانجھا جاتا ہے تاکہ اس پر سے دنیاوی لذات کا زنگ اتر جائے اور وہ اصل ایمان یعنی عشق سے آشنا ہو سکے۔عالم اسلام کے صوفیائے کرام کی ایک بڑی تعداد نے انفرادی اور اجتماعی محنت کے ساتھ ساتھ اپنے دروس، اپنی تصنیفات اور نگارشات وارشادات کے ذریعے بھی اس محنت کو عام کرنے کی کوشش کی۔ان میں سے ایک کتاب (بے نام۔کیونکہ یہ ایک مخطوطہ تھی) جو حسینؒ ابن منصور الحلاج کے ہاتھ لگی جو ان کی شہادت کا سبب بھی بنی۔ اس کے علاوہ حضرت سید علی ہجویری معروف بہ داتا گنج بخشؒ کی ''کشف المحجوب''، حضرت غوث اعظمؒ کی غنیۃ الطالبین، حضرت خواجہ فرید الدین عطارؒ کی کتاب ''تذکرۃ الاولیاء''، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی ''ملفوظات''، ؒ مثنوی مولانا رومؒ، ابن عربیؒ کی 'رسالہ مکیہ' شیخ الاشراق حضرت خواجہ شہاب الدین سہروردیؒ کی ''عوارف المعارف اور حکمت الاشراق، سید الطائفہ حضرت جنیدؒ بغدادی کی ''تذکیر السلوک'' دوادین سلطان باہوؒ، شاہ عبدالعزیزؒ کی ''رسالہ عشقیہ''، مکتوبات امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نوراللہ مرقدہ کی متعدد کتب وغیرہ۔

اولیائے کرام کی درگاہیں اور خانقاہیں دراصل عشق کی نرسریاں رہیں، اور تصوف کے مروجہ سلسلے عشق کے پودوں یا بیج کی تقسیم وترسیل کے ذمہ دار بنے، یہ درست بات ہے کہ نتیجے کا انحصار اس پر رہا کہ زمین کتنی زرخیز ہے یا مالی کتنا جانکار اور محنتی ہے اور اسے اپنے پودوں یا

کیاریوں سے کتنا لگاؤ ہے۔اس کے دل میں خود عشق کی شمع کی لو کیسی ہے؟ اس سوال کی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے کہ اس مالی یا اس کے اردگرد کی زمیں اس نئے نہال کیلئے سازگار ہے بھی یا نہیں؟ اس کا اندازہ مالی اپنی چشم باطن سے کر لیتا ہے۔ یہاں عشق ہی نصاب ہے، عشق ہی منصب، اور عشق ہی منصوب، اس کے بعد دوسری کلاس کا نصاب ہے ''اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے'' تیسری کلاس کا نصاب ''مشاہدہ'' ہے۔اور چوتھی کلاس کا نصاب دوسری اور تیسری کلاس کے نصاب کا ادغام وانضمام، اور اس انضمام کے دوران پیدا ہونے والی حیرانی کو دور کرنا یعنی اس سوال کا جواب کہ:

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہو کس شمار میں

(غالب)

عشق کا لفظ سب سے پہلے صوفیائے کرام ہی کی لغت میں شامل ہوا، انہی حضرات نے سب سے پہلے عشق کی تشریح کی۔اس کی شدت بیان کی، اس کی منازل یا مدارج طے کئے۔ اس کے راستوں کا تعین کیا۔عشق کی منزل، عشق کا ہدف یا مطمع نظر یا محبوب، حسن کو ٹھہرایا گیا، حسن کے مظاہر بیان ہوئے، مظاہر میں حسن کی جلوہ آرائیوں کا تذکرہ ہوا، دو باہم متوازی نظریات نے جنم لیا یعنی ''وحدۃ الوجود'' اور ''وحدۃ الشہود'' جو ایک ہی میزان کے دو پلڑے تھے صدیوں کے اس سفر میں کبھی ایک پلڑا بھاری پڑا کبھی دوسرا۔لیکن دونوں کا مقصد ایک جیسا ہی رہا۔صوفیائے کرام کے علاوہ عشق سے دیگر متصوف دانشوروں کا تعارف تو بہت بعد میں ہوا۔منصورؒ کے ''انا الحق'' کہنے تک تو باہر کے کسی دانشور کو اس کیفیت سے آگاہی بھی نہیں تھی کہ سارا ماجرا کیا ہے؟ آدم کی قسمت میں وصل باللہ ہے یا مہجوری، وہ اصل سے جدا ہو کر واپس اصل میں جذب ہو جانے کی تگ ودو کرتا ہے یا اپنی علیحدہ شناخت قائم رکھنے پر زور دیتا ہے؟ وہ طلب وجستجو کا پیکر بننا چاہتا ہے یا خلاقیت کے لبادے میں پناہ حاصل کرنا چاہتا ہے، اس قطرے کی اصل حقیقت کیا ہے جو کسی پہاڑ کی چوٹی پر برستا ہے اور برستے ہی وہ نشیب میں

لڑھکنا چاہتا ہے، وہ زمیں میں جذب ہوکر کہاں جاتا ہے؟ یہ ندی، نالے، دریا آخر سمندر ہی کی جانب کیوں رخ کرتے ہیں؟ قطرہ برس کر دوسرے ناموں میں کیوں گم ہوجاتا ہے؟ اور جب وہ سمندر میں جذب ہوجاتا ہے تو کیا اس کو اپنی جنم بھومی میں آنے پر سکون ملتا ہے؟ یا اس کی بے تابی یہاں بھی اس کو چین نہیں لینے دیتی اور پھر وہ بھاپ بن ہواؤں کے دوش پر اڑ کر قطرے کی حیثیت میں بار بار برسنے کا خواہاں ہے؟ ،اس سے پہلے اس کی بے تابی کیا سمندر کے وصل کی تھی سوا گر قطرہ برسنے والی جگہ ہی پر سمندر ہونے کا اعلان کرے تو کیا وہ مجرم ہے؟ منصور کی زبان سے جب قطرے نے سمندر ہونے کا اعلان کیا۔تو جو لوگ سمندر اور اس کے کاموں سے نا آشنا تھے ان کے نزدیک قطرے کا سمندر ہونے کا اعلان گردن زدنی تھا سو منصور شہید ہوگیا۔ادھر ہندوستان میں اسی طرح کی صورت حال میں سرمدؒ شہید ہوئے۔اس کے بعد دانشوروں کی توجہ اس جانب مبذول ہوئی کہ مخلوق جو خالق کے عشق میں مبتلا ہوتی ہے کیا اس کی مثال بارش کے اسی قطرے جیسی ہے جو سطح سمندر سے بھاپ بن کر اٹھا اور ہوا کے دوش پر سوار ہوکر پہاڑوں سے ٹکرایا اور بارش کی صورت میں اپنی اصل سے بہت دور بارش کی صورت میں برسا اور برستے ہی اس نے بیتابی سے واپس سمندر کی جانب لپکنا شروع کردیا۔ اور بالآخر سمندر میں شامل ہوکر سمندر ہوگیا۔فرق یہ ہے کہ سمندر ایک مجبور مخلوق ہے وہ خود اپنی جگہ سے سرک نہیں سکتا۔لیکن خالق ازل تو نعوذ باللہ مجبور نہیں وہ تو کسی زمان یا مکان کا پابند نہیں یہ سارے تو اس کی مخلوق ہیں۔اس کیلئے تو کوئی ماضی و مستقبل نہیں، اس کا وقت تو ایک آن بسیط ہے۔وہ مخلوق کے دل میں عشق کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔اور اس کے عشق کی بے تابی کا نظارہ کرتا ہے اس نظارے سے لطف اندوز ہوتا ہے۔عاشق کے عشق کے اس سفر کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے پھر خود ہی ان رکاوٹوں کو دور کردیتا ہے۔جہاں راستے ہوتے ہیں وہاں انہیں مسدود کردیتا ہے اور جہاں راستوں کا نام ونشان نہیں ہوتا وہاں سے راستے پیدا کرکے دیتا ہے۔ادھر عشق سمجھتا ہے کہ راستے اس نے خود بنائے ہیں اور بڑے فخر سے اعلان کرتا ہے کہ جہاں راستے نہیں ہوتے وہاں اصل میں راستے ہوتے ہیں اور میں ان راستوں

سے بارہا گذرا ہوں:

عقل گوید شش حد است و ہیچ پیروں راہ نیست
عشق گوید ہست راہ و رفتہ ام من بارہا

(:عقل نے کہا کہ چھ حدود مقرر ہیں چھ سمتیں ہیں اوران سے باہر نہ کوئی حد ہے نہ منزل ہے نہ راستہ، عشق کہنے لگا (ایسا نہیں بلکہ) راستہ ہے، اور میں اس راستے سے بارہا گذرا ہوں۔)

عقل بظاہر انسانی حسیات کے نظام سے متعلق ہے لیکن دینی عقائد میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا تعلق انسان کے حواس سے نہیں ہے بلکہ اس کا احساس انسان کے وجدان کو ہوتا ہے۔ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کہتے ہیں:

''انسان کے ظاہری حواس کے علاوہ کچھ باطنی حواس بھی ہیں جو ہستی کے بعض ایسے پہلوؤں کو منکشف کرتے ہیں جن تک عام عقل کی رسائی نہیں، کشف حقیقت کا سب سے بڑا ذریعہ عشق ہے جو محض تاثر یا جذبہ نہیں بلکہ مصدر بصیرت و معرفت ہے زندگی کا مقصد اسی عشق کو ترقی دینا ہے جس سے ظاہر و باطن کی خامیاں رفع ہو جاتی ہیں اور اس کی بدولت جو عرفان نفس پیدا ہوتا ہے وہ خود شناسی اور جہاں شناسی کے علاوہ خدا شناسی کی راہیں بھی کشادہ کر دیتا ہے''(۶)

چونکہ انسان کا وجود دو حصوں کا مجموعہ ہے۔جسم اور روح۔جسم سے اعمال سرزد ہوتے ہیں اگر یہ اعمال اعمالِ صالحہ نہیں تو روح کا تنزل ہوتا ہے اور انسان روحانی اعتبار سے پستی کی جانب گرنا شروع ہو جاتا ہے۔البتہ اگر اعمال صالح ہیں تو روح ترقی کرتی ہے اور زیادہ توانا ہو جاتی ہے روح کی توانائی عشق کی قوت میں اضافہ کرتی ہے۔اور عشق سے صوفیاء کے ہاں مراد اللہ سے محبت ہے، اس کی ذات سے، اس کی صفات سے لگاؤ ہے۔روح قطرے کی طرح اپنی اصل کی جانب میلان رکھتی ہے، جسم اور جسم کے تقاضے بظاہر اس سفر میں رکاوٹ نظر آتے ہیں لہٰذا جسم کو روح سے ہم آہنگ کرنے کیلئے مجاہدات کئے جاتے ہیں۔اور یہ سب کچھ خدائے

مطلق تک رسائی کیلئے کیا جاتا ہے۔ اور اسی کو عشق کہا جاتا ہے۔ ان مجاہدات و ریاضت کے اثرات مختلف صوفیاء پر مختلف ہوتے ہیں۔ ان اثرات میں زود یا دیر، کمی یا بیشی کا سبب اپنا اپنا ظرف ہے اور اپنے اپنے طرز کے مجاہدات ہیں۔ ان میں سے بعض صوفیاء خدا مست اور مجذوب ہو جاتے ہیں، بعض خلوت پسند اور ہر قسم کے علائق اور پابندیوں سے گریز کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، بعض اپنی روحانیت اور معرفت سے دوسروں پر محنت کر کے ان میں یہی صفات پیدا کرنے کا کام شروع کرتے ہیں اور اسے اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ بعض پر ہمہ وقت گریہ طاری رہتا ہے، بعض کے چہروں پر ایک خاص قسم کا سرور نظر آتا ہے۔ یہ سرور ان کی زندگیوں کو بھی مسرت آمیز بنا دیتا ہے۔ لیکن ان سب کیفیتوں کے پس منظر میں جذبہ، محنت اور مقصد ایک ہی ہے وہ ہے اپنا تزکیہ، تاکہ وہ عشق کی منزل کو حاصل کر سکیں، یہ تزکیہ صفائی ءِ قلب کا مترادف ہے اور یہی رہِ عشق کے سفر کا زادراہ ہے۔ یہی بدرقہ بھی ہے رہنما بھی ہے۔ قد افلح من زکھا کا مطلب شاید یہی ہو۔

دین اسلام میں تصوف کا مطلب قلب کی صفائی لیا جاتا ہے۔ اس (دل) میں سوائے ایمان یا عشق کے باقی کچھ نہیں چھوڑا جاتا۔ اسی لئے بزرگ کہتے ہیں کہ اللہ کہتا ہے بندہ جو کرتا ہے کرے لیکن اپنے دل کو میرے لیے خالی چھوڑ دے اس لیے کہ میں پاک دلوں ہی میں بستا ہوں۔ اس کیلئے brain washing کی طرح کی نئی اصطلاح استعمال ہونی چاہیئے Heart Washing ۔یعنی تطہیر قلب

ایک عارف کامل نے واصلین اہل محبت کی تعریف اس طرح کی ہے'' اور محبت ہر لمحہ ان سے پیوستہ ہو کر تازہ ہو گئی ہے بلکہ حقائق سکون کے ساتھ ان محبت کرنے والوں کو اس نے اپنی پناہ میں لے لیا ہے یہاں تک ہوا کہ ان کے دل فریاد کرنے لگے اور ارواح شوق میں مشغول ہو گئیں''

یہ طے شدہ امر ہے کہ اللہ کے خاص بندوں یعنی صوفیائے کرام کے نزدیک محبت، عشق

کا مقصد، منزل اور ساری مشقت صرف اللہ کا قرب حاصل کرنے کی مشق ہے۔اسی محبت کو حاصل کرنے کیلئے یا عشق کی منزل کو حاصل کرنے کیلئے جو صراط مستقیم ہے وہ صرف اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت، آپؐ کا کمال اتباع ہے۔اس راستے میں محبّ یا عاشق کو بے شمار دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس کیلئے صوفیائے کرام نے محبت کی منازل یا مدارج مقرر کئے، اور ہر درجے یا سنگ میل کیلئے مختلف آداب و اعمال وضع کئے، ایک نصاب تیار کیا جو ان کے مقلدین کو اطاعت رسولؐ اور اطاعت الٰہی کے حوالے سے رہنمائی کرتا ہے۔ان اساتذہ نے اپنے شاگردوں کو چھوڑ نہیں دیا بلکہ قدم قدم پر ان کی رہنمائی اور نگرانی بھی کرتے رہے۔ان اللہ والوں نے اپنے بعد آنے والی نسلوں کو بھی خانقاہی سلسلوں اور اپنے ملفوظات کے ذریعے زادراہ فراہم کیا ہے۔ہم انہی بزرگوں میں سے چند کے اقوال کی روشنی میں محبت یا عشق کی تفہیم کی کوشش کرتے ہیں۔

شیخ الشیوخ حضرت خواجہ شہاب الدین سہروردیؒ ''عوارف المعارف'' میں ارشاد فرما ہیں ''میرے محترم شیخ ابوالنجیب سہروردیؒ نے باسناد مشائخ حضرت انسؓ ابن مالک سے مروی یہ حدیث بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین چیزیں ایسی ہیں کہ اگر وہ کسی میں بھی ہوں ایمان کی حلاوت پاتا ہے وہ یہ کہ اللہ اور اس کا رسولؐ اس کو اوروں سے زیادہ محبوب ہوں، یہ کہ وہ کسی سے محبت محض اللہ کیلئے کرتا ہو، اور یہ کہ جب اللہ نے اسے کفر سے نجات دے دی تو وہ کفر کی جانب لوٹنا ایسا ہی برا سمجھے جیسا اپنا آگ میں ڈالا جانا''۔

حضرت عرباض بن ساریہؓ سے مروی یہ ہے کہ حضور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا مانگتے تھے'' خدایا تو اپنی محبت مجھے میری جان، میری بصارت و سماعت و اہل و عیال اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ عطا فرما: اس طرح حضورؐ نے خالص محبت کو طلب فرمایا۔

خالص محبت کی تشریح میں حضرت شہاب الدین سہروردی فرماتے ہیں'' خالص محبت یہ ہے اللہ تعالیٰ سے سراپا محبت بن کر محبت کرے کہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ روحانی علم کی تمام شرائط پوری کرتے ہوئے طالب حق اپنے روحانی حال میں غرق ہوتا ہے مگر اس کی

فطرت اس علم کے خلاف امور کی متقاضی ہوتی ہے یعنی علم ان باتوں کو پسند کرتا ہے لیکن اس کی فطرت ان کو پسند نہیں کرتی اب خالص محبت یہ ہے کہ ایسی صورت میں وہ علم کا تابع ہو اور اپنی جبلت کی عصیاں شعاری کو خیال میں نہ لائے اس کی مثال یہ ہے کہ وہ اپنے ایمانی جذبے اور حکم ایمانی سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرے اور حکم طبع کے تحت اہل وعیال سے محبت کرے'' (۷)

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا (یا ایھا الذین اٰمنوا من یر تد منکم عن دینہٖ فسوف یأتی اللّٰہُ بقومٍ یحبھم و یُحبونہٗ . القرآن) ترجمہ ''اے ایمان والو! تم سے جو بھی اپنے دین حق سے پھر جائے گا، تو عنقریب اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو پیدا فرمائے گا کہ وہ سچی محبت کرتی ہوگی اور خدا اس سے محبت کرتا ہوگا''۔ نیز فرمایا (و من الناس من یتخذ من دون اللّٰہ انداداً یُحبونھم کحب اللّٰہِ و الذین اٰمنو اشدُّ حُباً للّٰہ ...(۸)

ترجمہ: ''لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے علاوہ مخلوقات میں سے اوروں کو اپنا معبود بنا لیتے ہیں۔ اور ان سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں، جتنی کہ خدا سے کرنی چاہیے، لیکن جو سچے ایماندار ہیں، وہ اللہ سے بے انتہاء محبت کرتے ہیں (ان کی تمام محبت تو خدا کے لیے وقف ہوتی ہے)''۔

برصغیر میں تشریف لانے والے پہلے صاحب تصنیف اور صاحب ارشاد ولی اللہ، قطب اعظم حضرت سید علی ہجویریؒ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''جب طالب کی محبت تمام تر اللہ اور رسول کیلئے وقف ہوتی ہے تو اللہ اپنی جانب آنے والوں کی حفاظت اور رہنمائی بھی کرتا ہے۔ جب کوئی دوسرا (وہ کوئی بھی ہو اور کسی مخلوق سے اس کا تعلق ہو) اللہ سے محبت کرنے والے کو کسی طرح کا گزند پہنچانے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ کی غیرت اس کو برداشت نہیں کرتی۔ اس کی خبر خود نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے ''آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں نے جبرائیلؑ سے سنا ہے اور جبرائیلؑ نے اللہ تعالیٰ سے سنا کہ وہ فرماتا ہے ''جس شخص نے میرے ولی کی اہانت کے اس نے میری اہانت کی، اور وہ

میرے دوست کی تذلیل سے میرے مقابلے پر اُتر آیا اور ہمیشہ میرا بندہ فرائض اور نوافل ادا کرنے سے میرا قرب حاصل کرنے میں کوشاں رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اس کو دوست رکھتا ہوں، تو میں اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے اور میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے، اور میں اس کی زبان بن جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے''۔ ۹

ایک اور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی ملاقات سے گریزاں ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات سے گریزاں ہوتا ہے، اور اس کو کبھی نگاہ التفات سے نہیں دیکھتا ہے'' نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو دوست رکھتا ہے، تو جبرائیلؑ سے فرماتا ہے کہ اے جبرائیل! میں فلاں آدمی کو دوست رکھتا ہوں، تو بھی اس کو دوست رکھ، پس جبرائیلؑ بھی اس کو دوست رکھتا ہے۔ پھر جبرئیل آسمانوں میں منادی کرتا ہے اے آسمان کے رہنے والو، اللہ تعالیٰ فلاں شخص کو دوست رکھتا ہے، لہذا تمام آسمان والے بھی اسے محبوب رکھتے ہیں، پھر اس کی منادی اور مقبولیت زمین کے رہنے والوں میں ہوتی ہے، اور اسے اہل زمین نہایت محبوب رکھتے ہیں۔''

اس حوالے سے حضرت سید علی ہجویری معروف بہ حضرت داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں:

''یاد رکھو کہ فطری طور پر اللہ تعالیٰ کی محبت بندہ کو اور بندہ کی محبت اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے، کتاب اور سنت اس مطلب پر شاہد ہیں اور امت اس پر متفق ہے کہ اللہ تعالیٰ میں ایک صفت ہے، کہ اولیاء اس کو دوست رکھتے تھے اور وہ اپنے اولیاء کو دوست رکھتا ہے، اور لغت میں محبت ''حبہ'' سے ماخوذ ہے اور وہ تخم ہوتا ہے جو صحرا کی زمیں پر گرتا ہے، پس دانہ کو ''حب'' اس لیے کہتے ہیں، کہ زندگی کی اصل اس میں ہے۔ جیسے کہ تخم کو خاک میں پھینک دیں، اور اس پر بارش ہو، اور پھر آفتاب کی حرارت اس کو پہنچے اور سردی اور گرمی کے اثرات اس پر وارد ہوں، وہ اپنے موسم میں اگتا ہے پھر پھل اور پھول نکالتا ہے اسی طرح محبت محبّ کے دل میں قرار پکڑتی ہے تو وہ حضور اور غیبت یا محنت و مصیبت اور راحت ولذت وفراق و وصال سے کمزور و متغیر نہیں ہوتی اور اس معنی میں حضرت ابوبکر شبلیؒ فرماتے ہیں، ''محبت کا نام اس لیے

محبت رکھا گیا ہے کہ وہ دلوں سے محبوب کے سوا سب کو مٹا دیتی ہے'' نیز محبت کے متعلق کہتے ہیں کہ (**لِاَنَّـهٗ غِـلُیـانُ الْقلْبِ عند الاشتیاقِ الیٰ لِقآءِ المحبوبِ**) ترجمہ: ''وہ محبوب کی ملاقات کے لیے دل کا شوق واضطراب ہے'' جیسا کہ قیام جسم سے ہوتا ہے اسی طرح حب کا قیام محبوب کے دیدار ووصل سے ہوا کرتا ہے نیز کہتے ہیں کہ ''محبت کے معانی ہیں دوستی میں صفائی واخلاص کیونکہ عرب لوگ چشم انسان کی سفیدی میں جو صفائی ہے اس کو **حبة الانسان** کہتے ہیں۔ ویسے بھی دل کے نقطۂ سیاہ کو **حبة القلب** کہتے ہیں پس ایک محبت کا مقام ہوا اور دوسرا روایت کا۔ اس معنی سے ثابت ہوتا ہے کہ محبت اور دوستی کے معاملات میں دل اور آنکھ آپس میں خاص ربط رکھتے ہیں اور اس معنی میں کوئی صاحب عشق وحال کہتا ہے ''دل میری آنکھ میں لذتِ نظر کو پاتا ہے اور آنکھ میرے دل میں لذتِ فکر کو پاتی ہے'' (۱۰)

ہندوستان میں اسلام کی شمع جلانے والے اولین بزرگ حضرت سید علی ہجویریؒ معروف بہ داتا گنج بخش تصوف کے اسرار نہاں سے پردہ اٹھاتے ہیں تو محبت الٰہی کو ذریعہ بناتے ہیں۔ ان کے نزدیک تصوف اسلامی کی غایت اولیٰ بندے کی اپنے خالق سے محبت کا حصول ہے فرماتے ہیں:

''بندہ کے لیے اللہ تعالیٰ کی محبت اس کا نیک ارادہ رحم وکرم اور بخشش ہے اور محبت بذات خود ارادت وشفقت کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ مثلاً رضا اور غضب اور رحمت اور غفران وغیرہ۔ اور محبت ایک ازلی اور قدیمی صفت ہے، جو بندہ کے دل میں ودیعت کی گئی ہے۔ الغرض اللہ تعالیٰ کی محبت بندہ پر یہ ہے کہ خدا اس کو وسیع نعمتیں عطا فرمائے۔ اس کو دنیا اور آخرت میں خوشحالی، عزت وآبرو اور ثواب عطا فرمائے۔ اور عذاب اور عقاب سے اس کو بے خوف کر دے، اس کو گناہوں سے بچائے اور بلند احوال ومقامات سے سرفراز فرمائے۔ اسے شرکیات سے محفوظ رکھے اور عنایات ازلی سے اسے بہرہ مند کرے اور جب اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کو ان معانی سے مخصوص فرماتا ہے تو اس کے اس خاص ارادے کا نام محبت رکھتے ہیں

اور یہ مذہب حارث محاسبیؒ اور حضرت جنیدؒ اور مشائخ کی ایک جماعت کا ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ محبت بمعنی احسان ہے تو حقیقت میں اس کا احسان بھی اس کے افعال سے وابستہ ہے اور یہ سب مقولے معانی کے حکم سے ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور پھر بندہ کی محبت خاص اللہ تعالیٰ کے لیے یہ ہے کہ اس کی ذات اور صفات میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے اور اس کے تمام اوامر واحکام کی اطاعت کرے اور اس کے تمام نواہی سے باز رہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت اپنے معنی میں تعظیم واحترام کا خاص تقاضا کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ بندہ کی توجہ اور محویت ذات الٰہی کے لیے خاص ہو جائے، اس کے ذکر وفکر کی عادت کرے اور غیر اللہ کے ذکر سے بیزاری ظاہر کرے اور بندہ کے لیے یہ بھی جائز نہ ہوگا اس کے نزدیک خالق کی محبت مخلوق کی محبت کے ہم جنس اور ہم پایہ ہو جائے۔ پس حق تعالےٰ کے محبّ اس کے عشق میں محو رہتے ہیں ،اور اس کی محبت کو اسی کے لیے خاص رکھتے ہوئے اس کے قرب ووصل کی راحت طلب کرنے والے ہوتے ہیں، اور جو شخص حقیقی اور پائیدار محبت سے باخبر ہو جاتا ہے۔ اس کو اپنے عقیدہ ومسلک میں کوئی شک وشبہ اور کسی قسم کی مشکل نہیں رہتی۔ پس محبت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک محبت جنس کی اپنی جنس کی طرف، اور محبّ اطمینان وقرار کی جستجو کرتا ہے، تاکہ محبوب کے اوصاف میں سے کسی صفت کے ساتھ آرام پائے، جیسے اس کا دیدار کرنا، اس سے ہم کلام ہونا اور اس کے قرب میں اس کا محرم دراز دار ہونا اور خدا کی محبت کے گرویدہ دو قسم پر ہیں جو اس کی تمام بخششوں اور رحمتوں کو دوستی کے غلبہ کی وجہ سے حجاب کے محل میں رکھیں اور نعمتوں کو بھی منعم اور اس کی رضا کے حصول کا ذریعہ سمجھیں، اور محبت کا یہ رتبہ جو دنیوی مطلوبات سے بلند تر رہ کر صرف صانع اور منعم کو چاہئے، بہت بلند رتبہ ہے اور یہ صاحب توحید خواص کو عطا کیا جاتا ہے۔'' ایک بزرگوار فرماتے ہیں۔ ''زاہدوں کے نزدیک 'محبت' 'اجتہاد' سے واضح تر شے ہے اور توبہ کرنے والوں کے نزدیک محبت آہ وزاری سے زیادہ آسان ہے، اور ترکوں کے نزدیک محبت فتراک یعنی تسمۂ شکار سے زیادہ مشہور ہے، اور عرب کے ہر قبیلہ میں محبت کا مضمون وقصہ اس کی خوشی یا غم، فتح یا شکست سے زیادہ اہم اور مشہور ہے''۔

اس بیان سے مراد یہ ہے کہ نوع انسانی کی کوئی قوم اور قبیلہ ایسا نہیں۔ جس کے دل میں محبت کی عظمت و کشش اور فرحت و انبساط نہ ہو، اور محبت کے سرور سے سرشار نہ ہو، اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ دل کی ترکیب سوز و بے قراری سے ہے، اور عقل بھی دوستی و اُنس کے تاثرات سے وجد میں رہی ہے، پس جو دل محبت سے بیگانہ ہو، وہ خراب و ویران ہے اور محض نفس ان لطائف سے جو محبت کے باعث دل پر وارد ہوتے ہیں، آگاہ نہیں ہے اور عمر بن عثمانؒ مکی محبت کے باب میں لکھتے ہیں کہ خداوند کریم نے دلوں کو جسموں سے ستر ہزار برس پہلے پیدا فرمایا۔ اور قرب و وصل کے مقام میں جگہ دی اور ان کی رُحوں کو دلوں سے ستر ہزار سال پہلے پیدا فرمایا اور انہیں انس کی درجہ میں رکھا اور ہر روز تین سو ساٹھ مرتبہ سروں پر اپنی تجلی فرمائی اور تین سو ساٹھ مرتبہ روحوں پر رحمت و کرم کی نظر فرمائی اور انہیں محبت کا کلمہ سُنایا، اور ہر روز دلوں پر محبت کے تین سو ساٹھ لطیفے ظاہر فرمائے، یہاں تک کہ ایسے صاحب دل لوگوں نے تمام جہان پر نظر کی، اور اپنے سے زیادہ کسی کو فضیلت والا نہ پایا۔ اور ان صفات کی بنیاد پر اللہ تعالےٰ نے بھی انہیں تمام مخلوقات پر برگزیدہ فرمایا اور ان کے وجود پر ملائکہ نے بھی فخر کیا۔ بعد ازاں دنیا میں انبیاء کرامؑ بھیجے شریعتیں عطا کیں، مقدس کتابیں نازل فرمائیں پھر ہر سعادت مند شخص اپنے اس ازلی مقام کی جستجو میں محو ہوا۔ اور اس جستجو کو کامیاب کرنے کے لئے اللہ تعالےٰ نے او امر و نواہی صادر فرمائے تا کہ ان کے سبب دل اپنی ازلی صفت یعنی محبت کو ضبط و محفوظ کر لیں۔

الغرض محبت کا مفہوم اور وسیع بیان محض الفاظ اور عبارات سے ادا نہیں ہو سکتا اس لیے کہ محبت ایک حالی چیز ہے، اور کبھی قالی نہیں ہو سکتی، یہ سراپا عشق و وجدان ہے اور بحث و گفتگو سے بالاتر، اگر تمام جہان چاہے کہ محبت کو تکلف اور کوشش سے ضبط کرے، اور اپنا لے تو ایسا ہرگز نہیں کر سکتا، اسی طرح جن دلوں کو محبت اپنا مسکن بنا لیں ان سے تکلف وسعی کے ساتھ محبت کو دور کرنا چاہیں تو بھی نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ کشف و حال اللہ کی غایات سے ہے نہ کہ بندہ کے کسبِ محنت سے۔ اور اگر تمام جہان محبت کو اس شخص کے لئے جو محبت کا طالب و آرزومند نہیں ضبط و مہیا کرنے کی کوشش کرے تو ہرگز مہیا نہ کر سکے گا۔ اسی طرح تمام لوگ اگر

اس شخص سے محبت کو دور رکھنا چاہیں، جو فطری و ازلی طور پر محبت کا اہل ہے، تو وہ ہرگز نہیں کر سکتے۔اس لئے کہ محبت ایک خالصتاً الٰہیاتی شے ہے اور آدمی لاہی (لہو ولعب میں مصروف رہنے والا) ہے اور کوئی بھی محض خواہش یا کوشش سے الوہی نعمت کو نہیں پا سکتا۔عشق و محبت پر مشائخ کے بہت سے اقوال ہیں۔اور صوفیا کا ایک گروہ بندوں کی طرف سے اللہ تعالیٰ کے عشق کو جائز اور روا رکھتا ہے، لیکن حق سبحانہ، کی طرف سے مخلوقات کے لئے اس کو روا نہیں رکھتا، وہ کہتے ہیں کہ عشق اپنے محبوب سے روکے جانے کی ایک صفت ہے اور بندہ حق تعالےٰ سے روکا گیا ہے، اور حق تعالیٰ بندہ سے نہیں روکا گیا ہے، پس عشق بندہ پر جائز ہوگا اور خدا پر روا نہ ہوگا، کیا تو نے نہیں دیکھا کہ جب حضرت یعقوبؑ حضرت یوسفؑ کی محبت میں محو و مستغرق ہو گئے تو اُس وقت آپ کی حالت فراق تھی، اور جب پیراہن کی خوشبو آئی تو آنکھیں روشن اور بینا ہو گئیں اور جب تک زلیخا کو حضرت یوسفؑ کے عشق نے حیران و پریشان رکھا، تب تک اُس نے ان کا واصل نہ پایا اور آنکھیں بینا نہ ہوئیں لیکن واصل ہوتے ہی اُسے دل کی تمام مرادیں مل گئیں، اور یہ طریقہ بہت ہی عجیب ہے کہ محبت میں ایک تو خواہشات کو ترک کرتا ہے، اور ایک اختیار کرتا ہے اور یہ بھی کہتے ہیں کہ عشق کی ضد نہیں ہے، اور حق تعالےٰ کی بھی ضد نہیں ہے لہذا چاہیے کہ عشق و محبت اس پر جائز ہو، اور کلام اللہ میں ایسی متعدد آیات موجود ہیں جن میں اللہ کی طرف سے اس کے مومن، متقی اور صالح بندوں کے لیے عشق و محبت کا صریح ثبوت موجود ہے۔ پھر ہم کیونکر کہیں کہ خدا کی طرف سے بندہ کا عشق روا نہیں ہوسکتا۔عشق و محبت اور دوستی کی تحقیق میں اس طائفہ کے مشائخ کی رمزیں اتنی زیادہ ہیں، کہ ان کا احاطہ یہاں ممکن نہیں میں یہاں تھوڑی سی بیان کروں گا، تا کہ برکت پیدا ہو جائے۔

حضرت ابوالقاسم قشیریؒ فرماتے ہیں ''محبت یہ ہے کہ محبّ اپنے محبوب کی ذات کے اثبات کے لیے اپنی صفاتِ بشری اور خواہشات کو محو و نابود کر دے،،۔یعنی محبّ اپنی محویت تامہ سے فانی ہو جائے اور محبوب باقی ہو جائے یہاں تک کہ ہوش و حواس اور عقل کے سلامت ہوتے ہوئے شریعت کی پیروی کا حکم بندے سے ساقط نہ ہو جائے۔اس مسئلہ پر تمام اُمت کا

اجماع ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کبھی منسوخ نہ ہوگی، اور جب باہوش وحواس اور صاحب عقل شخص سے تکلیف شرعی کا اُٹھنا جائز سمجھ لیا جائے تو پھر یہ جواز سب کے لئے ممکن ہو سکتا ہے تو یہ تصور محض زندیقی و بے دینی ہے ہاں مغلوب ومجذوب اور دیوانہ کا حکم دوسرا ہے اوران کا عذر بھی اور ہے میں کہتا ہوں کہ حق تعالےٰ کے عشق ومحبت اور باطنی روابط میں آنحضرتؐ کے رُتبہ کو اور کون پہنچ سکتا ہے؟ لیکن بایں ہمہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تو تکلیفِ شرعی زندگی کے کسی دور میں ساقط نہ ہوئی۔ بلکہ طاعت وعبادت کا ذوق روز بروز ترقی پر تھا۔ آپ نے رات دن اس قدر عبادت کی کہ کوئی دوسرا سوچ بھی نہیں سکتا۔ آپ کے پائے مبارک میں ورم آ گیا حتی کہ اللہ جل شانہ، نے فرمایا: (طٰہٰ ما انزلنا علیک القراٰنَ لتشقیٰ) (ترجمہ): اے پیغمبر ﷺ ہم نے قرآن کے احکام آپ پر اس لئے نازل نہیں کئے کہ آپ ذکر وعبارت میں اپنے نفس پر حد سے زیادہ بوجھ ڈالیں،،

حضرتِ سمنون محبؒ فرماتے ہیں'' محبت کرنے والوں نے دنیا اور عقبیٰ میں اللہ کے نزدیک اور مطیع بندوں ہی کی محبت اختیار کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، آدمی حشر میں اس شخص کے ساتھ ہوگا جس سے وہ دُنیا میں محبت رکھتا تھا،، پس محبّ دُنیا اور آخرت میں اولیاء اللہ کے ساتھ ہوتے ہیں اور جس شخص کے ساتھ اولیاء اللہ ہوں گئے۔ اس سے خطا روانہ ہوگئی۔ اور حضرت یحییٰ معاز رازی فرماتے،، حقیقی محبت وہ ہے جس میں نہ تو جور وجفا سے کمی واقع ہو اور نہ رحم وکرم اور بخشش وعطا سے اس میں اضافہ ہو،،۔

سچی محبت کسی خاص قسم کے سلوک یا حالات وتغیرات کے تابع نہیں، بلکہ وہ ہمیشہ پوری قوت ومتانت سے اپنے ایک ہی معین معیار پر قائم ومحکم رہتی ہے، کیونکہ محبت میں جفا یا عطا دونوں خارجی سبب ہیں اور سچے عاشق کو اپنے عشق کی محویت میں خارجی اسباب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اور محبت کے طریق میں جفا یا وفا اُس کے نزدیک ایک جیسی ہوتی ہے، اور حکایات میں مشہور ہے جب چند ظاہر پرست لوگوں نے حضرت شبلیؒ پر دیوانگی کا قیاس کیا کہ ولایت مطلق بندہ کو حاصل ہو جائے، اور یہ خواص اولیائے اللہ کا درجہ ہے۔

مشہور ہے کہ جب فانی فی اللہ اور باقی باللہ حضرت حسین بن منصورؒ الحلاج کو لوگوں نے سولی چڑھایا تو ان کا آخری کلام تھا۔(حُب الواحد افراد الواحِد لہٗ)ایک ہی ذات کی محبت کا پہلا تقاضہ یہ ہے کہ اس کی زات کو ہر طرف سے یگانہ و یکتا سمجھا جائے اور ذات وصفات میں اس کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کیا جائے'' اور توحید باری تعالےٰ کا تعین اس سے بہتر الفاظ میں کیا ہو گا ؟اس قول میں محبت کے معنوی تقاضوں کو انتہائی جامع مؤثر انداز میں بیان کیا گیا ہے،حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں۔''محبت یہ ہوتی ہے کہ دنیا میں اپنے بہت زیادہ کو تو کم جانے کیوں کہ وہ فانی ہے اور اپنے محبوبِ حقیقی کی جانب سے تھوڑے کو بھی بہت کچھ سمجھے کیوں کہ وہ باقی اور مستقل ہے'' اور یہ عقیدہ بندگانے حق کے لئے اس بنا پر ضروری ہے کہ بندہ کو دنیا کی نعمتوں میں جو کچھ بھی دیا گیا ہے،اس کو حق تعالےٰ خود ہی تھوڑا فرماتا ہے (عربی) اے پیغمبرﷺ فرما دیجیے کہ دنیا کے فوائد تو عقبیٰ کے مقابلے میں بہت ہی تھوڑے ہیں'' پھر اسی دنیا میں اپنی جانب سے عطا کی گئی چیز یعنی ذکر کو''کثیر'' بہت زیادہ فرمایا(و ذکرو اللّٰہ کثیراً والذّاکراۃ)وہ مومن مرد اور عورتیں خدا کو بہت محبوب ہیں جو اس کا ذکر کثرت سے کرتے ہیں''پس جو چیز خداوند کریم کی طرف سے بندے کو موصول ہو وہ تھوڑی نہیں ہوسکتی'اور جو کچھ مادّی ذرائع سے بندے کے پاس ہو'وہ زیادہ ہونے کے باوجود بھی تھوڑی'قلیل ہے۔

حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ فرماتے ہیں''محبت یہ ہے کہ محبوب کے احترام میں اس کے اوامر واحکام کی مکمل اطاعت کی جائے اور اس کے نواہی یعنی منع کئے ہوے کاموں سے ہمیشہ اجتناب کیا جائے''اس لئے کہ جب محبوب کی محبت دل میں قوی ہوتی ہے۔تو دوست کے فرمان کی اطاعت دوست پر آسان ہو جاتی ہے۔اور ایک گروہ اپنی غفلت و بے دینی کی وجہ سے یہ بودا سا عذر بنائے پھرتا ہے کہ بندہ خدا سے محبت کرتے کرتے آخر دوستی کے اس درجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ اس سے اطاعت اٹھ جاتی ہے یعنی کہ وہ احکام شرعیہ کا مکلّف نہیں رہتا اور یہ عقیدہ محض بے دینی اور فسق ہے کیوں کہ یہ محال ہے اور انہیں مخبوط الحواس قرار دے کر قید

وبند میں رکھا گیا' تو ایک گروہ آپ کی زیارت کے لئے وہاں گیا۔آپ نے ان سے دریافت فرمایا''تم لوگ کون ہو اور یہاں کس غرض سے آئے ہو؟انہوں نے عرض کی ،ہم آپ کے دوست اور احبّا ہیں ،اور یہاں آپ کی زیارت کے لئے آئے ہیں'' آپ نے فرمایا۔''اگر تم واقعی میرے دوست اور محبّ ہوتے تو میری مصیبت و بلا میں مجھ سے ہرگز کنارہ کشی اور روگردانی اختیار نہ کرتے۔پس پہلے کی طرح اب مجھ سے بے تعلق رہو'' یہ کہہ کر آپ نے ان لوگوں پر پتھر مارے اور وہ سب بھاگ گئے۔۔۔ ۱۱

محبت ایک نور ہے

محبت محض خواہش نہیں جو کسی جسم کے کسی ظاہر یا باطنی حصے میں پیدا ہوتی ہو، اس میں کسی آلائش کی گنجائش نہیں نہ کسی کمزوری کی رخصت ہے۔ یہ دل کا، اور روح کا حکمران جذبہ ہے، جو محبوب کی توجہ (توفیق) ہی سے پیدا ہوتا ہے، پنپتا ہے، عروج کی جانب بڑھتا ہے اور منزل آشنا ہوتا ہے۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے : جس کا سینہ اللہ نے اسلام قبول کرنے کیلئے کھول دیا ہے اس کو پروردگار کی طرف سے نور عطا ہوتا ہے '' ۱۲

سو ایمان نور ہے، اور ایمان محبت ہے اور مکمل ایمان عشق ہے لہٰذا محبت یا عشق نور ہے، اور اللہ کا عطیہ ہے عشق نعمت ہے اور اس کو آلائشوں سے پاک رکھنا اس کا شکر ادا کرنے کے مترادف ہے اور جس نعمت کا شکر ادا کیا جاتا ہے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اس نعمت میں اضافہ کرتا ہے، اور جب منعم حقیقی کی نعمت کا شکر ادا نہ کیا جائے تو اس کا عذاب بہت شدید ہے۔

لئن شکرتم لازید نکم ولئن کفرتم ان عذ ابی لشدید ۱۳

محبت ایک نور ہے جو انسان کے باطن ہی میں ہوسکتا ہے، نور کا اصل مقام دل ہی ہوسکتا ہے جب یہ نور انسان کی روح میں جگہ بنالیتا ہے اور کسی قسم کی کوئی آلائش دل میں نہیں رہتی تو ایسا شخص خدا کے نور کے ساتھ دیکھتا ہے، اسی لئے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ مومن سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ اس کی دل کی آنکھ کھل جاتی ہے جب اس کی باطن کی آنکھ کھلتی ہے تو اللہ کی صفات کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے اور اس میں ہی گم رہتا، اسے کسی تکلیف کا احساس نہیں رہتا نہ اسے کوئی حاجت پریشان کرتی ہے۔ وہ ایسی محبت سے لطف اندوز ہونے لگتا ہے اور یہ سرور اسے دنیا اور اس کی ہر نعمت سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ نے ایک مرتبہ حضرت جنید بغدادیؒ کے سامنے کسی واقعے پر **لا حول ولا قوۃ** پڑھا تو حضرت جنید بغدادیؒ نے انہیں تنبیہہ کی اور فرمایا ''اللہ کی رضا میں

راضی رہنا سیکھو تمہارا اس وقت یہ ردعمل تمہارے سینے کی تنگی کو ظاہر کرتا ہے اور سینے کی تنگی ''راضی برضائے الٰہی'' کی نفی ہے''۔

تصوف کی دنیا کے تقریباً سارے بڑے اور اس عمیق گہرائی والے سمندر کے بے شمار شناور، شیوخ کرام، مشائخ عظام (اللہ ان سب اپنی رحمت کاملہ نازل فرمائے) کا یقین کامل ہے کہ مقام محبت نور یقین کے غلبے سے حاصل ہوتا ہے، دل اگر نفس کی آلائشوں سے پاک ہو جائے اور دنیاوی لذات سے اس کو بے رغبتی پیدا ہو جائے تو ایسے قلوب ذکر کی کثرت سے مانجھے جاتے ہیں اور پھر ان پر محبت کے نور کا نزول ہوتا ہے۔ اس پر احوال مرتب ہونے لگتے ہیں، پھر اس کی نگاہ محض اس کی نگاہ نہیں رہتی وہ عطائے الٰہی سے اللہ کی نگاہ بن جاتی ہے، اللہ اس کا مددگار ہو جاتا ہے۔: علامہ اقبال اسی کیفیت کی نشاندہی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

قرآن پاک میں ذکر ہے کہ اللہ کی محبت ان (درج ذیل) صفات والوں کو حاصل ہوتی ہے:

۱۔ ایمان والے (مومنین) اور اعمال صالح کرنے والے (صالحین)
ان الذین آمنو و عملو الصٰلحٰت سَیَجْعَلُ لَھُمُ الرَّحْمٰنُ وُدّاً O (۱۴)
۲۔ عدل کرنے والے ان اللّٰہ یُحِبُّ المقسطین O (۱۵)
۳۔ عہد (عہدِ محبت) نبھانے والے اور اللہ سے ڈرنے والے
بلیٰ من اوفیٰ بعھدہٖ و اتّقیٰفا ن اللّٰہ یُحِبُّ المتّقین O (۱۶)
۴۔ صبر کرنے والے (الصابرین) ۱۷
۵۔ اللہ پر بھروسہ کرنیوالے (متوکلین)۔ ۱۸
۷۔ اللہ سے ڈرنے والے (متقین) ۱۹
۸۔ مجاہدین (جہاد فی سبیل اللہ) ۲۰

۹۔ احسان کرنے والے (محسنین) ۲۱

۱۰۔ ان اللّٰہ یحب التوابین و و یحب المتطھرین ۲۲

اسی پر بس نہیں پورا قرآن اور ذخیرۂ اللہ اور اس کی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کے اہل دلوں کی خصوصیات (اہلیت) کا شاہد ہے ۔ہم قرآن پاک کو دستور محبت کا صحیفہ کہہ سکتے ہیں۔ اللہ کی مخلوق سے محبت، بندے کی اللہ سے محبت، مومن کی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت اور اس ذریعے سے اللہ سے عشق یہ سب دین اسلام کی اساس ہیں۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے :

جس کا سینہ اللہ نے اسلام قبول کرنے کیلئے کھول دیا ہے اس کو پروردگار کی طرف سے نور عطا ہوتا ہے '' ۲۳

اللہ سے محبت کرنے والے کیلئے لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے سراپا محبت بن کر محبت کرے۔اسی وقت وہ محبت کے فوائد حاصل کرسکتا ہے اور لطائف غیبی کا دروازہ اس کیلئے کھل سکتا ہے۔ اللہ کی توجہ حاصل ہوسکتی ہے اور یہی وہ مقام ہے جس کیلئے ارشاد الٰہی ہے ''۔۔۔اور اللہ ان سے محبت کرنے لگے گا'' ۔ ۲۴

روایت ہے کہ حضرت شیخ مطرف بن الشخیرؒ نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو لکھا کہ اللہ سے انس رکھو، اور بس اس سے تعلق رکھو کہ اللہ کے بہت سے بندے ایسے ہیں جو اللہ سے محبت کرتے ہیں اور اپنی خلوتوں میں اللہ سے زیادہ مانوس ہوتے ہیں۔

حضرت شیخ واسطیؒ فرماتے ہیں: ''وہ شخص مقام ومحل انس (محبت) تک نہیں پہنچ سکتا جو کائنات سے بیزار نہ ہو ''

حضرتؒ کے اس قول سے رہبانیت مترشح نہیں ہوتی بلکہ اس سے دنیاوی مال ومتاع کا لالچ، جسمانی راحت، حرص اور دیگر الائشوں سے بے رغبتی کی ترغیب ہے۔ جو دراصل عشق کے سفر میں مانع ہیں۔اللہ کے اس ارشاد کا مفہوم بھی اغلباً یہی ہے'' کہ تمہارے لئے تمہارے مال واسباب اور تمہاری اولاد فتنہ (آزمائش) ہے'' کہ یہ ساری متاع انسان کو یکسوئی کی

دولت سے محروم کر دیتی ہے اور عشق یک سوئی سے منزل کی جانب رواں دواں رہنے کا متقاضی ہے۔

حضرت رابعہ بصریہؒ نے فرمایا ''(اللہ سے دل لگانے والا ہر فرد فرمان پذیر (عشق فرمودۂ قاصد پہ سبک گام عمل) ہوتا ہے اور پھر یہ اشعار پڑھے:

وَلَقَدْ جعلتُکَ فی الفؤاد و محدثی
و اَبحثُ جسمی من اراد جلوسی
ماالجسم منی للجلیس مؤانس
و حبیب القلبی فی االفواد انیسی

(یقیناً (اے اللہ) میں دل میں (ہر وقت) تجھ سے ہم کلام رہتی ہوں اگر چہ میرا جسم اپنے ہم مجلسوں کے درمیان رہتا ہے، میرا جسم لاکھ میرے ہم مجلسوں کے درمیان ہو لیکن میرے دل کا اصلی انیس تیرے سوا کوئی اور نہیں۔)

عاشق ہر لمحے اپنے محبوب کے خیال میں گم رہتا ہے اور اس کے اردگرد کا ماحول اسے اپنی جانب متوجہ نہیں کر سکتا۔ اسے ہر شے میں اپنے محبوب کی تصویر ہر لمحہ نظر آتی ہے۔ یہی وفور محبت، شدید محبت عشق کہلاتی ہے۔ یہی نور ہے، یہی صراط مستقیم ہے جس کی دعا کرنے کی ہدایت ہر مسلمان کو کی جاتی ہے۔ اور یہ نور اطاعت رسولؐ، آنکھ بند کر کے، بغیر کسی تردد، بلا پس وپیش اتباع رسولؐ ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

پس اسلام کی اصل غایت یہی عشق الٰہی یہی اطاعت رسولؐ، یہی ایمان ہے۔ اور اسی کو فوز عظیم قرار دیا گیا اور اسی کامیابی کا آخری درجہ دیدار الٰہی ہے۔ دنیا میں اس سارے عمل کا تمام دورانیہ، دورانیے کا ایک ایک لمحہ پل صراط ہے جو پار اترے گا وہی کامیاب ہوگا، وہی فوز عظیم کے مرتبے کا اہل پائے گا۔

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

سفر محبت پل صراط ہے جو خواہشات، حرص، نفسانی جذبات، اور وساوس کے جہنم کے اوپر بنایا گیا ہے، ذرا سی بھی چُوک راہی کو اس جہنم کے اندر گرا سکتی ہے۔ (لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام)۔ اک امتحان ہے جس میں کامیابی ہی حقیقی کامیابی ہے اور ناکامی حقیقی اور دائمی ناکامی ہے۔ وہی جن وانس کامیاب ہوں گے اور انہیں نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا جن کا سفر کامیابی سے منزل کی جانب طے ہوگا اور وہ راستے کی تمام دشواریوں کے باوجود وصل الی الحق کی جانب اپنا سفر کامیابی سے طے کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ اوران میں سے ہرفرد ''و ینقلب الیٰ اھلہٖ مسروراً '' کی منزل سے ہم کنار ہوگا۔ یہی ان کی کامیابی کی سند ہوگی اور یہ سند کوئی اتنی آسانی سے ملنے والی نہیں۔ اس کیلئے راستہ کٹھن ہے اور پھولوں کی وادی تک پہنچنے والے راستے کو کانٹوں سے ڈھک دیا گیا ہے انہی خارزاروں کو عبور کر کے گلستان (جنت) تک پہنچا جا سکتا ہے جو حقیقی کامیابی ہے اور وصل الی الحق کی منزل بھی۔ علامہ اقبالؒ کا ارشاد ہے

مپرس از عشق و از نیرنگئ عشق
بہر رنگے کہ خواہی سر بر آورد
درونِ سینہ بیش از نقطہ ء نیست
چو آید بر زباں پایاں ندارد

ترجمہ: عشق اور عشق کی جادوگری کا مت پوچھ (عشق کی بات نہ کر) تو جس رنگ میں چاہے وہ ظہور میں آجاتا ہے۔ یہ سینے کے اندر ہو تو ایک نقطے سے زیادہ نہیں ہے لیکن جب زباں پر آجائے تو اس کی کوئی حد نہیں۔ ۲۵

حوالہ جات

۱۔(فضائل اعمال: باب نہم: حکایات صحابہؓ از شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلویؒ بحوالہ سنن ابی داؤد)

۲۔ایضاً

۳۔مسند احمد (امام احمد بن حنبلؒ حدیث نمبر ۲۱۴، ۲۱۵)

۴۔سید علی ہجویریؒ کشف المحجوب باب تصوف

۴۔ ایضاً

۵۔شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ فضائل اعمال باب علمی ولولہ اور اس کا انہماک

۶۔ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ،حکمت رومی باب عشق

۷۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ عوارف المعارف باب ۶۰

۸۔القرآن سورہ آل عمران۔

۹۔حضرت سید علی ہجویریؒ کشف المحجوب باب محبت کا بیان

۱۰۔ (ایضاً)

۱۱۔ (ایضاً)

۱۲۔ القرآن سورہ الزمر

۱۳۔ ایضاً سورہ

۱۴۔ ایضاً سورہ مریم آیہ ۹۶

۱۵۔ ایضاً سورۃ الحجرات آیہ ۹

۱۶ ایضاً سورہ الممتحنہ آیہ ۳ المائدہ آیہ ۴۲

۱۷۔ ایضاً سورہ آل عمران آیہ ۶۷

۱۸۔ ایضاً النساء آیہ ۱۴۸

۱۹۔ایضاً سورہ آل عمران آیہ۴۶، التوبہ آیہ۴،۷
۲۰ (الصّف ۴)
۲۱۔ ایضاً
۲۲. (البقرة ۲۲۲)
۲۳۔(القرآن سورۃ زمر پارہ۲۳)
۲۴۔(القرآن)
۲۵۔علامہ اقبالؒ پیام مشرق لالۂ طور ق 65

Refferences حواشی

ماخوذ از عہد نامہ عتیق وعہد نامہ جدید وتاریخ ادیان عالم

Here are seven steps to finding true love.

1. Love Requires You to Reveal Your True Self to Another

The famous author, C. S. Lewis, puts it best, "To love at all is to be vulnerable. Love anything and your heart will be wrung and possibly broken. If you want to make sure of keeping it intact you must give it to no one." Lewis is right. What makes love so hard, and sometimes painful, is the vulnerability that always seems to accompany it. To love at all is to be vulnerable.

We use the word love to describe a lot of things. We love food. We love music. We love a good joke and we love having a good time. Using love to describe such simple things makes the word seem a little safer. It is safe because we are not exposed. A great cup of coffee cannot reject us. A song from our favorite band does not leave us feeling useless. But when we choose to share our life with another person, we inevitably make a choice to become vulnerable. Unfortunately, vulnerability leaves our defenses down and often we get hurt

We all know the feeling: rejection, humiliation, desperation. Opening our heart to another person, only to be rejected, is one of the most painful experiences in life. It hurts the most because in love we are most vulnerable. It's worse

than physical pain because it shakes us at the core of our identity, our hopes, and our dreams. Love rushes us to the mountain-top, and when lost, sends us careening back to the valley below. We cannot help but feel empty. We cannot help but feel worthless. We cannot help but feel hopeless.

2. Finding True Love Can Be Difficult

The Bible has a remarkable story about a woman named Leah who discovered that finding true love was difficult. Leah was the daughter of a wealthy and manipulative man named Laban. Leah also had a sister named Rachel, one of the most beautiful women in the whole region. Leah, was described as, "weak in the eyes." We do not know exactly what that phrase means, but it is not hard to guess. Even without the side-by-side comparison to her beautiful sister, Leah was not drawing much attention.

One day, Rachel was herding the sheep when a young man named Jacob came to the well. His journey's purpose was to find a wife, so it did not take him long to notice beautiful Rachel approaching. He rolled away the stone over the well, and watered the sheep for her. Learning he was her father's nephew, she ran home to tell Laban the news. Already head-over-heels in love, or call it love-at-first-sight if you wish, Jacob stayed on with Laban. When asked what his wages should be, he immediately asked to marry Rachel. Laban made Jacob an offer. "Work for me, seven years without pay, then I will give you my daughter."

It is starting to sound like a romantic story for the ages! Jacob was so madly in love that he did not hesitate. Seven years he worked, everyday focused on his prize. One day he would finally be able to marry the woman of his dreams,

Rachel. The Bible records the event with all of the poetry we would expect from a great love story. "Jacob served seven years for Rachel, and they seemed to him but a few days because of the love he had for her."

After seven years of labor, the wedding day finally arrived. The party must have been massive. When night came, Jacob and his new bride, probably wearing her wedding veil, went into their tent.

The next morning Jacob awoke, the Bible says, "and behold it was Leah!" Jacob had been tricked. Laban had switched his daughters on the wedding night and tricked Jacob into marrying his oldest, Leah. Why? Laban wanted another seven years of free labor before he would allow Jacob to actually marry Rachel. Still madly in love with Rachel, Jacob agrees and works another seven years to marry this younger daughter.

We like the image of Jacob! He was willing to submit himself to over a decade of manual labor as an act of love for Rachel whom he considered to be his soulmate. Like a great Shakespearian tragedy, we want desperately to find that kind of love, too. We want to know that someone would make such a sacrifice for us. This expression of love is the deepest craving of our heart. But allowing ourselves to be quickly carried off in the ecstasy of the moment misses the real heart of the story for Leah.

Leah had never been able to draw much attention. She had always been the hopeless romantic. But now things were much worse. Leah was married to a man who never for a moment loved her, and manipulated by a father as payment for help around the farm. Leah was not loved by her husband,

nor even her father. She was used and discarded. When she was most vulnerable she was rejected.

What happened next is subtle, but important for us to understand our own struggle with love and rejection. In Leah's first century world, women cared deeply about building a family, especially having sons, to which they could pass on their family name. A father's proudest moment was the birth of his first son. Soon after being married, Jacob wanted a son. Leah saw an opportunity! If she could be the first to give Jacob a son, surely then he would love and appreciate her. Leah must have been excited to find out she was pregnant, and even more excited when she gave birth to the family's first son, Reuben.

Now surely her husband would love her.

Leah believed in her heart that God had blessed her with this son so that now her husband would finally love her. But nothing changed. Leah gave birth to a second son, she named him Simeon.

Again she believed God had seen her rejection. Now, surely her husband would love her. But nothing changed. Leah had a third son, who she named Levi. She honestly hoped that now her husband would care for her and love her. But again, nothing changed.

Leah's story teaches us that finding true love is difficult. True love goes beyond the passion of romance and even finding a partner for the sake of being married. While romance and having our needs met for provision and security are important, there is more that we must discover.

3. Your Need for True Love Reveals Your Need to Be Loved Unconditionally

Leah's life was controlled by the hope that she could somehow make herself lovable. She was desperate to find a way to earn her husband's attention. Her broken heart and desperation to be loved teaches us a deeply personal truth about our own search for true love. We inevitably all feel the crushing weight of trying to earn it.

Marketers sell us the idea that if we were just a little bit more attractive, a little thinner, and a little better dressed, then someone would finally take notice and we would feel loved. But we do not. Culture pressures us to set aside our prudish reluctance and instead give-away our bodies; it promises us intimacy leads to love. But it does not.

The harder we try, the more desperate we become to find the magic potion. We believe that with the poison-tipped arrow of Cupid in our hand, we need only hit our target and watch as love and intimacy explodes into a vibrant life of confidence, fulfillment, and passion. But, that is not real life. So, we end up settling for watching it play out in movies and dreaming about it in novels. Our own experience feels more like crawling our way through the dunes of the Sahara Desert, desperate to find an oasis with water. Just when we think we have finally found true love, we are crushed with the reality that it was just a mirage and we have nothing to show for it.

Leah helps us realize that most of what we call love and our search for it, is really a desperate expedition for evidence that we are valuable enough to be loved in the first place. We want to feel like our life is worth something to someone. We are desperate to be known, not just as a body, but as a soul. We want to be vulnerable and in that vulnerability to be accepted We want to be loved unconditionally.

To be known and not loved is our greatest fear.

This is where we find the great struggle of looking for true love. As one author puts it, "To be loved but not known is comforting but superficial. To be known and not loved is our greatest fear." Each of us wants to find a way to open up our hearts and lives and know that in that moment of honesty we will be accepted and not rejected.

We all know the risks, so we tend toward pretending. Too nervous to share the truth, we morph into whatever seems most desirable. But that is empty. We know it and we just do not know what else to do. We feel like we have to keep the show going. After all, what is the alternative? If we open up with the whole truth, we face the risk of being ridiculed, rejected and thrown away.

Honestly, true love has never really been about romance or passion at all. It is about truth and value. It is about vulnerability and acceptance. It is about wholeness and finding peace. It is about discovering a foundation on which we can build our lives and on which we can place our hope and confidence. It is about feeling like we are worth something. It is about sharing vulnerability and in the midst of it, feeling loved unconditionally.

4. True Love is Complicated by Our Self-Interest

Let me tell you a secret that you probably know already but are not willing to admit. Unconditional love, the kind that pours meaning and significance into your life, is hard to find in another human being because we are all too self-interested and too self-motivated. Our hearts are bent toward protecting and promoting ourselves. It is not hard to see! We live in a culture that constantly measures every relationship by what

we get out of it. We stay married only as long as it is benefiting us. We commit to a relationship only until something better comes along. The success of our relationships is measured by our need for love being met, instead of seeking to meet the need for true love in others.

The Bible speaks clearly to this fact. It calls our bent toward self-interest sin, and it was neither the way humanity, nor the world was created originally. Adam and Eve were the first to experience love and it was much deeper than what we call love today. Adam and Eve's relationship was perfectly woven together with one another, with God, and with the enjoyment of creation around them. There was no self-interest. Instead, their whole lives were shaped by caring for each other, caring for the world around them, and thanking God for the experience. Neither Adam nor Eve ever felt a moment of fear, rejection, or failure.

If you are familiar with the Bible's story of the first sin, you will remember it involved a simple proposition. Adam and Eve were forbidden to eat from one tree in the Garden of Eden. As Eve passed by, a serpent whispered a temptation. "Eve, if you eat of this fruit you will be like God." It is strange that the serpent did not tempt Eve with how delicious the fruit looked. The real temptation had nothing to do with appearance. Instead, the Serpent did something more subversive. He offered Eve a thought about herself. Eve asked herself a question she had never wondered before, "What's in it for me?"

This moment of self-discovery came with massive consequences. Eve ate the fruit and passed it on to her husband who ate it as well. This act of disobeying God led

Adam and Eve to the startling realization they had been naked this whole time. It is as if they had been so enjoying one another, and the world around them so much, that they never thought to look down at themselves. For the first time they felt vulnerable and ashamed. They made clothes to cover and protect themselves.

God discussed their disobedience with them, because He knew that all of their relationships were falling apart as a result of their self-interest. Eve blamed the serpent for tempting her. Adam blamed Eve for giving him the fruit and then even went so far as to blame God for giving him Eve in the first place! Neither one wanted to take the blame but was concerned only for their self-interest. It is starting to look more like the world with which we are familiar!

The consequences for disobeying God were the loss of relationships. Adam and Eve would never be allowed back into the perfect garden world. They lost everything. We know their new world of self-interest and self-protection, because we carry with us the same sin-bent reality. We long for real love, because we were created to love and be loved unconditionally. This is probably the most important point in this entire article. You will never find or experience the true love you are looking for in this world alone. Each of us and the world around us is too soaked in sin. The great news is that there is One who is the very definition of Love and you can be in relationship with Him!

5. There is Only One Source of True Love

Let us return to Leah's story for a moment. Leah was caught up in the struggle to earn her husband's love. Three sons later, she was still clinging to the hope that one day he

would wake up and start to appreciate her. She kept waiting and waiting. Eventually, Leah gave birth to another son, her fourth. Leah named him Judah and announced, "Now I will praise God." Judah's name means something special. It means to praise, or be thankful to God. But, how could she praise God when her outward circumstances had not changed? Jacob did not rush home with a bouquet of roses and an apology card. Leah was no more loved now than she had ever been. But somehow, she was now worshiping and thanking God .

With the birth of her fourth son, Leah had a life altering realization. She realized that while her husband refused to love her, God was present in her life! God had noticed every pain, every sorrow, every moment of rejection she had ever experienced and he was pouring blessing into her life. God loved her unconditionally!

You need to realize something important, as well. You may feel completely neglected and empty, but God is paying attention to you. You would not be reading this if that was not true. Right now, the God of the whole universe is trying to show you, there is a greater love and acceptance being offered to you, than you ever thought existed. That love is God's love. He loves you unconditionally.

Leah did not realize it at the time, but Leah, and her son Judah, were ancestors of a man named Jesus. This is the Jesus, whom Christians worship and who the entire Bible anticipated. It is a fitting end to the story, because no one would ever offer greater hope and love than Jesus. He would offer exactly what Leah was trying desperately to find.

The Bible tells that Jesus was not merely a man, but the

son of God Himself, who came to earth .

He did so because God was not content to leave us in hopeless despair and rejection, stumbling our way through life trying to manufacture the love that had been lost all the way back in the Garden of Eden. Even though our own selfish hearts had blinded us from God's love, God was determined to lead us back to it.

Jesus knew all too well this pain of rejection. He was rejected at times by His best friends, His own family, and in the end, by the world around him. Jesus lived a perfect life, never out of self-interest but always doing the will of the God the Father, and offering Himself to serve and help those around Him. But no one recognized what He was doing.

They saw it as weakness and sentenced Jesus to death, and crucified Him. Jesus satisfied God's justice, but was not rejected by God-or there would have been no resurrection

God is paying attention to you.

Our rebellion and self-preference is disobedience to God, and that keeps us for a relationship with Him. We are not interested in His plan, we want our dreams to come true. So we reject Him and chart our own course. We ignore His instructions and believe whatever feels right to us. We turn down His love and try to replace it with romance and passion because it makes us feel good temporarily. This is the most remarkable part of the Gospel. God did not wait for us to call out to Him for help or love.

He blessed Leah even when she was caught up in trying to earn love for herself. God does not wait for you either. He chose to act on your behalf while you were still lost in your sinful and selfish ambitions. God took all of the punishment,

that your disinterest and rebellion deserved, and He poured it out on Jesus, His only son. Jesus stepped into your place and accepted the punishment, because He loves you.

The real struggle for love, is our desire to be fully known, and yet fully accepted. When you hear the phase, "Jesus loves you," this is not a Christian cliché, but rather the truth of unconditional love. Jesus knows better than anyone who you are; the good and the bad. He knows every secret, every pain, every sin, and every wrong. He knows you better than you know yourself. He knows, because He took your place. He has already paid the price for your sins, and He did it before you ever paid a moment of attention to Him.

Do you realize what that means? In Jesus, you are fully known and still fully accepted. Jesus is under no allusions. He knows exactly who you are. His love is not something you earned or deserved, yet here He is offering it to you. No one knows you better, and no one could possibly love you more. He gave his life for you. And now, He is willing to take the journey with you, from where you are, to where you need to be in Him; so that you can experience true love.

6. Accepting Jesus' Love Opens the Door to a New Life

The good news of what Jesus has done for you is not just salvation from a coming apocalyptic destruction but accepting Jesus' love, will begin to transform and fill your life with purpose, strength, and value. Like Leah, you will be amazed at the realization that you have discovered true love! You can thrive in the amazing joy of worshipping Him with a thankful and pure heart regardless of what is going on around you.

Your value and your identity is secured for all eternity with Jesus, who loves you so passionately that He gave His own

life. When you understand that truth, it transforms the way you think about love. No longer is love solely a romantic relationship that meets your desperate need to find significance and value. You are able to approach every new relationship, already possessing a full grasp of your significance. Living in God's love and following Him places you in a position of strength for you know, to whom you belong and who you are. You do not need love to prove your self-worth or value. God is yours and you are His.

Understanding God's love fills you with the stability and confidenceto face any rejection or loss, and to know, no matter how much it hurts, your identity and value can never be shaken. You are secure in God! Without the need to use another's love, to salvage your self-worth, you can finally start to enjoy and appreciate all of the people and experiences that surround you every day. You can enjoy your life and your relationships the way God that intended.

Learning to live and grow in the love of God can be a process, as you throw off the old nature and ways of thinking, and put on God's love and right way of living. The world around us is constantly trying to challenge you, and to pull you back. But, every single day, Jesus continues to express His love as an alternative. All that is left is for you to make a choice.

Are you ready to make a life-changing decision to follow true love and to be loved unconditionally? God is the source of our value and our hope. Nothing you face in this life willshake loose the love of God.

With God on our side like this, how can we lose? If God didn't hesitate to put everything on the line for us, embracing

our condition and exposing himself to the worst by sending his own Son, is there anything else he wouldn't gladly and freely do for us? . . . Do you think anyone is going to be able to drive a wedge between us and Christ's love for us? There is no way! Not trouble, not hard times, not hatred, not hunger, not homelessness, not bullying threats, not backstabbing, not even the worst sins listed in Scripture. . . . None of this fazes us because Jesus loves us. I'm absolutely convinced that nothing-nothing living or dead, angelic or demonic, today or tomorrow, high or low, thinkable or unthinkable-absolutely nothing can get between us and God's love because of the way that Jesus our Master has embraced us. (Romans 8:31-32, 35, 37-39, The Message)

7. Your Search for True Love Begins with This Simple Prayer

Your journey for true love and to be loved unconditionally begins with a simple prayer. Would you read and believe this prayer with me?

"God, right now I'm experiencing deep hurt and rejection. I realize that I have spent much of my life trying to find love and value in the wrong places. I don't want to go on living like this. Forgive me for trying to find my own way. Forgive me for neglecting You. I thank you that even before I was aware of it, You were demonstrating Your love for me in Jesus' death. I thank You that His death offers me a way to know You and to experience Your love. God, fill my heart with a sense of your love. Help me to realize that you are the source of my worth and value. I trust you with my life and my broken heart. Heal it. Help me to turn to you, and worship you. Amen."

Sikhism[edit]

In Sikhism Love means love for the Lord and His creation. This is one of five virtues that is vigorously promoted by the Sikh Gurus. The other four qualities in the arsenal are: Truth (Sat), Contentment (Santokh), Compassion (Daya) and Humility(Nimrata). These five qualities are essential to a Sikh and it is their duty to meditate and recite the Gurbani so that these virtues become a part of their mind set.

This is a very positive and powerful tool in the Sikhs arsenal of virtues. When one's mind is full of love, the person will overlook deficiency in others and accept them wholeheartedly as a product of God. Sikhism asks all believers to take on "god-like" virtues and this perhaps is the most "god-like" characteristic of all. Gurbani tells us that Waheguru is a "loving God", full of compassion and kindness. It is the duty of the Sikh to take on qualities of this nature and to easily forgive; to never hate anyone; to live in His Hukam - "Will" and to practise compassion and humility.

"jin prem keyo tin hee prab paeyo" "Only those who have love, will attain God"Guru Gobind Singh Ji .

۶۔متفرق Misc.

Polytheism[edit]

Different cultures have deified love, typically in both male and female form. Even though in monotheistic religions, the God is considered to represent love, there are often angels or similar beings that represent love as well.

" *Áine* - goddess of fertility and passionate love in Irish mythology

" *Eros or Cupid* - god of passionate love in Roman mythology

" *Antheia* - goddess in Crete mythology of love, flowers, gardens, and marshes

" *Aonghus or Aengus*- god of beauty, youth, and sensual love in Irish mythology

" *Aphrodite* - goddess of beauty and passionate love in Greek mythology

" *Astarte* - goddess of love in Canaanite mythology

" *Eros* - god of passionate love in Greek mythology

" *Freyja* - goddess of love, fertility and war in Norse mythology

" *Hathor* - goddess of love in Ancient Egyptian religion

" *Inanna* - goddess of sexual love in Sumerian mythology

" *Ishtar* - goddess of love and war in Babylonian mythology

" *Kama* - god of sensual love in Hindu mythology

" *Mihr* - spirit of love in Persian mythology

" *Rati* - goddess of passionate love in Hindu mythology

" *Venus* - goddess of beauty and passionate love in Roman mythology

" *Xochipilli* - god in Aztec mythology.0

Unificationism

The concept of True Love is the most central part of Unificationist theology.

From "MAPPING KNOWLEDGE: THE UNIFICATION ENCYCLOPEDIA PROJECT"
http://www.unification.net/misc/ency.html

"The central value in human life, which we may term "true

love," means that which seeks the best for others and the betterment of human life in all its dimensions. True love means living for others, giving without thought of a return. Its source is transcendental, beyond the self; the person who practices true love taps into an inexhaustible reservoir of life. The various philosophies and religions of the world speak of this value with a variety of emphases, aspects, and concepts, such as: compassion, grace, justice, charity, liberation, righteousness, and agape love. While recognizing that certain of these aspects may sometimes be in tension (e.g., the well-known Jewish discussion of the dichotomy between divine justice and divine mercy), we may regard the positive tendency of all of them as aspects of a single divine and universal value. This value, true love, is the aspiration and hope of all human beings and the manifestation of the best in human nature. "

عشق (مجاز سے حقیقت تک):

ابتدا پیش بتاں افتادگی
انتہاء از دلبراں آزادگی

(عشق کی ابتداء دنیا کے حسینوں کی محبت میں گرفتار ہونا (ان کے ناز نخرے برداشت کرنا ان کے حضور ہاتھ باندھ کر حاضر ہونا، ان کی ہر بات کو من وعن تسلیم کر لینا) ہے لیکن عشق کی انتہاء ان دلبروں اور حسینوں سے خود کو آزاد کر لینا ہے۔)

حضرت امیر خسروؒ (۱۲۵۳ء۔۱۳۲۵ء) کے مرشد اور سلطان الاولیائے ہند حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۸۳ء۔۳ر اپریل، ۱۳۲۵) کی خانقاہ میں تربیتی نظم بہت سخت تھا وہ اپنے زیر تربیت طلباء کو گویا ایک بھٹی سے گذارتے تھے تب کہیں جا کے وہ ان کو بیعت کرتے تھے اور اپنی مجلس میں بیٹھنے کی اجازت دیتے تھے۔

ایک دن وہ اپنی خانقاہ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک نوجوان خانقاہ میں داخل ہوا۔ اس کا حلیہ عجیب تھا شکل وصورت سے کسی کھاتے پیتے گھرانے کا لگتا تھا لیکن اس کی ہئیت عجب تھی اس نے گیروے رنگ کا پنڈتوں والا لباس پہنا ہوا تھا ڈاڑھی مونچھ صاف بھنویں منڈھی ہوئی ،سر پر چوٹی کے علاوہ استرا پھرا ہوا، چہرے پر بھبھوت ملا ہوا۔ اس حالت میں وہ کسی مندر کا بھگت لگتا تھا۔ وہ سیدھا حضرت کے پاس آیا اور کہنے لگا مجھے بیعت کریں۔ وہ خانقاہ ایسی تھی جہاں بیعت کے انتظار میں سینکڑوں دوسرے معتقدین سالوں سے خدمت میں مصروف تھے حضرت نے اس کی جانب مسکرا کے دیکھا اور ارشاد فرمایا ''کبھی محبت کی ہے؟'' وہ نوجوان شرمانے لگا، حضرت قیافہ شناس تو تھے ہی، آپؒ نے اس سے مکرر پوچھا ''کبھی محبت کی ہے؟

اپنی محبت کا قصہ بتاؤ، اس نے ڈرتے ڈرتے، شرماتے ہوئے کہا' جی ہاں میں نے محبت کی ہے، قصہ دراصل یہ ہے کہ میں جس محلے میں رہتا ہوں وہاں ہندو مسلم اکٹھے رہتے ہیں مجھے میرے پڑوس کی ایک ہندو لڑکی سے پیار ہوگیا۔ وہ لڑکی بھی مجھ سے پیار کرتی تھی، ہم ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے تھے، وہ لڑکی مجھ سے شادی کیلئے اپنا مذہب تبدیل کرنا چاہتی تھی، اس محبت کی خبر لڑکی کے والدین کو ہوگئی، اس خبر سے میرے والدین بھی پریشان ہوگئے، ہم دونوں پر پابندیاں لگ گئیں لیکن یہ پابندیاں ہم دونوں کی ملاقاتوں کے سلسلوں کو نہیں روک سکیں، لڑکی کے والدین نے جب معاملہ ہاتھوں سے نکلتے دیکھا تو اسے ایک مندر کی داسی بنا دیا۔ اب میرے لئے اس تک پہنچنا ایک مسئلہ بن گیا، میں نے اس کا حل یہ کیا کہ یہ موجودہ والا سوانگ بھرا اور مندر پہنچ گیا وہاں جا کر مجھے یہ احساس ہوا کہ میں ایک لڑکی کی خاطر یہ سب کر رہا ہوں اور وہ ذات جس نے مجھے پیدا کیا اور اتنی نعمتوں سے نوازا میں نے اس کیلئے کیا کیا؟ بس یہ خیال آتے میں وہاں سے الٹے پاؤں لوٹ آیا ہوں آپ کے پاس حاضری کے علاوہ مجھے کوئی دوسرا راستہ سجھائی ہی نہیں دیا۔ اب میری آپ سے درخواست ہے کہ مجھے بیعت کیجئے اور مجھے اپنے قدموں میں جگہ دے دیجئے'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے سارا ماجرا سنا اور اس نوجوان سے کہا ہاتھ آگے بڑھاؤ اور اسے بیعت کرلیا۔ یہ معاملہ بیعت کے انتظار میں بیٹھے ہوؤں کی سمجھ میں نہیں آیا۔ انہوں نے استفسار کیا تو حضرت نے کہا کہ جو صفات تم لوگوں پر سالوں کی محنت کے بعد پیدا ہوتی ہیں وہ صفات اس نوجوان میں اللہ نے ایک جھٹکے میں پیدا کر دیں''۔ (۱)۔

عشق یا محبت ایک راستہ ہے پستی سے بلندی کا، پاتال سے آسمان تک کا اسفل السافلین سے اعلیٰ علیین تک کا۔ پس جس دل نے محبت کا ادراک کرلیا، جس دل میں عشق کے بیج نے اپنی جڑیں نکال لیں، جس نفس نے محبت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا خواہ اس کا محبوب اس کی اپنی دنیا کا کوئی متنفس ہی کیوں نہ ہو، اس کیلئے حقیقت کو پہچاننا اور خالق حقیقی تک پہنچنے کے لئے تگ و دو کرنا آسان ہو جاتا ہے شرط یہ ہے کہ اس محبت میں ہوس کا شائبہ نہ ہو ورنہ

ہوس کی کارستانی اسے اسفل السافلین میں گرائے بغیر چین سے نہیں بیٹھے گی۔خالص محبت خواہ وہ مجاز ہی کی کیوں نہ ہو، ابتداء ہے حقیقت سے تعلق کی، ہر محبت یا عشق کا پہلا مرحلہ صوفیائے کرام، فلسفیوں، دانشوروں اور عشق کے جانکاروں کے نزدیک ''العلاقہ'' کا ہے جس سے مراد تعلق ہے، جان پہچان ہے، شناسائی ہے، سو مجاز سے شناسائی حقیقت سے شناسائی کی بنیاد بن سکتی ہے، شرط وہی ہے کہ پیش نظر ہوس نہ ہو۔کم نصیبی ہے کہ متاخرین اور حال کے دور میں جنسی ہوس کو محبت یا عشق کے مترادف سمجھ لیا گیا ہے۔حالانکہ محبت کبھی برائی نہیں ہوسکتی اور ہوس کبھی خیر نہیں بن سکتی۔محبت کا ایک قطرہ دریا میں تبدیل ہوسکتا ہے، سمندر بن سکتا ہے، محبت کا ایک ذرہ صحرا کی وسعت کو اپنے اندر سمیٹ سکتا ہے، دنیا کی کوئی اور قوت ایسا نہیں کرسکتی صرف محبت ہی ایسی قوت ہے جس کیلئے یہ سب ناممکنات، ممکنات میں تبدیل ہوسکتے ہیں: بقول صائبؔ

چگونہ قطرۂ دریا محیط دریا شد
زراہ فکر رسیداں بذات ممکن نیست

ترجمہ: عشق میں ایک قطرہ اپنے محیط میں ایک دریا کا روپ دھار سکتا ہے، لیکن سوچ، فکر یا علم کے زور پر ایسا کرنا ممکن نہیں۔

بعض اکابر صوفیاء مثلاً حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور چشتی سلسلہ کے دیگر بزرگ ایسے بھی گذرے ہیں جو نہ ظواہر شریعت کی تعلیم دیتے تھے اور نہ سلوک کے راستوں یا طریقت اور معرفت کی تعلیم دیتے تھے جو کوئی ان سے پوچھتا تھا 'میرے لئے کیا ارشاد ہے؟' تو ہر ایک کو ایک ہی جواب ملتا تھا: ''محبت کرو، جب محبت کی اصلیت سے واقف ہو جاؤ گے تو ظاہر اور باطن، صورت اور معنی، جسم و روح سب کی اصلاح ہو جائے گی۔محبت اصل حیات اور مقصود حیات ہے، محبت، مغز حقیقت ہے باقی سب خول ہی خول اور چھلکا ہی چھلکا ہے۔عبادت و طاعت اور محاسن اخلاق اگر محبت سے بیگانہ ہوں تو وہ ایک بے روح ڈھانچہ بن کر رہ جاتے ہیں۔

عہد حاضر میں جس جذبے کو عشق یا محبت کا نام دیا جاتا ہے وہ سراسر ہوس کا کاروبار ہے، اگر یہ نام نہاد محبت کسی متنفس سے ہے تو اس کا مقصد جنسی ہوس کی تسکین کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ یہ وہی جذبہ ہے جس کے متعلق مولانا روم فرماتے ہیں:

ایں نہ عشق است ایں کہ در مردم بود
ایں فساد از خوردن گندم بود

ترجمہ: میں جس عشق کی بات کرتا ہوں یہ وہ عشق نہیں یہ تو شباب اور اسباب خورد و نوش سے پیدا شدہ مستی ہے۔

اسی مضمون کو ہندوستان میں عہد شاہجہاں کے آخری دنوں اور اورنگزیب عالمگیر کے اوائل عہد کے ایک شاعر اور مجذوب سرمد شہید: (سرمد شہید کاشانی ہندی (کاشان، آرمینیا۔ ۱۵۹۰۔۱۶۶۱ء) نے اپنی ایک معروف رباعی میں اس طرح بیان کیا ہے

سرمد غمِ عشق بوالہوس را ندہند
سوزِ دلِ پروانہ، مگس را ندہند
عمرے باید کہ یار آید بکنار
این دولت سرمد ہمہ کس را ندہند

ترجمہ: ''اے سرمد غم عشق (جیسا قیمتی تحفہ) ہوس کے غلام کو نہیں جاتا۔ پروانے کے دل کا سوز (گندگی پر منڈلانے والی) مکھی کو عطا نہیں ہوتا۔ یار سے وصل (انتظار وصل یار) کیلئے ایک عمر درکار ہوتی ہے اے سرمد یہ آفاقی دولت ہر کسی کو نہیں عطا ہوتی''۔ (۲)

محبت ایک قوت ہے ایک اعلیٰ قدر ہے، یہ کوئی سرسری، وقتی لذت نہیں، نہ یہ ہوسنا کی ہے بلکہ محبت تو ظلمت سے نور کا ڑھنے والی صفت ہے۔ محبت اندھیری راتوں میں روشنی کی کرن ہے۔ ہوس کو محبت یا عشق کا نام دینا ظلم ہے۔ یہ نہیں کہ عشق یا محبت افراد سے نہیں ہوسکتی ،محبت انسان کو انسان سے بھی ہوسکتی ہے، اور اس سے علاوہ بھی، مظاہر فطرت سے، پھولوں سے، رنگوں سے، ترنم سے، صدائے گلو سے، پرندوں سے، ان کی آوازوں سے، پہاڑوں

سے، دریاؤں سے، مناظر فطرت سے، مجرد تصورات سے، حتیٰ کہ خود اپنے آپ سے بھی عشق ہوسکتا ہے (جسے ادبی اصطلاح میں نرگسیت کا نام سے موسوم کیا جاتا ہے) جس متنفس یا منظر یا کوئی مجرد جذبہ جس کسی سے بھی انسان کا لگاؤ ہو جائے اور وہ عشق کے درجے تک پہنچ جائے، وہی راہ سلوک محبت کا راہی ہے۔ جیسا کہ حسرت موہانی نے کہا:

مرحبا اے حسن غم اے یادگار عشق دوست
جان و دل تیری بدولت شاد ہیں آباد ہیں

حکیم فیثا غورث کے متعلق ایک حکایت عام ہے کہ وہ قائمۃ الزاویہ تکون کے ایک مسئلے میں الجھا ہوا تھا اور ایک صحرا میں اپنے ہاتھوں سے ریت پر مثلثیں بنا بنا کر ان کو مٹا رہا تھا، پاس سے ایک بڑا کارواں گذر گیا اور کارواں سے اڑتی ریت ان اس کے آدھے جسم کو ریت سے ڈھک دیا لیکن اسے احساس تک نہیں ہوا۔ جب اس نے قائمۃ الزاویہ مثلث کے رقبے کا مسئلہ حل کر لیا تو خوشی سے نعرے مارنے لگا ایسے میں کسی درماندہ راہرو نے اسے پوچھا کہ کیا یہاں سے کوئی قافلہ گذرا ہے تو اس نے بے خبری کا اظہار کیا۔ وہ اپنے علمی مسئلے کے عشق میں گرفتار تھا۔ اسے آس پاس کی کیا خبر؟۔ وہ تو فنافی العشق تھا۔ عشق جب مجردات سے متعلق ہو تو ایسے محیر العقل کارنامے سرزد ہوتے ہیں کہ جن پر پوری نسل انسانی فخر کرتی ہے۔

مجنوں کے بارے میں ایک حکایت ہے کہ وہ لیلیٰ کے تصور میں جا رہا تھا اسی اثنا میں وہ ایک عبادت گذار زاہد کے سامنے سے گذرا، زاہد نے اس کو پکڑ لیا اور اپنی عبادت میں خل اندازی پر اس کی باز پرس کرنے لگا تو مجنوں نے جواب دیا میں لیلیٰ سے پیار کرتا ہوں میں اسی کے تصور میں پھر رہا تھا مجھے تو تو نظر نہیں آیا، بھلا تو اپنے معبود کی کیسی عبادت کر رہا تھا کہ تجھے تیرے معبود کی بجائے میں نظر آ گیا؟

عشق میں رفت و بود نہیں۔ عشق لافانی جذبہ ہے۔ امر ہے۔ عشق ہوتا ہے یا نہیں ہوتا اگر ہوتا ہے تو مستقل ہوتا ہے ہاں اس میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے بالکل ایمان کی طرح۔ عشق جب کسی شخص پر طاری ہوتا ہے تو وہ خود سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ اپنے اردگرد سے بے پرواہ

ہوجاتا ہے۔ یہ حالت عارضی یا لحاتی نہیں، مستقل ہوتی ہے۔

عشقت نہ سرسریت کہ ازسر بدر شود
مہرت نہ عارضیست کہ جائے دگر شود
عشق تو در وجودم و مہرتو در دلم
با شیر در دروں شد و باجاں بدر شود
دردیست دردِ عشق کہ اندر علاجِ او
ہر چند سعیٔ بیش نمائی بتر شود
اول منم یکے کہ دریں شہر ہر شبے
فریادِ من بگنبدِ افلاک بر شود

(۳)

ترجمہ

:۱۔ تیرا عشق سرسری نہیں کہ سر سے باہر نکل جائے (عشق کا سودا ختم ہوجائے) نہ تیری محبت عارضی ہے کہ کسی اور جگہ چلی جائے (تیرا عشق دائمی ہے اور تیری محبت ازل سے ابد تک قائم رہنے والی ہے۔

۲۔ تیرا عشق میرے وجود میں ہے اور تیری محبت میرے دل میں ہے یہ دونوں چیزیں ماں کے دودھ کے ساتھ (میری پیدائش سے ہی) میرے اندر داخل ہوئیں اور جان کے ساتھ باہر نکلیں گی

۳۔ دردِ عشق ایک ایسا درد ہے کہ اس کے علاج ومعالجے میں تو جس قدر کوشش کرے گا یہ درد اتنا ہی بڑھتا چلا جائے گا ۴۔ اس شہر میں، میں پہلا شخص ہوں کہ ہر رات میری فریاد آسمانوں سے بھی پرے جاتی ہے، یعنی میری آہ نیم شبی عرش تک کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ (اور یہ شرف صرف مجھ ہی کو حاصل ہے)۔۔

حوالہ جات

۱۔(بحوالہ ''اللہ کے سفیر'' : محی الدین نواب)

۲۔سرمد شہید ہندی: کاشان ا ایران میں ایک یہودی یا عیسائی (آرمینیائی) کنبے میں ۱۵۹۰ء کو پیدا ہوئے، بڑے ہوئے تو انہوں نے اسلام قبول کیا۔وہ ایک تاجر پیشہ کنبے کے فرد تھے انہیں عربی اور فارسی پر دسترس تھی اور ان دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔وہ عہد شاہجہان میں بغرض تجارت ہندوستان آئے راستے میں ٹھٹھہ کے مقام پر ایک ہندو لڑکے 'ابھے چند' کے عشق میں گرفتار ہو گئے۔اس عشق نے انہیں اتنا وارفتہ کیا کہ وہ خود سے بیگانہ ہو گئے، انہیں اپنا اور اپنے گردوپیش کا احساس تک نہ رہا۔اسی عالم میں انہوں نے عشق مجازی سے عشق حقیقی کا سفر بہت سرعت سے طے کیا، اپنی حالت جذب میں جب وہ دلی پہنچے ان کی بطور صوفی شہرت دلی تک پہنچ چکی تھی جب وہ دلی پہنچے تو ولیعہد داراشکوہ نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔داراشکوہ ان کا بہت خیال رکھتا تھا۔ تصوف ان کا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔ وہ برہنہ رہتے تھے۔انہیں ''نانگا'' یعنی مجذوب پکارا جانے لگا۔ وہ کلمے کا ابتدائی حصہ ''لاالہٰ'' پکارتے تھے جس پر عہد اورنگزیب کے تیسرے سال ان پر گرفت ہوئی اور انہیں ۱۶۶۱ء(۱۰۷۰ھ) میں سزائے موت دے دی گئی ان کا مزار جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں کے پاس ہے۔ان کا فارسی کلام دستیاب ہے اور ''رباعیات سرمد'' کے نام سے معروف ہے۔ان کی رباعیات میں ''عشق ، بنیادی موضوع ہے۔(ان رباعیات کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر ظہور الحسن شارب نے کیا اور دہلی سے شائع ہوا)

(''تذکرۂ اولیائے پاک وہند'' و''خم خانۂ تصوف '' مرتبہ: ڈاکٹر ظہور الحسن شارب)

۳۔حافظ شیرازی علیہ الرحمہ ۔ دیوان حافظ غزل ردیف ' د '

عشق وہوس ایک تقابل:

سرمد غمِ عشق بوالہوس را ندہند
سوزِ دلِ پروانہ، مگس را ندہند
عمرے باید کہ یار آید بکنار
این دولت سرمد ہمہ کس را ندہند
(سرمد شہیدؒ ہندی)

ترجمہ: اے سرمد غم عشق (جیسا قیمتی تحفہ) ہوس کے غلام کو نہیں جاتا۔ پروانے کے دل کا سوز (گندگی پر منڈلانے والی) مکھی کو عطا نہیں ہوتا۔ یار سے وصل (انتظار برائے وصل یار) کیلئے ایک عمر درکار ہوتی ہے اے سرمد یہ آفاقی دولت ہر کسی کو نہیں عطا ہوتی۔

ابھی ہم محبت کے تذکرے میں ''مجاز سے حقیقت تک'' کے عنوان پر گفتگو کر رہے تھے۔ یہ عشق کی راہ سلوک ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس میں آلودگی کا شائبہ بھی نہ ہو۔ دراصل حسن اور عشق، حسن ازل اور عشق دو بنیادی تصورات ہیں۔ اہل حال کے نزدیک عشق وہ جذبہ نہیں جسے عرف عام میں ہوس کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کیلئے ہمیں لفظ یا اصطلاح عشق کے موجدین کی طرف دیکھنا چاہئیے کہ وہ عشق سے کیا مراد لیتے ہیں۔ ان حضرات کی آراء کا مختصر سا جائزہ لیا جا چکا ہے جن کے ہاں عشق اس زینے کا نام ہے جو حسن ازل تک پہنچنے کیلئے لازم ہے یہی وہ جذبہ ہے جو کائنات میں ہر کہیں موجود نظر آتا ہے۔ بیج سے نہال، نہال سے شجر، شجر سے اس کے پھول، پھل۔ پھولوں کے رنگ، رنگوں کا تنوع، دیدہ زیبی، دلفریبی، ان کی خوشبوئیں، سبزہ، سبزے کی دلکشی اور ان سب کے ذریعے ان کے خالق جو ہر مخلوق کا خالق ہے، اس کی پہچان۔ اس تک رسائی کی تڑپ، یہی تو عشق ہے۔ اور اس عشق میں کہیں

بھی جنسی ہوس کا شائبہ تک نہیں۔عشق کا متضاد رویہ ہوس ہے جسے ہمارے کثرت سے اردو اور فارسی کے شعراء عشق کت مترادف کے طور پر استعمال کرتے آئے ہیں اور یہ مذموم کوشش آج تک جاری ہے۔اصل یہ ہے کہ ہوس کو عشق سے تعبیر کرنا بلکہ ہوس کو عشق کے قریب ترین بھی خیال کرنا عشق کی توہین ہے۔ایسے ہی نام نہاد عشق کے بارے میں مولانائے روم علیہ الرحمہ تنبیہاً فرما گئے ہیں

ایں نہ عشق است ایں کہ در مردم بود
ایں فساد از خوردن گندم بود

فرماتے ہیں: شباب اور شکم پروری یا پرشکمی کی پیدا شدہ مستی کو وہ عشق سمجھنے کی غلطی نہ کرنا جس عشق کا میں پرچار کرتا ہوں ان دونوں کیفیتوں میں کوئی مناسبت نہیں یہ معدے میں پہنچی ہوئی گندم کی کارستانی ہے۔یہ ہوس ہے جس کا عشق سے کوئی تعلق نہیں۔

علامہ اقبال زبور عجم میں ارشاد فرماہیں:

رمز عشق تو بہ ارباب ہوس نتواں گفت
سخن از تاب تب شعلہ بہ خس نتواں گفت

ترجمہ: اے خدا تیرے عشق کا بھید ہوس کے مارے ہوئے لوگوں کے سامنے نہیں کھولا جا سکتا شعلے میں موجود تڑپ کی بات گھاس کے تنکے سے کہنا فضول ہے کیونکہ وہ اس تڑپ سے ناآشنا ہے۔ (۱) اقبال،علامہ کلیات اقبال فارسی زبور عجم

جب تک شعلے کی تڑپ اس تنکے تک نہیں پہنچے گی اسے اس جلن اور تڑپ کا احساس کب ہوگا۔اہل ہوس کی مثال تنکے کی ہے،ایک تنکے کی طرح وہ شعلے کی تڑپ کا احساس تک نہیں کر سکتا۔عشق کسے کہتے ہیں؟ اہل ہوس اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ وہ تو لمحاتی تلذذ ہی کو زندگی کی اساس سمجھتے ہیں۔ یہ جسمانی تلذز ہی ساری حیات کا نچوڑ تو نہیں ہوسکتا۔حسن کو خراج یہ نہیں کہ پھول کو شاخ سے توڑ دیا جائے اور اپنے لباس کی زینت بنالیا جائے بلکہ اسے دیکھتے رہنا،اس کے رنگ کو دل کے اندر محسوس کرنا اور اس کے رنگوں کے احساس سے دنیا کو

رنگوں میں تبدیل کرنے کی سعی کرنا عشق کی منزل ہے۔ عاشق اہل نظر ہے۔ حساس دل کا مالک ہے اسے کسی کو تکلیف میں دیکھنا تکلیف دیتا ہے اسے دوسروں کو خوشی دینا خوش کرتا ہے اہل نظر تو دنیا میں پھیلے بکھرے ہوئے حسن کو حسن ازل کا پرتو خیال کرتے ہوئے خالق حسن کا تصور ذہن میں لاتے ہیں۔ فقط چہرے کے حسن اور شباب کو خمر کی لذت میں ڈوب کر اپنی جنسی خواہش کی تکمیل کا ذریعہ گردانے کی کوشش نہیں کرتے۔ جیسا کہ جوش ملیح آبادی حضرت علامہؒ پر طعن کرتے ہوئے ''عشق'' کے بارے میں کہتے ہیں کہ عشق:

اک جنس کا میلان ہے اور کچھ بھی نہیں
اک جسم کا ہیجان ہے اور کچھ بھی نہیں
اے مرد خدا روح سے کیا عشق کو کام
یہ خون کا ارمان ہے اور کچھ بھی نہیں

حقیقی شعراء جو خیالی باتوں میں کھوئے ہوئے نہیں ہوتے، جو قرآن پاک کی سورۃ الشعراء میں بیان کردہ ''وادٍ یھیمون' میں نہیں بھٹکتے اور جن کے پیرو ''یتلاومون'' اور ''ھم الغاوون'' کی زد میں نہیں آتے وہ قوموں، تہذیبوں کے عمارت گر اور انقلابات کے نقیب ہوتے ہیں۔ عورت ان کے اعصاب پر سوار نہیں ہوتی۔ سرسید، حالی، اکبرالہ آبادی اور علامہ شبلی کا زمانہ ایسا زمانہ تھا جب ایک انقلاب کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ انہیں محسوس ہوا کہ وہ طبقہ جو معاشرے پر اثر پذیر ہو کر انقلاب کے حجابات دور کر سکتا ہے وہ ایک طرح کی غلط روش پر ہے اور اسی کو اپنی کامیابی خیال کر رہا ہے تو انہوں نے اپنے شعروں، اپنی نثری نگارشات، اپنے مکتوبات کے ذریعے ان کے احساس کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہوئے۔ اقبال نے ایک نسبتاً بلند جگہ سے انقلاب کو آتے ہوئے دیکھا اور قوم کے اصحاب فکر کو، دانشوروں کو حالت سکر میں دیکھا تو تڑپ اٹھے اور یہ کہنے پر مجبور ہوئے۔

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
ہائے بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

تو جوش صاحب نے اسے اپنے لئے چیلنج سمجھا انہوں نے فوراً اپنے خیالِ سوء کا دفاع کرنا ضروری سمجھا اور کہا:

سوئے ہوئے فتنوں کو جگا دیتی ہے
جاگے ہوئے ذہنوں کو سلا دیتی ہے
جس قوم کے اعصاب پہ عورت ہے سوار
وہ عقل سے عشق کو بڑھا دیتی ہے

جوش صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ عورت دراصل عشق کے علمبرداروں کے اعصاب پر سوار ہے کہ وہ عشق کو عقل پر ترجیح دے رہے ہیں۔ ''ہند کے باقی شاعر وصورت گر وافسانہ نویس'' جن کا موضوع عورت، اس کی جنسی کشش، جسم فروشی، مردوں کو للچانے کی ادائیں وغیرہ ہیں، وہ بیچارے تو معصوم ہیں۔

جیسا جوش ملیح آبادی کا خیال یا استدلال ہے عشق جنس کا میلان، جسم کا ہیجان یا جنسی تسکین کا سامان ہے اور اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں لیکن عشق حقیقی کے مذہب کو ماننے والے شعراء بالخصوص مولانا روم اور علامہ اقبال کے ہاں عشق اس سے بالکل متضاد معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اقبال نے جس طرح عشق کی عظمت کے گیت گائے ہیں۔ اقبال کی معرکۃ الآرا نظم ''مسجد قرطبہ'' میں عشق کا زوردار بیان علامہ کی اصطلاح ''عشق'' کی تشریح کیلئے کافی ہے۔

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات، موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

عشق دم جبرئیل، عشق دل مصطفیٰؐ
عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکر گل تاب ناک
عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاُس الکرام
عشق فقیہہ حرم عشق امیر جنود
عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام
اے حرم قرطبہ عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت وبود

عشق ایک مقدس جذبہ ہے۔اس میں بوالہوس کا کردار کہیں دور دور تک نہیں بولہوس اور عاشق کے درمیان امتیاز کرنے کیلئے غالبؔ نے بھی کہا تھا:

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

عشق اور ہوس میں زمین آسمان کا فرق ہے:عشق و ہوس کے تقابلی مطالعے سے جو فرق ذہن میں آتا ہے اس کا سرسری جائزہ حسب ذیل ہے:

ا۔ ہوس ایک لمحاتی، جذباتی اور وقتی کیفیت کا نام ہے۔اس کا نتیجہ بھی ایک ذاتی اور لمحاتی لذت کے سوا کچھ نہیں۔

☆۔عشق کل وقتی اور ہمہ جہتی جذبے کا نام ہے اور اس کے اثرات زمانوں پر محیط ہوتے ہیں۔اس سے افراد (جامۂ حیوانیت اتار کر) انسان بنتے ہیں،قومیں سنورتی ہیں تہذیبیں اثر قبول کرتی ہیں۔اور اپنے لئے درست سمت کا تعین کرتی ہیں اس کا اثر ذاتی کی بجائے کائناتی یا آفاقی ہوتا ہے۔

۲۔ ہر بوالہوس اپنی ہوس کا قیدی ہوتا ہے جو ایک بے نام اور وقتی لذت کا منتظر رہتا ہے، ہوس جس دل کو گھیر لیتی ہے اسے طول امل کا شکار کر دیتی ہے جس کا مکروہ انجام طے ہے یعنی

موت۔اور موت کے بعد بھی اس ہوس کی سزا اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔

☆۔عشق نہ کسی کی قید میں رہا ہے، نہ یہ کسی کو قید کرتا ہے عشق ایسا عالم ہے جس میں ہر کوئی اپنی خوشی، اپنی رغبت اور حسن کی رضا سے داخل ہوتا ہے عشق جس دل میں اپنا گھر بسالے، وہ دل قیمتی بن جاتا ہے ایسے دل کو ساری کائنات اور کائنات کا خالق محبت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اسے موت نہیں آتی وہ محض ایک جہاں سے ایک اور جہاں میں منتقل ہوتا ہے۔ جہاں ہر قدم پر اس کی پذیرائی ہوتی ہے۔**یا ایتھا النفس المطمئنة 0 ارجعی الیٰ ربک راضیة مرضیه 0 فاالد خلی فی عبادی والدخلی جنتی 0 .(۲)**

ترجمہ: (اور کہا جائے گا) اے نفس مطمئنہ اپنے رب کی طرف چل ایسے حال میں کہ وہ تم سے راضی اور تم اس سے راضی۔ پس میرے خاص بندوں میں داخل ہو جاؤ اور جنت میں چلے جاؤ.....

۳۔ہوس زمان و مکان کی محتاج ہوتی ہے اور کسی لمحے بھی وہ ان کی قید سے باہر نہیں جا سکتی۔ایک ہوس کار ایک نسبتاً بوڑھی عورت کی جانب راغب نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ ایک خاص قسم کی، اپنی پسند کی شکل وصورت، اور اپنی پسند کے ماحول کا طالب ہے۔

☆۔عشق زمان و مکاں سے ماوراء ہے اسے نہ کبھی زمانہ پابند کرسکتا ہے نہ حدود، عشق ایک لمحے میں، ایک ہی جست میں زمین و آسمان کی حدود پھلانگ سکتا ہے، سفر میں بارہ برس گذارنے کے باوجود بستر گرم رہ سکتا ہے اور دروازے کی کنڈی ہلتی رہ سکتی ہے، سو سارے زمانے عشق کے اپنے زمانے ہیں اور خود عشق ایک آن بسیط کا مالک۔ (۳)

عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

۵۔ہوس ایک عام بے قیمت پتھر ہے جو ہر کہیں پایا جاتا ہے۔اور اکثر سنگ ریزوں کی صورت میں پاؤں کی ٹھوکر میں رہتا ہے۔

☆۔عشق ایک قیمتی موتی ہے لعل ہے جوہر ہے، بلکہ سنگ پارس ہے۔خود بھی انمول

ہے اور جس سے مس کر لے اسے بھی انمول کر دیتا ہے۔ جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا:

عشق کی ہستی سے ہے ، پیکرِ گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کأس الکرام

۴۔ ہوس کا تعلق صرف اور صرف جسم سے ہے، جس پر وقت اپنے اثرات چھوڑتا ہے۔ شباب جلد ہی پیری میں ڈھل جاتا ہے قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں، جسم ڈھلک جاتے ہیں ۔ایسے عالم میں اسیر ہوس سخت مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہوس کو جسمانی قوت کی اشد ضرورت ہوتی ہے، اس کے علاوہ موافق ماحول کی بھی، ہوس شباب میں زیادہ کارفرما رہتی ہے ضعیفی اور نحیف جسم اس کیلئے بڑی رکاوٹ ہیں۔ اور ہوس کار بالآخر یہ کہہ کر دل کو تسلی دیتا ہے:

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

(۴)۔

☆۔ عشق کا تعلق روح سے ہے، جس پر وقت کبھی اثر انداز نہیں ہو سکتا اس لئے کہ روحیں وقت کی تخلیق سے بہت پہلے معرض وجود میں آ چکی تھیں۔ نیز عشق ایک مقناطیسی قوت ہے جو مسلسل ترقی پذیر رہتی ہے۔ جس کی رفتار یا کشش پہلے پہل کم اور آہستہ آہستہ زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ ضعیفی اور نحیف و نزار جسم اس کیلئے ہرگز ناموزوں نہیں۔ عشق اپنے آخری مدارج بہت تیزی سے طے کرتا ہے، وقت یا ضعف جسمانی اس کیلئے کوئی رکاوٹ نہیں۔

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات، موت ہے اس پر حرام

(۵)۔

اس عنوان کے آخر میں علامہ اقبال کے ارشادات بحوالہ عشق اس بات کے گواہ ہیں کہ علامہ عشاق کو نصیحت کرتے ہیں کہ اپنے جذبہ عشق کو ایسے لوگوں کے سامنے نہ بیان کریں جو عشق کے رمز شناس نہ ہوں۔ ہوس پرستوں کی محفل میں عشق کا تذکرہ کرنا سعیٔ لا حاصل ہے:

علامہ فرماتے ہیں:

اے درد عشق ہے گہر ِ آبدار تو
نامحرموں میں دیکھ نہ ہو آشکار تو
پنہاں تہ ِ نقاب تری جلوہ گاہ ہے
ظاہر پرست محفل نو کی نگاہ ہے
پنہاں درونِ سینہ کہیں راز ہو ترا
اشکِ جگر گداز نہ غماز ہو ترا
گویا زبان شاعر رنگیں بیاں نہ ہو
آواز نَے میں شکوۂ فرقت نہاں نہ ہو
یہ دور نکتہ چیں ہے کہیں چھپ کے بیٹھ رہ
جس دل میں تو مکیں ہے وہیں چھپ کے بیٹھ رہ

حوالہ جات

۱۔علامہ اقبال زبور عجم غزل ۴۴ شعر(۱)

۲.. القرآن سورہ فجر؛

۳ ۔ اقبالؔ (بانگ درا)

۴۔مرزا غالبؔ: دیوان غالب

۵۔علامہ اقبالؒ بانگ درا

عشق

کبھی تنہائیِ کوہ و دمن عشق
کبھی سوز و سرور و انجمن عشق
کبھی سرمایۂ محراب و منبر
کبھی مولا علیؑ خیبر شکن عشق

اقبالؒ

باب سوم

مدارج عشق

۱۔ مدارج عشق اور مختلف ائمہ لغت

۲۔ مدارج عشق اور روشن ضمیر صوفیائے کرامؒ

مدارج عشق اور مختلف ائمہ لغت وتصوف

عشق فقیہہ حرم ، عشق امیر جنود
عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام

جب یہ کہا جاتا ہے کہ عشق کائنات میں روح کی طرح ہے اور اگر روح جسم سے خارج ہوجائے تو یہ مردہ لاش ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ، اپنے خالق کے وصل کیلئے تڑپ رہا ہے۔ تو یہ منزل کوئی ایک دم میں حاصل نہیں ہوسکتی اور نہ ایک ہی جست میں منزل تک پہنچا جا سکتا ہے۔ اس کیلئے اسے مختلف منزلوں، مختلف مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ بارش کا قطرہ جب بادلوں کے دوش پر سوار خشکی میں مختلف مقامات پر برستا ہے تو فوراً اپنی منزل (اپنی اصل) یعنی سمندر کی جانب لپکتا ہے۔ اور انتہائی دشوار مراحل سے گذر کر اپنی منزل سے بالآخر ہمکنار ہوجاتا ہے یہ وہ مقام ہے جب وہ اپنی انفرادیت کھودیتا ہے اور جزو، کل میں شامل ہوکر کل بن جاتا ہے، باقی مخلوق کی طرح اشرف المخلوق یعنی انسان بھی اپنے خالق حقیقی کے عشق میں مبتلا ہے۔ اور اگر اسے کوئی رہنما مل جائے تو اس کی رہنمائی میں عشق کی جو جو منازل وہ طے کرتا چلا جاتا ہے ان کی حقیقت اس راستے کے شناوروں نے بیان کی ہے، ان کے نام رکھے ہیں اور ان درجوں کی ترتیب بھی بیان کی ہے۔، جیسے مکتب میں مختلف درجوں کے نام ہیں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہر مضمون کی کلاسز، ان کے نصاب اور ان کے امتحانات کا نظام مقرر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ''عشق'' کا بھی ایک نصاب ہے اور اس کے درجے ہیں ان درجوں کی تعداد و ترتیب مختلف نظاموں میں مختلف ہے، یہ اس لئے ہے کہ سالک رہ عشق ان راستوں، ان منازل کو پہچان کر عشق کی منزل تک پہنچنے کا اہتمام کر سکے۔

ہماری اس دنیا کے مختلف خطوں کی مختلف زبانوں کے ادب میں عشق، محبت، حب، Love، پریم، پریت، پیار یا اسی قبیل کا جذبہ کسی اور نام سے ہمیشہ مرکزی مضمون رہا ہے۔ جب ہم انسانیت کی بات کرتے ہیں یا دنیا کی تخلیق سے اب تک زندہ رہنے والی اور مٹ جانے والی تہذیبوں کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو مختلف تہذیبوں کا نظام الاخلاق ضرور زیر بحث آتا ہے۔ اور لوگوں کے مابین مثبت تعلق، رشتے اور ایک دوسرے کیلئے محبت و پیار کو لازمی قرار دیا جاتا ہے۔ ادب، مذہب، تصوف کی بنیاد بھی محبت پر استوار ہوتی ہے لہٰذا یہ پیار، محبت ہر کہیں موجود ہے اور علمائے السنہ (phlologists) نے اس فلسفۂ محبت پر کام بھی بہت کیا ہے۔ ایک خیال ہے کہ دنیا کی تمام زبانوں میں سب سے طاقتور ادب عربی ادب ہے اور یہ کہ اس کی ادب کی بہترین تصویر ''معلقات'' میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ دنیا کی بہترین شعری نگارشات ہیں۔ ان سب کا مرکزی مضمون ''محبت'' ہے، اس کی ایک شکل ''الحب'' ہے

عربی لغت میں عشق کے مترادف لفظ '' **الحب** '' پر تحقیق کے بعد اس کے مدارج پر بھی بحث کی گئی ہے یہ کوئی ایک دم شروع ہو کر نتیجے تک پہنچنے والا جذبہ نہیں۔ اس کے مختلف مدارج، یا مراحل ذکر کئے گئے ہیں اور ہمارا زیر بحث موضوع ''عشق'' بھی عربی زبان ہی کا لفظ ہے۔ جیسا کہ شروع میں عرض کیا جا چکا ہے کہ ''الحب'' نے ''شدید المحبۃ'' اور شدید المحبۃ نے عشق کی جون اختیار کی۔ اسی عشق سے متعلق مختلف محققین نے مختلف مدارج یا مراحل مختلف ترتیبوں کے ساتھ بیان کئے ہیں عربی زبان و ادب میں عشق کے گیارہ مدارج ہیں۔ عربی لغت کے علاوہ مسلم صوفیائے کرام نے عشق الٰہی کے حوالے سے یعنی عشق کی حسن ازل (اللہ) کی جانب کشش اور مراجعت کے علیحدہ علیحدہ مدارج و مراحل گنوائے ہیں ان کا ایک سرسری مطالعہ پیش خدمت ہے۔

سب سے پہلے خالصتاً عشق کے حوالے سے ''**استودیو العربیہ**'' میں ثاقب حسین کی تحقیق کے مطابق ان مدارج کی ترتیب و تفصیل کچھ اس طرح ہے:

The 11 Stages of Love in Arabic

١(الهوىٰ)

(hawa) = Attraction

This is the beginning of love. The root verb (hawa) is used to describe wind, meaning to blow, suggesting that this love can arise suddenly, but is transient, not yet firm in the heart. The verb also means both to rise and to fall, indicating the unstable nature of attraction, and the possibilities for how this love might develop.

٢(العلاقه)

('alaqah) = Attachment

Love now becomes attached to the heart, and loses the transitory property of hawa. This is from the verb " a,leqa" to be attached to, to cling to, as in "Aleqa bissaub " the thorn clung to, got caught in, the garment, and similarly (aleqa be qalbehi bil hubba) love for her became attached to his heart.

٣۔ الكَلَف

(kalaf) = Infatuation

At this stage, the love begins to intensify. (Al kalef) is from the verb (Kalefa) , which means, amongst other things, to become red (in the face), suggesting that the love is now having a physical affect on the lover, and is related also to the noun (Kulfah)difficulty, distress, affliction.

٤۔العُشُقْ

(Al'ushuq) = Desire

Love now engulfs the heart of the lover entirely, and takes it as its residence, such that love and the heart in which it resides become intimately familiar with one-another. This love blinds the lover to any faults in the beloved. Words in Arabic beginning with the root letters (ain sheen..ash) convey various ideas associated with 'ishq:(Assha)to remain in the nest (a bird), (Asheba) to be covered by foliage, (Aashara) to become familiar with, (Ashayy) to become blind. The two root letters, (Ain) and Sheen , signify respectively the origin of something (the word Ain means spring, source), and diffusing throughout something (the manner of articulation of Sheen in Arabic phonetics is called (Al taffashi) diffusion. Thus, 'ishq is love which has discovered the source organ of love, the heart,and has diffused throughout

٥۔ الشغَفْ/ اللوعةُ / اللعاج

(sha'af, law'ah, li'aj) = Passion

The intensity of the love now starts to burn, but at this stage, the love is still pleasurable in the heart. Sha'af describes a state akin to that described by the English word passion, which comes from the Latin root passio (suffering), and is sometimes used with the Latin root in mind, such as in the Passion of Christ, but more often has more pleasurable connotations. Sha'af is from the root verb (Sh,afa) to spread tar on a camel, which is a remedy for camel mange; the Arabs believed that the camel experiences a pleasurable slight burning sensation as it is covered by the tar. This root

suggests also that this stage of love is a healing, beneficial stage for the lover, but the lover who transgresses this stage will start to feel the pangs of love.

٦۔ الشغف

-(shaghaf) = Affliction

The first stage of destructive, all-consuming love. The heart now begins to be devoured by the love, which begins with the (sha,aafa) outer covering of the heart. ?????? can also refer to a type of heart disease, which, if it spreads, and reaches the spleen, can kill the patient. This is the love that Zulaykha felt for Yusuf, described in the Quran as (Hubban Sha,afahu) he (Yusuf) has afflicted her heart with love.

٧۔ الجوٰی

- (jawaa)= Grief

The affliction which started with the outer covering of the heart, now takes over the entire heart, and results in an inner grief and sorrow. (ja,wa) has the meanings of consumption and chronic illness which puts the patient off food. These meanings derive from the phonetic properties of the first two root letters: the manner of articulation associated with the (jeem) is called (al shadata) , literally severity, and the point of articulation of the (wa o) is (aljaof) literally the void, as this sound emanates from deep in the throat. The root letters (Jao) are therefore used to indicate the empty inner depth of something, and often relate to destruction; from them we get words such as (jaaba) to hollow out, (Jaaha)- to destroy (property, livestock, wealth), (Jaa,sa) to kill someone in his

own house, (ja, aa) to be hungry, have an empty stomach, (jau fun) inside, interior, void, (jaa,la) to be routed in battle, (Jaam) vessel. Unlike shaghaf which preceded it, jawaa consumes the inner-most core of the lover.

۸۔ التیم

- (taym) = Enslavement

in Arabic is synonymous with (abd) slave, تیم hence we find in pre-Islamic Arabia the names Abdullah and Taymullah, both meaning Slave of God. The verb (taa,ma) to love therefore has the nuance of loving to the point where the heart is enslaved to the beloved. We have from this the related word (tay,ma ta) , which refers to a ewe which the owner keeps for himself, not allowing her to roam freely, and milks for himself alone, and slaughters when he so desires.

۹۔ التبل

- (tabl) = Malady

Love, which was once living pleasurably in the heart, having made it its home, now turns against the heart, and so overwhelms, confounds and bewilders it, that it is as though it were its enemy. The verb(ta ba la) means to pursue with enmity, to retaliate in vengeance, to destroy.

۱۰۔(التدلیه)

(tadleeh) = Disorder

When the heart is thus being destroyed from within, and begins to lose all sense of balance and reason, it goes into a state of chaos and disorder. (Mudallah) is used to describe a

man unable to pay attention to anything, in a state of complete distraction and perplexity, wandering to and fro without knowing the right course. The related verb (e dalla hum) means to be intensely dark, black (e.g. night).

(**الهيوم**)

- (huyum) = Insanity

The beginning of love was with hawa, from the dyadic root(Hu wa) , and the final stage is huyum, from the root (He ya) , suggesting, just as surely as the final letter of the Arabic alphabet (Ya) follows directly on from the letter (Wa o) , so (Al Huyume) insanity, the complete loss of reason, is the where the journey which began with (Al ha wa) attraction comes to its conclusion. Indeed the final letter of(Al Huyume) , the (Meem), suggests closure, its point of articulation being the lips, with the complete closing of the mouth. The indication of where the initial attraction was leading were there from the beginning: the verb (Ha wa) to be attracted to, can also mean to perish..... (1)

1."**استوديو العربيه**" ثاقب حسین

محبت میں مبتلاء شخص کن کن مراحل سے گذرتا ہے اس کا تذکرہ تفصیل سے دیا گیا ہے۔ یہ مراحل عشق مجازی کے ہیں۔ تاہم تھوڑی سی محنت کے بعد انہیں عشق حقیقی پر بھی منطبق کیا جا سکتا ہے جو ہمارا یہاں موضوع ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں عربی لغت میں ماہرین لغت نے کیا کیا مراحل یا مدارج بیان کئے ہیں۔ پہلے ان کی ترتیب پر نظر ڈالتے ہیں۔ ترتیب کچھ اس طرح ہے:

۱۔ **اَلْهَوىٰ** (کشش، تمنا،) ۔

۲۔ **اَلْعَلاقه** : (تعلق،تعارف،تجسس)

۳۔ **اَلْکَلَفُ** : (اضطراب ،بےچینی)
٤۔**اَلْعُشْقُ** (محبوب کے وصل کی شدید خواہش)
۵۔ **الشغَفُ / اللَوْعَةُ / اللعَاج** (استقامت، استقلال، صبر)
٦۔**الشغَفُ** (عشق کا شدید احساس اوراس کے شدید اثرات)
۷۔**الجوٰی** (ملال، پریشانی،اضطراب)
۸۔**التَّیم** (عبدیت، بندگی ، محبوب کی غلامی)
۹۔**التَّبْل** (جنون، دُھن Passion)
۱۰۔**التَّدلِیُه** (عدم ترتیب ،بےترتیبی،)
۱۱۔ **الهُیُوم** (مکمل دیوانہ پن)

ان مدارج کےعلاوہ **الصَبَوَة** (لڑکپن) ،**الوَجُد** (حالت بےاختیاری) ، **النجوی** (عبدیت) یہ لفظ التیم کا مترادف درجہ ہے، **الشوق** (سپردگی) ،**اُلوَصَب** (درد،احساس درد) یہ لفظ **الکلف** کے مترادف کے طور پر استعمال ہوا ہے، **الاستکانه** (بیمار صحت سے بےپرواہی)، **الوُدّ** (محبوب اورمحبّ کے درمیان دوری کا اختتام، بے خودی)، **اَلْخُلَّةٌ** (محبوب اورمحبّ کا ایک دوسرے میں گم ہوجانا،من تو شدم تو من شدی)۔ **الغَرام** (ایک دوسرے سے دوری کے تصور کا بطلان یا ایک دوسرے کے بغیر رہنے کو معدوم سمجھنا)،الهیام (الھیوم کا مترادف لفظ)

عشق حقیقی کے ضمن میں حضرات صوفیائے کرام،اولیائے عظام **علیهم الرحمه** نے ان کے علاوہ بھی مختلف مدارج بیان کئے ہیں ان کا تذکرہ آگے آرہا ہے سب سے پہلے ان گیارہ مدارج یا کیفیات کا تذکرہ کچھ اضافے کے ساتھ پیش خدمت ہے تاکہ ہمارے عربی سے ناآشنا حضرات مستفید ہوسکیں۔ان کو اس عظیم جذبے کو سمجھنے میں آسانی ہوسکے جو مشترکہ طور پر دنیا کی تمام زبانوں کے ادب (تمام داستانی ادب،افسانوی ادب شاعری وغیرہ) اور تمام مذاہب کے ماتحت تصوف کا موضوع رہا ہے۔

۱۔ **اَلھَوٰی** (کشش، تمنا،) ۔

یہ مرحلہ عشق یا محبت کا پہلا مرحلہ ہے۔ پہلا زینہ ہے یہ محبت کی ابتدا ہے عربی لغت میں ''الھویٰ'' کا لفظ ''ھوا'' سے مشتق ہے جو ہوا کے چلنے کیلئے مستعمل ہے۔ جیسے ہوا چل رہی ہے عشق یا محبت کا جذبہ دل میں اچانک بیدار ہوسکتا ہے۔ لیکن عشق یا محبت کس سے؟ کسی کو دیکھ لیا First sight love پہلی نظر کی محبت، کسی اللہ والے کے فیضان نظر سے، ایسے ہی کسی کی توجہ سے دل میں محبت کا بیج بو دیا گیا، ابھی وہ نہال نہیں بنا۔ بس ایک بجلی چمکی، اور اچانک اس سے کایا کلپ کا آغاز ہوا۔ بالکل ایسے ہی جیسے پہاڑوں پر بجلی کی چمک سے سیکنڈ کے سولہویں حصے میں زمین میں ہزاروں مشروم اگ کر بڑے ہو جاتے ہیں۔ تاہم عشق کا یہ مرحلہ ابتدائی مرحلہ ہے تھوڑی بہت خلش تو ہوتی ہے لیکن اس خلش کے اثرات کا احساس زیادہ نہیں ہوتا ابھی عشق کا استحکام دور فاصلہ پر ہے۔ محبت کی شمع جلتی ہے یا جلنے کیلئے آمادہ ہو جاتی ہے ابھی پوری طرح جلی نہیں ایک تجسس، تجسس محض۔ ایک جستجو کا احساس پیدا ہوا جستجو کا آغاز ہوا اور سفر عشق کی ابتدا ہوتی ہے یہ پہلا قدم ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

۲۔ **اَلعَلاقہ** : (تعلق، تعارف، تجسس)

یہ عشق یا محبت کا دوسرا مرحلہ ہے۔ دور حاضر کی بات کریں تو محبوب (تصور) کا تعارف حاصل کرنے کی جدوجہد، اس کا موبائل نمبر، نام پتہ، کوئی آئی ڈی وغیرہ حاصل کرنے کی جستجو، جس سے اس کے ساتھ کوئی تعلق قائم ہو۔ عشق حقیقی کی بات ہو تو کسی رازدار عشق کی جستجو جس سے محبوب کا پتہ دریافت کیا جاسکے اور اس سفر کے متعلق معلومات، زادراہ کا تعین وغیرہ دریافت کرنا۔ ''العلاقہ'' کا لفظ ''عَلِقَ'' سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں تعلق قائم ہوا یا اس نے چھلانگ ماردی ۔ جیسا کہ عربی میں ایک جملہ استعمال ہوتا ''عَلِقَ بِاالشَّوُبِ الشّوُک''، یعنی محبت کا کانٹا چبھ چکا ہے'۔ اسی طرح'' عَلِقَ بِقَلبِہٖ حُبَّھَا رحُبَّہٗ'' یعنی اس کے دل میں کسی کی (اللہ اور اس کے رسولؐ کی یا دنیاوی محبوب کی) محبت جگہ بنا چکی ہے۔

اس مرحلے میں عاشق کا محبوب سے تعلق قائم ہو جاتا ہے محبوب سے اس کا تعارف ہو

جاتا ہے، ایک طرفہ رابطہ ہو چکا ہے۔ یہ سفر عشق کا دوسرا قدم ہے۔ ابھی منزل واضح نہیں اس کا محض ایک ھیولہ سا ہے۔ شاید منزل کا بھی پوری طرح ادراک بھی نہیں۔

۳۔ اَلْکَلَفُ : (اضطراب ، بے چینی)

یہ عشق کا تیسرا مرحلہ ہے۔ اس مرحلے میں تجسس بڑھ جاتا ہے، ایک کسک سی پیدا ہونا شروع ہوتی ہے، ایک چبھن کا احساس شدید ہوتا جاتا ہے" **الکلف** ' فعل "کَلِفَ ' سے بنا ہے جس کے معنی چہرے کے سرخ ہو جانے کے ہیں۔ یعنی دوسرے اثرات کے علاوہ عشق کے اثرات چہرے سے مترشح ہونا شروع جاتے ہیں چہرے پر (درد کی شدت کے باعث) سرخی غالب آجاتی ہے۔ ''**الکلف** '' لفظ'' **کلفۃٌ** ' ' کی بھی دلالت کرتا ہے جس کے معنی، مشکل، تکلیف پریشانی اضطراب وغیرہ کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ عشق کے ابتدائی مراحل ہیں اور عاشق کی پریشانیوں کا آغاز ہو چکا ہے۔ ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا؟

٤۔ اَلْعُشُّقُ (محبوب کے وصل کی شدید خواہش)

یہ عشق کا چوتھا مرحلہ ہے۔ اس مرحلے میں محبوب کے وصل کی خواہش شدید ہو جاتی ہے۔ اب عشق کا جذبہ دل پر مکمل حاوی ہو چکا ہے اور دل کو اپنا مقام بنا چکا ہے، دل اور عشق ایک دوسرے سے آشنا ہو چکے ہیں۔ عشق دل کو اپنی جائے استقرار بنا چکا ہے۔ اور دل عشق کی مہمانی پر آمادہ ہو چکا ہے۔ دل اور عشق دونوں باہم دگر ہو چکے ہیں۔ دنیاوی محبت کی نظر سے دیکھا جائے تو عاشق کو اپنے محبوب میں ہر طرح کی خوبیاں نظر آرہی ہیں حتیٰ کہ اس کے عیوب بھی اس کے محاسن کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں لیکن معاملہ اگر عشق حقیقی کا ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے حسن ازل یعنی اللہ کی صفات کا ادراک ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور خود پر ذات الٰہی کے احسانات محسوس ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

عربی میں عشق تین حروف یعنی ''ع''، ''ش'' اور ''ق'' کا مرکب ہے۔ ان میں ہر حرف اور ان کی مختلف formations متعدد تخیلات کی نشاندہی کرتی ہیں۔ پہلے دو حروف کا مرکب ''عش'' ہے اور اس مطلب پرندے کا گھونسلے میں قیام کرنا ہے، "عَشِـــــب "

مطلب ہے خود کو ڈھانکنا یا ملفوف ہونا، " عـاشـر " مانوس ہونا، " عَشـی " کا معنی ہے اندھا ہونا، پہلے حرف " ع " عین کا مطلب آنکھ، پانی کا چشمہ یا بہتے پانی کا منبع ہے حرف " ش " کسی چیز کے شروع ہونے کی جگہ یا وجہ کی نشاندہی ہے۔ ان عربی حروف کے غنائی تاثر "التَّـفَشِّـی " کا مطلب ماؤف ہونا ہے یعنی محبت ایک ایسا جذبہ ہے جہاں عقل کا عمل دخل نہیں ہوتا۔ محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو محبوب سے مانوس اور اس کے ماسوا سے غیر مانوس یا اجنبی کر دیتا ہے یا اسے غیر محبوب سے بے پرواہ کر دیتا ہے۔ اسے اپنے محبوب کے علاوہ کہیں کچھ دِکھتا ہی نہیں،

ہجوم فکر میں ہوتا ہوں جب کبھی تنہا
مرے حواس پہ اک یاد اترنے لگتی ہے
کبھی تو شعر کی صورت کبھی وہ گیت مثال
مرے خیال میں تیری شبیہہ ابھرتی ہے

(۲)

وہ جہاں کہیں دیکھے اسے ہر طرف اس کا محبوب ہی دکھائی دیتا ہے۔ میر دردؔ کہتے ہیں

جگ میں آ کر ادھر ادھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

۵۔ الشغف / اللوعۃ / اللعاج (استقامت، استقلال، صبر)

عشق کا یہ مرحلہ استقامت کا مرحلہ ہے اب یہاں عشق کا امتحان شروع ہو رہا ہے، عشق دل میں راسخ ہو چکا ہے عاشق کو محبوب کی ہر ادا اچھی لگنی شروع ہو چکی ہے (شفیق راجہ)

مسکراہٹ ہو، تکلم ہو حیا ہو کہ غضب
ہر ادا اچھی لگی ہے سو یہی کافی ہے

دل محبوب کے فراق میں تڑپ رہا ہے وصل کی آرزو اپنے جوبن پر ہے یہاں عشق ''جنون' کا روپ دھار چکا ہے جیسا کہ ایک لاطینی یا انگریزی زبان کا لفظ Passion اس

کیفیت عشق بہتر بیان کرتا ہے۔" اَلشَّعَفُ " ایک دوسرے عربی لفظ "شَعَفَ" سے مشتق ہے یعنی بیمار اونٹ پر چادر پھیلانا۔عربوں میں دستور ہے کہ جب ان کے اونٹ ایک خاص قسم کی جلدی بیماری 'Mange" کا شکار ہوتے ہیں تو ان کے جسموں پر تارکول ملتے ہیں جس سے ان کو راحت ملتی ہے۔

جو راحت انتہائی تکلیف میں ان اونٹوں کو حاصل ہوتی ہے اسی طرح کی راحت عاشق کو اس اذیت میں ،تکالیف میں محبوب کے تصور سے ملتی ہے عاشق کو عشق کے ہر زخم پر ایک طرح کا سرور حاصل ہوتا ہے ایک لذت محسوس ہونا شروع ہو جاتی ہے۔عاشق ہر وقت محبوب کو اپنے آس پاس محسوس کرتا ہے, مومنؔ نے اسی مرحلے کی تصویر کشی کی ہے: (۳)

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

٦۔الشغَفُ (عشق کا شدید احساس اور اس کے شدید اثرات)

یہ مرحلہ وہ ہے جب عشق کرنے والا اپنے محبوب کے فراق میں گھل کر رہ جاتا ہے۔اور وہ تہیہ کرتا ہے کہ وہ اس کے حصول یا وصال کیلئے کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔وہ اپنی جان قربان کرنے سے بھی گریز نہیں کر سکتا۔عاشق کا دل لقمہ بنتا جا رہا ہے،عشق دل کو کھا رہا ہے اور اس کی ابتدا" شَغَافَ" سے ہوتی ہے۔شغاف عربی زبان میں دل کے باہر کے غلاف کو کہتے ہیں"شغاف" دل کی ایک بیماری کا نام بھی ہے۔اگر یہ بیماری بڑھ جائے تو تلّی کو بیکار سکتی ہے اس سے بیمار مر بھی سکتا ہے۔عزیز مصر کی بیوی حضرت یوسف علیہ السلام کے عشق میں اسی مرحلے کا شکار تھی۔جس کا ذکر قرآن میں سورہ یوسفؑ میں مذکور ہے " قَدْ شَغَفَهَا حُباً " (یقیناً وہ یعنی عزیز مصر کی بیوی حضرت یوسفؑ کے عشق میں مبتلا تھی)

عشق الٰہی میں حضرت ابراہیم ابن ادہمؒ کا حکومت پر لات مار دینا اور حضرت ابوبکر شبلیؒ کا گورنری کو چھوڑ کر عشق الٰہی میں مگن ہو جانا اور حضرت جنید بغدادیؒ کی بیعت میں سخت مراحل سے کامیابی سے گذرنا ،مولانا جلال الدین رومیؒ ،حضرت شاہ شمس تبریزیؒ کی توجہ سے فوراً

اسی درجے پر متمکن ہوئے اور انہوں نے آگے کا سفر انہی کے زیر سایہ کیا، یہ سب اسی شغف ہی کا درجۂ عشق ہے۔

۷۔الجویٰ (ملال، پریشانی، اضطراب)

یہ عشق کا ساتواں مرحلہ ہے۔الشغف سے ترقی کرتا ہوا یہ سفر اب الجویٰ تک آ پہنچا ہے۔ یہاں عاشق کو پریشانیوں، ملال اور اضطراب کے بادل زیادہ گہرے ہو جاتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ اس درجے میں عشق کا تاثر شدید ہو کر پورے دل کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ عاشق جسمانی طور پر کچھ لاغر لاغر سا ہو جاتا ہے۔ وہ کچھ کمزور کمزور سا لگتا ہے۔ وہ ایک دائم المرض فرد کی طرح ہو جاتا ہے۔ ایسے فرد کو کھانے پینے کا ہوش نہیں رہتا، اسے بھوک پیاس نہیں لگتی یہ کیفیت عشق کے پہلے دو الفاظ عین اور شین کے مرکب لفظ " عـــش " کے معانی کو بیان کرتی ہے۔لفظ " جـــویٰ " کا حرف ''ج'' مرض کی شدت اور سختی کو بیان کرتا ہے۔جیم واؤ کے ساتھ مل کر جَـــو ف بناتا ہے جس کے معنی ہیں ''مرگ تمام'' ۔گویا عاشق کی سانس اکھڑ چکی ہے اور وہ جان کنی کے عالم میں مبتلا ہے۔ یہ مرحلہ عاشق کی اندرونی توڑ پھوڑ (جسمانی عشق مجازی کے حوالے سے اور روحانی، عشق حقیقی کے حوالے) الشغف کے مقابل " الـجـویٰ'' کا مرحلہ عاشق کو جسمانی موت کے قریب تر کر دیتا ہے۔ ہماری کہانیوں میں کچھ عرصہ پہلے تک تپ دق اور عہد حاضر میں سرطان کے مرض سے عاشق کی اذیت کو Potray کیا جاتا ہے اور عاشق اس تمام تر اذیت کو نہایت خوشدلی کے ساتھ، سرور کے ساتھ برداشت کرتا ہے اسے یہ تکلیف مزہ دیتی ہے شاید اسی مرحلے کی کیفیات کے بیان کرنے کیلئے علامہ نے کہا تھا:: (۴)

جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں
ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزہ ہی نہیں

۸۔التّیم / النجویٰ (عبدیت، بندگی ، محبوب کی غلامی)

جو عاشق صادق گذرے مراحل کی سختیوں اور پریشانیوں سے گذر کر " التیـــم " کے

مرحلے میں داخل ہوجاتا ہے وہ اپنے آپ کو عشق کی غلامی میں دے دیتا ہے، عربی میں ''تَیم'' عبد یا غلام کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اسلام سے پہلے عبداللہ اور تیم اللہ ہم معنی نام تھے دونوں کا مطلب تھا اللہ کا بندہ۔ تامَ کا مطلب ہے آقا کیلئے گرویدگی۔ یہ وہ مرحلہ ہے جب عاشق کا دل مکمل طور پر محبوب کے قبضے میں چلا جاتا ہے۔ اس طرح کا ایک اور لفظ تیمۃ ہے جو اس بھیڑ یا بکری کیلئے بولا جاتا ہے جو صرف مالک کے تصرف میں ہو، اس کا دودھ صرف مالک کیلئے ہو اور وہ جب چاہے اسے ذبح کردے۔

کہوں یہ کیسے کہ میں اب بھی منتظر ہوں ترا
ترے خیال کا قیدی ترے حصار میں ہے
نہ اس کی سانسیں ہیں اپنی نہ تار جیون کے
ہر ایک لمحہ تری چاہ کے خمار میں ہے

(۵)

۹۔التَّبُل (دُھنّ جنون، Passion)

عشق کا یہ نواں مرحلہ ہے اور اس میں عشق یا محبت جو دل کیلئے ایک خوشگوار جذبہ تھا اب خود دل ہی کا دشمن ہوگیا ہے عاشق دل کی کوئی بات نہیں مانتا۔ دماغ یا عقل کو وہ پہلے راندۂ درگاہ قرار دے چکا تھا اب حریف دل بھی ہو چکا ہے۔ اس کا دل اس سے کہے وہ اس کے برعکس عمل کرتا ہے دل وصل کا خواہش مند ہے لیکن وہ وصل سے بھاگتا ہے اور اسے ہجر ہی میں قرار آتا ہے۔

خدا کرے کہ کبھی ختم ہو نہ ہجر کی شب
کہ وصل موت ہے یادوں کی دل ربائی کی
نہال ہوں کہ تری یاد کے حصار میں ہوں
خدا کرے کوئی صورت نہ ہو رہائی کی

(۶)۔

فعل " تَبَـــلَ " کا مطلب ہے دشمن کا پیچھا کرنا اسے تباہ کرنے کی نیت سے۔اب گویا عشق دل کا پیچھا اسے تباہ کرنے کی نیت سے کر رہا ہے۔

۱۰۔التّدلِیُه (عدم ترتیب ، بے ترتیبی،)

عشق کا یہ مرحلہ ایسا ہے کہ جب عاشق ماسوا سے بالکل بے خبر ہو جاتا ہے اسے نہ اپنا ہوش ہے نہ اپنے اردگرد کسی اور کا ہوش۔نہ اسے اپنے جسم کی خبر ہے نہ لباس کا پتہ، نہ کھانے کی فکر نہ پینے کا ہوش۔اس کا سارا نظام زندگی تلپٹ ہو کر رہ جاتا ہے۔کوئی تہذیب اور ترتیب نہیں رہتی اسے وقت کا احساس تک نہیں ہوتا اسے سردی گرمی تنگ نہیں کرتیں۔نہانا، منہ دھونا ، بالوں کی تراش خراش یہ سب قصۂ پارینہ ہیں۔وہ خالی الذہن نظر آتا ہے۔" مُـدلّـــه " ایسے شخص کے بارے میں بولا جاتا ہے جو مکمل طور خالی الذہن ہو۔وہ ہر چیز کو یوں دیکھتا ہے جیسے اس نے یہ چیز پہلے کبھی نہ دیکھی ہو۔اس پر تحیر کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔وہ حیرانی میں بغیر سمت کے تعین کے، آس پاس سے بالکل بے خبر ادھر ادھر گھومتا چلا جاتا ہے ڈولتا جاتا ہے۔ اس کے حواس پر مکمل طور پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔"اِدَلّهُـــمّ " کا مطلب ہے بالکل اندھیرا جیسے سیاہ رات۔ (۷)

نہ کوئی مقصد نہ کوئی منزل بھٹک رہا ہوں میں قریہ قریہ
گذرتی گھڑیو یہ آبلہ پا نڈھال آئے تو سوچ لینا

عشق حقیقی میں یہ مرحلہ بہت دیر سے آتا ہے۔یہ مرحلہ بے حد، شدید اذیت کا مرحلہ سہی لیکن منزل کے قریب ہونے کی نوید بھی ہے۔ لا الٰہ کی منزل آ چکی ہے اور الا اللّٰہ کی منزل قریب تر ہے۔اور یہی اس کیلئے قرب کی منزل ہے۔تاہم اسے ایک اور مرحلہ پاس کرنا ہے۔بس اس کے بعد منزل پر اس کی گرفت ہوگی۔اسے عشق کی سند عطا ہو جائے گی۔

۱۱۔ الهُیُوم / الهیام (مکمل دیوانہ پن)

عربی لغت کے اعتبار سے یہ عشق کا آخری مرحلہ ہے محبت یا عشق کی شروعات ''ھویٰ'' یعنی خواہش آرزو یا تمنا سے ہوئی تھی " ھـویٰ " ماخوذ ہے " ھـو " سے، سو محبوب کی تمنا،

اس سے ملنے کی آرزو اور اس کے وصل کی خواہش، عشق کا ابتدائی درجہ تھا عاشق اپنے پورے حواس میں تھا اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت تھی اب وہ مختلف مراحل سے گذرتا ہوا اس سخت ترین مرحلے میں داخل ہو گیا ہے۔ اور یہ درجہ " **الھیوم**" کہلاتا ہے۔ جو چار حروف، ھ، ی، و، م کا مرکب ہے 'ھ' اور 'ی' مل کر" ھی "بناتے ہیں، 'ھی' کی 'ی' اور ھیوم کی 'ی' عشق کے آخری درجے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ی کے بعد واؤ، سو " **الھیوم** " یعنی دیوانگی کا لفظ خود سے اور اردگرد سے مکمل بے خبری کی جانب اشارہ کرتا ہے بقول سراج اورنگ آبادی:

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

اس مرحلے میں علت و معلول، دلیل و سبب۔ سب ختم، سورج چاند ستارے اجالا اندھیرا سب بے مقصد، بس " ھو " باقی اس کے علاوہ سب فنا ۔ 'لا شئٌ اِلّا ھو' کا عالم ہے، تجسس سے شروع ہونے والا سفر اب تجسس سے تہی ہو چکا ہے۔

آنکھ ٹکٹکی باندھے ایک جانب خلا میں گھور رہی ہے، جسم آراستہ لباس سے بے نیاز، زبان پر چپ کا پہرہ لگ چکا ہے، ہونٹ حرکت سے گریزاں ہیں، اب عاشق خود معدوم ہے صرف عشق ہی عشق موجود۔ " **العشق نارٌ و تحرق ما سوا** "عشق آگ ہے اور اپنے سوا ہر کسی کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔

عشق نے اپنے سوا سب کچھ پھونک دیا عاشق کو بھی نہیں چھوڑا، تاہم اس کے جسم میں سانس کی ڈور ابھی ہل رہی ہے باقی کچھ بھی نہیں۔ زندگی اور موت کا فرق مٹ چکا ہے۔ حرکت اور سکون کا مطلب گم ہو چکا ہے۔ فنا اور بقا اب محض لفظ رہ گئے ہیں عاشق اور اس کے ساتھ اس کا سب کچھ عشق کی حقیقت میں گم ہو چکے ہیں۔ جیسا کہ غالب نے کہا:

از پیکرت بساطِ صفاہی خیال یافت
وصلِ تو از فراقِ تو نتواں شناختن

ترجمہ:''اب تو تیرے جسم کی موجودگی نے ہمارے بساطِ بزم کو تخیّل سی جلا بخش دی ہے،

اب ہر گوشۂ بساط میں تیری غیر حاضری سے تیری موجودگی کا احساس ہونے لگا ہے اطفراق و وصال کا امتیاز ہی اٹھ گیا ہے''۔

(عہد اورنگزیب عالمگیر میں) حضرت سرمد شہید ہندیؒ جنہیں اسلامی عدالت نے موت کی سزا دی جب انہیں تختہ دار پر لے جایا جا رہا تھا تو انہوں نے آسمان کی جانب دیکھا اور زور زور سے کہا:

''فدائے تو بشوم بیا، بیا کہ بہر صورتے می آئی، من ترا خوب می شناسم'' اور پھر یہ شعر پڑھا:

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقیست شبِ فتنہ، غنودیم

ترجمہ: میں آپ پر قربان ہو جاؤں آ جایئے، آپ جس صورت میں بھی آئیں، میں آپ کو ہر صورت میں بہت اچھی طرح پہچانتا ہوں۔

شعر : شور برپا ہوا اور میں خواب عدم سے جاگ گیا میں نے آنکھ کھول لی۔ پھر میں نے دیکھا کہ ابھی شب فتنہ (عرصۂ حیات) باقی ہے تو میں پھر سو گیا۔

پس یہی فنا یا بقائے دوام ہی عشق کا آخری مرحلہ ہے۔تمام عشاق صادق، تمام صوفیائے کرام اور اولیائے عظام (علیہم الرحمہ) نے حسن ازل کے عشق میں مبتلا ہو کر اسی منزل کی جستجو میں اپنی زندگیاں صرف کر دیں۔عشق کے یہ سارے مراحل، رہ عشق کے پل صراط کی مانند ہیں جس کے ذریعے کچھ پار پہنچ گئے ہوں گے اور منزل آشنا ہو چکے ہوں گے لیکن کچھ کٹ کٹ کر گرے بھی ہوں گے واللہ اعلم بالصواب۔

یہ نظام تو ایک لغوی اور معنوی نظام ہے اور یہ ترتیب بھی لغوی اور معنوی ہو گی لیکن حقیقی نظام شاید اس سے مختلف ہو۔لہٰذا اس منزل کے کامیاب مسافروں اور رہنماؤں نے اپنے اپنے تجربات سے کیا اخذ کیا ہے؟۔(منزل عشق کے ان مدارج کا ذکر اس کا ذکر اگلے صفحات میں آ رہا ہے)۔

۲۔مدارج عشق۔اور روشن ضمیر صوفیائے کرامؒ

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ عشق کی اصطلاح سب سے پہلے صوفیائے کرام ہی نے استعمال کی وہی اس تصور کے پہلے مصنف اور شارح ہیں۔انہوں نے ہی اس کے راستوں اور منازل کا تعین کیا اور عشق کے مدارج مقرر کئے۔ان مدارج کے نام ان مدارج کی صفتوں کے حوالے سے رکھے گئے۔تصوف کی دنیا میں چار سے زیادہ سلسلے ہیں ان میں سے ہر سلسلے کا نصاب،اس کی ترتیب،اور اس کی محنت کا انداز مختلف ہے۔اس طرح ان مجاہدات سے مرتب ہونے والے نتائج کا عرصۂ محنت اور اثرات وسندات مختلف ہیں۔تصوف کی دنیا میں عشق کے مدارج لاتعداد ناموں کے ساتھ کارفرما ہیں جیسا کہ علم معرفتِ عشق کی مفکر مختلف شخصیات نے ان مدارج کا تذکرہ اپنی اپنی تصنیفات میں کیا ہے:ان میں سے چند حسب ذیل ہیں:

(حضرت ذوقی شاہؒ :سردلبراں ۔ مکتبہ ذوقیہ کراچی 1954)

۱. ھویٰ	خواہش
۲. علاقه	تعلق محبوب اور محبّ کے درمیان تعلق
۳. کلف	اضطراب،بے چینی
۴. عشق	محبوب کے وصل کی شدید خواہش
۵. شعف	استقامت، استقلال، صبر
۶. شغف	عشق کا شدید احساس اور اس کے شدید اثرات
۷. جوی	ملال،پریشانی،اضطراب
۸. تیم	عبدیت، بندگی ، محبوب کی غلامی
۹. تدلیه	عدم ترتیب ،بے ترتیبی
۱۰ ھیوم	مکمل دیوانہ پن

(حضرت سید امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ)

۱. لحظه

۲. رمقه

۳. هویٰ (خواهش)

۴. وُدّ (مؤدت کا مترادف)

۵. خلّت (

۶. حب

۷. عشق

(مجمع السلوک (شرح رسالہ رسالہ مکّیہ) (۱)

۱. موافقت

۲. میل و موانست

۳. مؤدت

۴. هویٰ

۵. خلت

۶. محبت

۷. شغف

۸. تیم

۹. وُد

۱۰. عشق

حضرت قاضی حمید الدینؒ ناگوری

۱. علم

۲. عمل

۳. نیت
۴ .صدق
۵. عشق

حضرت شاہ عبدالحق ؒ محدث دہلوی

۱. میل
۲. رغبت
۳. طلب
۴. ولع
۵. صبابه
۶. ھویٰ
۷ .شغف
۸. اعزام
۹. حب مطلق یا عشق

حضرت شاہ عبدالعزیز ؒ محدث دہلوی (رسالہ عشقیہ)

۱. الفت
۲. صداقت
۳. مؤدت
۴. ھوی
۵. شغف
۶. خلت
۷. محبت
۸. عشق

۹ .تیم

۱۰. وله یا ولع....

==========

(حاشیہ) ''رسالہ مکیہ'' حضرت شیخ قطب الدینؒ دمشقی نے عربی میں تحریر کیا اس کا پہلا فارسی ترجمہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے ۱۲۷۰ء کے دوران کسی وقت کیا۔ اس کی شروح متعدد اصحاب تصوف نے کی ہیں۔

==========

حوالہ جات

۱۔ **استودیو العربیه** ثاقب حسین
۲۔ شفیق راجہ لفظ کا کاجل ۔ 'صرف تم'
۳۔ مومن خان مومن کلیات غزل ردیف الف
۴۔ علامہ اقبالؒ بانگ درا ''محبت''
۵۔ شفیق راجہ ،لفظ کا کاجل 'صرف تم'
۶۔ ایضاً'
۷۔ غزل 'لفظ کا کاجل '۔ شفیق راجہ
۸۔ (حضرت ذوقی شاہؒ :سردلبراں۔مکتبہ ذوقیہ کراچی 1954)
۹۔ (حضرت سید امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ)
۱۰۔ (مجمع السلوک(شرح رسالہ رسالہ مکّیہ) (ا)
۱۱۔ حضرت قاضی حمید الدینؒ ناگوری
۱۲۔ حضرت شاہ عبدالحقؒ محدث دہلوی
۱۳۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ محدث دہلوی (رسالہ عشقیہ)

باب چہارم

تصور عشق

اور

مولانا جلال الدین رومی حمۃ اللہ علیہ

۱۔حیات رومی۔ ایک سرسری مطالعہ
۲۔مثنوی مولانا روم اور تصور عشق

found.

شمس العاشقین حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ

1207 A.D. --- 1273 A.D.

حکمت رومی

سراپا درد و سوز آشنائی
وصالِ او زبا ں دانِ جدائی
جمالِ عشق گیرد از نئے اُو
نصیبے از جلالِ کبریائی

ترجمہ: رومی کی شاعری سراسر دردوسوزعشق ہے ان کا تصورِوصال صرف جدائی کی زبان جانتا ہے۔ان کی بانسری کی لے سے عشق کا جمال جلال کبریائی سے اپنا نصیب حاصل کرلیتا ہے۔

(علامہ اقبال۔۔ارمغان حجاز)

حیات رومیؒ (ایک سرسری تذکرہ):

مولانا محمد جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ کا نام ''محمدؐ'' اور لقب ''جلال الدین'' تھا۔ آپ نے مولانا روم، مولائے روم، مولانا رومی، اور مرشد رومی کے القاب سے شہرت پائی۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام بھی محمد اور لقب بہاء الدین تھا، حضرت بہاء الدینؒ ایک نابغۂ روزگار عالم دین تھے، ان کے حلقۂ ارادت میں امام فخر الدین رازیؒ (صاحب تفسیر کبیر/تفسیر رازی) اور محمد خوارزم شاہ (سلطان سنجر، سلطان جلال الدین محمد خوارزم شاہ۔ یہ وہی سلطان سنجر ہیں جن کی شوکت وسطوت کو علامہ اقبال نے بیان کیا۔: شوکت سنجر وسلیم تیرے جلال کی نمود) جیسے بزرگ شامل تھے۔ مولانا محمد جلال الدین رومیؒ کا سلسلۂ نسب چند واسطوں کے ذریعے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جا ملتا ہے۔ آپؒ ۶۰۴ھ (۱۲۰۷ء) میں بلخ میں پیدا ہوئے، آپ کے والد گرامی حضرت محمد بہاء الدین کی ملاقات حضرت خواجہ فرید الدین عطارؒ سے ہوئی اس وقت مولانا روم کی عمر چھ سال تھی اور وہ اپنے والد گرامی کے ہمراہ تھے حضرت خواجہ فرید الدین عطارؒ نے مولانا رومؒ کو دیکھ کر حضرت محمد بہاء الدینؒ کو تاکید کی کہ اپنے صاحبزادے کی تعلیم وتربیت میں کوئی کوتاہی نہ برتیں اور اسے دینی علوم سے بہرہ ور فرمائیں اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنی مثنوی ''اسرار نامہ'' تبرکاً ہدیہ کی۔

والد گرامی کی خصوصی توجہ سے مولانا رومؒ نے دینی علوم اور تمام مروجہ دینی کتب پر عبور حاصل کر لیا۔ آپ کے بچپن اور لڑکپن کا دور، دورِ فتن تھا ابھی آپ گیارہ سال کے تھے کہ تاتاریوں کا فتنہ شروع ہو گیا اور نوے لاکھ سے زائد لوگوں کو قتل کر دیا گیا، ادھر اسلامی دنیا میں مذہبی منافرت بھی زوروں پر تھی۔ یہی دور حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی (شیخ الاشراقؒ)، حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ، شیخ اکبر حضرت شیخ محی الدین ابن عربیؒ اور حضرت بوعلی قلندرؒ (بوعلیؒ اندر غبار ناقہ گم۔ والے) جیسے نابغۂ روزگار اولیاء اللہ کا دور بھی تھا۔

مولانا روم کی عمر ابھی صرف اٹھارہ سال تھی کہ آپ کی شہرت ہر جگہ پھیلتی چلی گئی۔ اس دوران شاہ روم علاء الدین کیقباد نے آپ کو روم آنے کی دعوت دی، آپ نے دعوت قبول

کرلی اور روم کے شہر قرمان (لارندہ) تشریف لے گئے جو قونیہ سے سو کلومیٹر کے فاصلے پر جنوب مغرب میں واقع ہے سلطان علاء الدین نے قلعہ کے قریب ایک عالیشان مسجد بنوائی۔ قونیہ اس دور میں پر رونق مدرسوں اور مسجدوں سے آباد تھا مولانا کے کنبے کے قونیہ منتقل ہونے کے بعد اس شہر کی علمی رونق دوبالا ہوگئی، ۲۲ جنوری ۱۲۳۱ء کو شیخ بہاء الدین کا انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال کے چند سال بعد ان کے شاگردِ رشید، رشید الدین محقق ترمذی بھی قونیہ پہنچ گئے، مولانا روم نے انہی سے علوم لدنی، حکمت الہامی، اور صوفیانہ زندگی کی معرفت حاصل کی۔ اور پھر انہی کے حکم کی تعمیل میں شام کا سفر اختیار کیا اور وہاں شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ، شیخ سعد الدین حموی، شیخ اوحد الدین کرمانی (حضرت خواجو کرمانی) کے حلقے کے بڑے بڑے صوفیاء سے ملاقاتیں کیں (ہوسکتا ہے کہ مولانا کی زندگی میں انقلاب بپا کرنے والے حضرت شاہ شمس الدین تبریزیؒ سے ان کی پہلی ملاقات یہیں ہوئی ہو)۔ اسی دوران شیخ برہان الدین محقق قونیہ چھوڑ کر قیصریہ چلے گئے وہیں ان کا انتقال ہوا، ان کا مزار آج بھی وہیں ہے۔

اٹھارہ سال کی عمر میں مولانا رومیؒ کی شادی سمرقند کے ایک با اثر شخص کی بیٹی گوہر خاتون سے ہوئی جن سے ان کے دو بیٹے تولد ہوئے۔ پہلے بیٹے سلطان ولد آگے چل کر مولانا کے خلیفہ دوم اور ان کے بہترین سوانح نگار اور ان کی کتابوں کے بہترین شارح بنے۔ جنوری ۱۲۴۴ء کے اواخر میں مولانا کی شمس الدین تبریزیؒ سے قونیہ میں ملاقات ہوئی۔ ان حضرت شمس االدین معروف بہ شاہ شمس تبریزی کے بارے میں حضرت شاہ اشرف علی تھانویؒ صاحب ''کلید مثنوی'' تحریر فرماتے ہیں ''کہ شمس تبریزیؒ 'کیا' بزرگ کے خاندان سے تھے جو فرقہ اسماعیلیہ کا امام تھا لیکن حضرت شاہ شمس تبریزیؒ نے اپنا آبائی مذہب ترک کر کے اسلامی علوم حاصل کئے اور بابا کمال الدین ہندی کے مرید ہوگئے ایک دفعہ دعا مانگی کہ الٰہی کوئی ایسا بندہ مل جاتا جو میری صحبت کا متحمل ہوتا، بشارت ہوئی کہ روم جاؤ، وہ اسی وقت چل پڑے اور قونیہ پہنچے، برنج فروشوں کی سرائے میں اترے، سرائے کے دروازے پر ایک چبوترہ تھا اس پر اکثر عمائد آ کر بیٹھتے تھے۔ وہیں ان کی ملاقات مولانا رومیؒ سے ہوئی۔'' (۱)

اس کے بعد یہ دونوں بزرگ چھ ماہ تک ایک دوسرے سے جدا نہ ہوئے صلاح الدین زرکوب کی دوکان تھی اور اس پر ان دونوں کی مجلس اس طور پر ہوتی تھی کہ نہ کھانے پینے کی فکر، نہ ضروریات زندگی کی خبر، پورے چھ ماہ اسی حال میں گذر گئے، اس دوران مولانا کے چاہنے والوں اور ان کے لواحقین کے دلوں میں شاہ شمس تبریزیؒ کے خلاف حسد کی آگ بھڑک اٹھی، اس کا احساس شمس تبریزیؒ کو بھی ہو گیا اور انہوں نے قونیہ چھوڑ دیا، ان کے قونیہ چھوڑتے ہی مولانا پر عجیب اثر ہوا کہ انہوں نے تمام سماجی اور علمی حلقوں سے اپنے تعلقات منقطع کر دیے اور فرائض و واجبات کو چھوڑ کر رقص و سرور اور نغمہ و موسیقی میں پناہ لینے لگے آپ کے بیٹے سلطان ولہ شاہ شمس تبریزیؒ کو شام سے واپس لے کر آ گئے۔ مولانا پر ایک عجیب ملکوتی عالم سرور وانبساط طاری ہوا جو شمس تبریزیؒ کی وفات یا روپوشی تک جاری رہا۔ یہ شمس تبریزی کون تھے؟ جو مولانائے روم کی زندگی میں اس قدر انقلاب کا سبب بنے ان کے صحیح حالات سے کوئی واقف نہیں۔

مولانا قاضی سجاد حسین مترجم مثنوی نے لکھا ہے کہ ''کہا جاتا ہے کہ ۵ دسمبر ۱۲۴۸ء کی رات تھی دونوں بزرگ شب کے آخری حصے تک مصروف گفتگو تھے کہ کوئی شخص شمس الدین تبریزیؒ کو باہر بلا کر لے گیا اور ان پر پے در پے قاتلانہ حملے کرنے لگا اور ان کو قتل کرنے بعد ان کو ایک اندھے کنویں میں ڈال گیا''۔ (۲)

''مثنوی مولوی معنوی''۔: اس کتاب کی ابتدا کے بارے میں زیادہ تو معلوم نہیں لیکن بقول عبدالباقی مثنوی کے دفتر اول کی بعض حکایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ سقوط بغداد (۱۲۵۸ء) کے وقت تک دفتر اول کا املا مکمل ہو چکا تھا۔ مولانا کی وفات (۱۷ دسمبر ۱۲۷۳ء) تک مثنوی مکمل ہو چکی تھی۔ یہ کتاب ایک عالمی شاہکار ہے جس کا دنیا کی ہر زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے اور ان کے تراجم اور شرحیں دنیا کے مختلف مکاتب اور دبستانوں کو سمت فراہم کر چکی ہیں یا نئے دبستان اور نئے مکاتب فکر کی تشکیل کر چکی ہیں۔ مثنوی کے اثرات مغرب میں سب سے زیادہ جرمنی کے مستشرقین (یٹشے، گوئٹے، وغیرہ) پر مرتب ہوئے، ان کے علاوہ فرانس میں

برگساں، اور دور حاضر کی پروفیسر این میری شمل (جرمن دانشور، فلسفی) مولانا روم ہی کے خوشہ چین ہیں۔ ادھر مشرق میں مولانا رومؒ کے مقلدین میں ایک بڑا نام علامہ اقبالؒ کا ہے۔ علامہ کی ''جاوید نامہ'' میں 'زندہ رود' کا کردار تو خود علامہ کا ہے لیکن 'مرشد' مولانا روم ہیں جو علامہ کو افلاک اور سیارگان کی سیر کے دوران روحوں سے متعارف کرواتے ہیں اور علامہ اقبال کو 'زندہ رود' کی حیثیت سے ان بزرگوں سے متعارف کرواتے ہیں۔ اردو ادب عالیہ میں مثنوی کے سب سے بڑے محقق مولانا اشرف علی تھانویؒ (صاحب کلید مثنوی) ہیں۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے مولانا رومؒ کی اس شہرۂ آفاق تصنیف پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کیا۔ انہوں نے مثنوی کا ترجمہ تو نہیں کیا لیکن مثنوی کے مضامین پر (حکمت رومی، حکایات رومی، تشبیہات رومی وغیرہ) متعدد کتابیں تحریر کیں۔ مولانا رومؒ کی وفات ۱۲۷۳ء میں قونیہ میں ہوئی اور وہیں مدفون ہوئے۔

مولانا رومؒ کی ''مثنوی معنوی'' میں بنیادی مضمون ''عشق'' ہے۔ بندے کا اللہ سے عشق۔ اس میں مختلف حکایات، تشبیہات کے ذریعے اسی عشق کی تشریح، اس کے مختلف پہلوؤں، اسباب و محرکات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

-☆-☆-☆-

مثنوی مولانا رومؒ اور تصور عشق:

بشنو از نے چوں حکایت می کند
و ز جدائی ہا شکایت می کند

مثنوی میں مولانا رومؒ کا بنیادی مضمون ''عشق'' ہے۔مثنوی کی روح 'عشق' ہے۔اس کے مصرعوں میں،اس کے مصرعوں کی رگوں میں دوڑتا ہوالہو عشق ہے،عشق اس کی ابتدا ہے اور یہی اس کی انتہاء ہے۔مثنوی کے ہر مضمون سے عشق ٹپکتا ہے، ان کے اشعار میں بلندی سے لڑھکنے والی شے کے دل کے اندر نشیب کیلئے عشق کے جذبات کا سراغ ملتا ہے۔مولانا رومؒ سیاروں کے درمیان باہم کشش کو،ان کے جذب باہم کو بھی عشق قرار دیتے ہیں(اور یہ حسن تعلیل نہیں ہے)۔وہ نیوٹن(مولانا رومؒ کے بعد بیسویں صدی کے زمانے کے معروف ترین سائنسدان کے قانون کشش ثقل کو جو اس زمانے میں کشش ثقل کے نام سے رائج نہیں تھا)ایک عام نظارہ تھا کہ ہر چیز زمین کی جانب لڑھکتی ہے، مولانا اس کشش زمینی کو بھی زمین اور مجردات کے درمیان عشق سے تعبیر کرتے ہیں چونکہ ایسی تمام اشیاء جو زمین کی جانب مراجعت کرتی ہیں ان کے اجزائے تجسیمی (عناصر تخلیق) زمین ہی سے تشکیل پاتے ہیں اسی لئے وہ زمین کی جانب مراجعت کرتے ہیں اس طرح وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ روح جس کی اصل 'روح الارواح' (امر من اللّٰہ) ہے، جب کسی جسم میں اللہ کے امر کے طور پر پھونک دی جاتی ہے تو یہ اس تنزل سے فوراً واپس اپنی اصل کی جانب جانے کیلئے ہمیشہ بے تاب رہتی ہے اور واصل بالاصل یعنی واصل بالحق ہونے کیلئے ہمیشہ تڑپتی ہے اسے کسی لمحے قرار نہیں ملتا،روح کو وہ بنسری میں جانے والی ہوا،یعنی نے نواز

کے دہن سے ماری جانے والی پھونک کو(روح ،امراللہ) سے تشبیہہ دیتے ہیں اور خود بنسری کو جسم سے تشبیہہ دیتے ہیں جو اس ہوا کے بغیر محض بانس کا ایک ٹکڑا ہے۔ بنسری سے برآمد ہونے والی آواز کو وہ جدائی کی شکایت قرار دیتے ہیں اور اس تڑپ کی حکایت سمجھتے ہیں جو روح اپنی اصل (نیستان) کی جانب مراجعت کے طور پر بیان کرتی ہے، (انسانی جسم کے سوراخوں اور بنسری کے سوراخوں کی تعداد یکساں ہوتی ہے)۔مثنوی کے پہلے شعر سے ہی یہی حکایت شروع ہوتی ہے:

بشنو از نے چوں حکایت می کند
و ز جدائی ہا شکایت می کند
کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند
ازنفیرم مرد و زن نالیدہ اند
سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق
تا بگویم شرح دردِ اشتیاق
ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش
باز جوید روزگار وصل خویش

ترجمہ:ا۔سنو کہ بنسری کیا کہانی بیان کرتی ہے۔اور جدائیوں کی کیا کیا شکایت بیان کرتی ہے۔

۲۔کہ جب سے مجھے بانس کے جنگل بنسلی (عالم الارواح) سے کاٹا گیا ہے،مرے نالے سے سب مرد وزن روتے ہیں۔

۳۔مجھے ایسا سینہ درکار ہے جو جدائی سے پارہ پارہ ہو،تا کہ میں عشق کے درد کی داستان تفصیل سے بیان کرسکوں۔

۴۔ہر کوئی جو اپنی اصل سے دور ہو جاتا ہے، وہ اپنے اصل سے وصل کی خاطر اسی طرح تڑپتا ہے۔

روح اللہ کا امر ہے۔اللہ اس کا نے نواز ہے وہ خدا سے ہے اور اسی کی جانب واپس جانے کیلئے بیتاب ہے۔کائنات، کائنات کے انداور اس کے باہر جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے یا جو کچھ ہمیں نظر نہیں آتا، ایک چھوٹے سے چھوٹے (خوردبین سے بھی نظر نہ آنے والے) ذرے، سے لے کر بڑے سے بڑے پہاڑ تک، آسمان وزمیں کی ساری وسعتوں میں جو کچھ ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب عشق کا مظہر ہے۔ ہر حرکت، ہر سکون کی کیفیت، طوفان کی بلاخیزی، ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے، بادصبا، بادصرصر ان سب کے پیچھے اصل قوت عشق ہی کی ہے ہر شے مضطرب ہے، کسی نہ کسی منزل کو پانے کی جستجو میں بے تاب ہے۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کہتے ہیں ''معشوق حقیقی نے اپنے طالبوں میں فراق پیدا کر رکھا ہے تمام کائنات مراتب درجات اور تنزلات کا ایک سلسلہ ہے۔تمام تنزلات میں اسی لئے ارتقاء کی جانب میلان ہے کہ ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف بڑھے اور چڑھے۔اس طرح اپنی اصل کی جانب مراجعت کی جائے''۔۔ (۳)

پس یہی عشق ہے اور یہی مثنوی کا موضوع اور اس عشق کی فقہ کے امام اعظم، مرشد کامل مولانا محمد جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ۔

جب بھی عشق کی تاریخ لکھی جائے، جب بھی عشق کے تصور یا فلسفے کا ذکر کیا جائے تو عشق کی فقہ کے امام اعظم حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ لازماً آئے گا وہ عشق کے مرشد اول، امام الاولیائے عشق ہیں اور ان کی مثنوی، عشق کی کتاب مقدسہ ہے۔ قرآن پاک کے بعد جتنی زبانوں میں جتنی تشریحات مثنوی کی تحریر کی گئیں کسی اور کتاب کو یہ اعزاز نصیب نہیں ہوا۔مولانا نورالدین جامیؒ نے صحیح کہا تھا:

مثنویٔ مولویٔ معنوی

ہست قرآں در زبان پہلوی

ترجمہ: مولانا روم کی ''مثنویٔ معنوی'' زبان پہلوی (فارسی) کی ایسی کتاب ہے جو بار بار (الہامی کتاب کی طرح) پڑھی جاتی ہے۔(یہاں اس بات کا تذکرہ یقیناً بے محل نہ ہوگا

کہ دنیا کی کسی مقدس کتاب کو بھی ''قرآن'' نہیں کہا جاسکتا۔قرآن کو یہاں لغوی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے یعنی بار بار پڑھی جانے والی کتاب۔اور یہاں ترجمے میں بھی انہی معانی کی رعایت کی گئی ہے)

مثنوی کے حرف اول سے حرف آخر تک عشق ہی عشق ہے۔وہ کلیم عشق ہیں،رازدار عشق ہیں،ذبیح عشق ہیں،قتیل عشق ہیں،پیمبر عشق ہیں،ان کا طریق عشق،طریق مولویت کہلاتا ہے۔ان کا تعلق سلسلۂ عشقیہ سے ہے،مولانا رومؒ کی شہرۂ آفاق تصنیف ''مثنوئ مولوئ معنوی'' کا اہم ترین موضوع عشق ہے جو اس کے دیگر مضامین پر چھایا ہوا ہے۔جب بھی عشق،فلسفۂ عشق یا تصور عشق کی بات ہوتی ہے،مولانا رومؒ کا ذکر لازمی ہے ان صفحات میں بھی قبل ازیں انہی کی فکر ہر بیان کی دلیل بنی ہے۔تصور عشق کے بیان میں مولانا کی فکر، ان کے تخیل اور ان کے فلسفے سے ہمیشہ استفادہ کیا گیا ہے اور ہمیشہ کیا جائے گا۔اس لئے کہ مولانا رومؒ تصور عشق کے سب سے کامیاب وکیل ہیں۔مولانا رومؒ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''مثنوی'' میں عشق سے متعلق جو نظریہ پیش کیا جو نکتۂ نظر بیان کیا اس کا لب لباب یہ ہے کہ روحوں کا اصل ماخذ اور مقام ذاتِ الٰہی ہے۔''**و یسئلونک عن الروح.قل الروح من امر ربی** .. ۔اے نبیؐ یہ آپ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں تو کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے''۔ (۴)

مراد یہی ہے کہ روح اللہ کے حکم سے ہے۔تمام ارواح اللہ کا حکم ہیں اور ہر روح اپنی اصل یعنی روح الارواح سے فراق کے بعد اپنی اصل کی جانب مراجعت کیلئے ہمہ وقت بے تاب ہے،وہ واصل الی اللہ یا واصل الی الاصل ہونا چاہتی ہے۔ہر روح اپنی اصل کی جانب کشش محسوس کرتی ہے۔اسی کشش کا نام عشق ہے،یہی مثنوی کا موضوع ہے۔مولانا اسی کشش کی تشریح وتفسیر میں نغمہ ریز ہیں۔انہیں عشق سے عشق ہے اور اپنے دل پسند موضوع کو وہ ہزار طرح سے، پہلو بدل بدل کر،نکتہ نکتہ کر کے بیان کرتے ہیں۔عشق کو اتنے واشگاف الفاظ میں نہ ان سے پہلے کسی نے بیان کیا ہے نہ آئندہ کسی کے بیان کرنے کی امید ہے۔ان

کے بعد عشق کے حوالے سے جو کچھ بھی ضبط تحریر میں لایا گیا وہ سب مثنوی مولانا رومؒ ہی کے حوالے سے ہے۔ کیونکہ مولانا عشق کی دنیا کے اندر کے آدمی ہیں اور عشق کے واقف حال بھی۔ ان کا سارا فلسفہ، سارا علم الکلام، ساری شاعری، ساری فکر کا یک لفظی اختصار ''عشق'' ہے۔ مثنوی میں تمثیلات، تشبیہات اور حکایات کے ذریعے صرف عشق ہی کی توجیہات میں زور فکر کا استعمال ہے۔ ان کی ہر دلیل کا نکتۂ آغاز بھی عشق ہے اور نکتۂ انجام بھی عشق۔ ہر درجۂ ایمان عشق ہے اور ہر کیفیت ایقان عشق۔

مولانا رومؒ نے مثنوی کے بالکل شروع میں انسانی زندگی، روح اور جسم، خالق و مخلوق کے درمیان کشش کے رشتے کیلئے جو بنسری کی تشبیہہ استعمال کی، بنسری کے اندر سے نکلنے والی آوازوں یا سروں، یا ترنم کو جسم انسانی میں بند روح کی جو اپنی اصل، نیستاں (عالم ارواح) سے جدائی کی حکایت خونچکاں کہتے ہیں:

جسم خاک از عشق بر افلاک شد
کوہ در رقص آمد و چالاک شد
عشق جانِ طور آمد عاشقا
طور مست و خر موسیٰ صعقا

ترجمہ: یہ عشق ہی ہے جس کی قوت سے ایک خاکی جسم افلاک کی حدوں کو پار کر گیا۔ پہاڑ جس قوت کے جلوے کے سامنے لرزاں تھے، عشق وصل کے جذبے سے سرشار تھا: خاکی جسم، عشق کی وجہ سے آسمانوں پر جا پہنچا، پہاڑ ناچنے لگا اور عشق ہوشیار ہو گیا۔ عشق طور کی جان بنا، طور مست ہو گیا اور موسیٰؑ بیہوش ہو کر گر پڑے۔

حکیم الامت حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ اپنی شہرۂ آفاق شرح مثنوی ''کلید مثنوی'' میں اس شعر کی تشریح میں فرماتے ہیں ''جسم خاک سے مراد جسد رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اور افلاک پر جانے سے مراد معراج ہے، کوہ کا رقص میں آنا اشارہ ہے حضرت موسیٰؑ کے قصہ خواہش دیدار الٰہی (رب ارنی) کی طرف۔ جیسا کہ دوسرے شعر میں تصریح

فرمادی ہے یعنی آپ کا معراج پر تشریف لے جانا بدولت عشق کے ہوا کیونکہ آپ محبوب تھے، محبوب کو قرب وعروج عطا ہوتا ہی ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ دیدار بدولت عشق ہی کے ہوا کیونکہ اس میں آپ (حضرت موسیٰؑ) محبّ تھے محبت کی شدت کی وجہ سے آپؑ نے دیدار کی درخواست کی، اس سے تجلی ہوئی اور پہاڑ حرکت میں آ گیا جس کو مستی سے تعبیر کیا ہے۔'' (۵)

مولانا رومؒ کے تصور کے مطابق تو کائنات کا ہر ذرہ، ہر مخلوق خواہ وہ جاندار ہو یا بے جان عشق میں مبتلا ہے۔ تسبیح اشجار عشق کی بدولت، سمندر کی گہرائی، اس کا تموج عشق کے سبب، صحرا کی وسعت اس کی ہر حرکت کی غایت اظہار عشق ہے۔ کچھ انسانوں ہی پر موقوف نہیں، کائنات کا، اور ورائے کائنات ذرہ ذرہ عشق میں ڈوبا ہوا ہے، ایک پہاڑ ایک تجلی پر ،صدیاں گذریں محو رقص ہے۔ اس کا رقص تھمنے میں نہیں آتا، اس پر مستی چھائی اور وہ دیدار محبوب اصلی کی خواہش کی تکمیل کی مستی میں ہے۔

گلستانِ فکر رومیؒ کے خوشہ چین، ایک معروف دانشور، مفکر اور شارح ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مولانا رومؒ کی تفسیر و بیان عشق کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں:

''مولانا ہزار طرح سے اس کی تفسیر کرتے ہیں، اور وجد و مستی میں نغمہ ریز ہوتے ہیں، لیکن ان کی تسلی نہیں ہوتی نہ وہ خود عشق کی گوناگوں کیفیتوں سے سیر ہوتے ہیں اور نہ ان کے بیان سے ان کی تشفی ہوتی ہے۔'' (۶)

مولانا رومؒ فرماتے ہیں عرفان حقیقت قید ہستی کے بغیر ممکن نہیں اور قید ہستی سے آزادی کے بغیر متصور نہیں۔ مولانا نے شیخ دقوق کی حکایت میں اسے سفر جاں سے تعبیر کیا ہے:

تو سفر کردی ز نطفہ تا بعقل
نے بگامی بود منزل نے بنقل
سیر جاں بے چوں بود در دور و دیر
جسم ما از جاں بیآموزید سیر

(۷)

ترجمہ: تو نے نطفہ سے عقل تک کا سفر کیا یہ منزل نہ قدم سے طے ہوئی نہ منتقل ہونے سے، روح کی سیر مسافت اور زمانے میں بے کیف ہوتی ہے ہمارے جسم نے روح سے سیر سیکھی۔ اور سفرِ جاں قرب حق کی تلاش کا سفر ہے۔ یہی عشق کا سفر ہے بندے کا اپنے خالق و محبوب کی جانب سفر۔

بر دلی کو را تحیر با خداست
کی شود پوشیدہ را زِ چپ و راست
گفتم ار سوئے حقائق بشگفتید
چوں ز حرف و اسم رسمی واقفید
ایں سخن چوں آمد از من در خطاب
آں شہاں در حال گفتندم جواب
گفت اگر اسمی شود غیب از ولی
آں از استغراق داں نز جاہلی

(۸)

ترجمہ: اس دل پر جس کو خدا سے تحیر ہے دائیں اور بائیں کا راز کب پوشیدہ ہوتا ہے؟ میں نے کہا حقائق کی جانب اگر تم شگفتہ ہو تو رسمی نام کیسے لب پر آتا ہے۔ جب دوران گفتگو میری جانب سے یہ بات آئی تو ان شاہوں نے فوراً جواب دیا کہنے لگے اگر کسی ولی سے کوئی اسم ورد غائب ہوتا معلوم ہوتا نظر آئے تو وہ استغراق کی وجہ سے سمجھ نہ کہ لاعلمی سے۔ مولانا روم محبت کی کرامات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

از محبت نیش، نوشے می شود
وز محبت شیر، موشے می شود

محبت ہو تو خطرناک ترین زہریلا ڈنک بھی انسان کیلئے خمار آلود مشروب کی طرح کا نشہ

طاری کرسکتا ہے، زہر بھی تریاق یا مشروب کا کام کرتا ہے جبکہ اگر محبت دلوں میں جاگزیں ہوتو چوہے جیسا کمزور ترین جانور بھی شیر جیسا خطرناک درندہ بن جاتا ہے۔

مولانا روم ایک حکایت کے حوالے سے کہتے ہیں'' دو بندوں نے ایک جیسا نعرہ لگایا ایک کا نعرہ اللہ کے عشق کے نور سے منور تھا دوسرے کا نعرہ اس کے غرور اور ضد کے تابع تھا ان میں ایک فرعون تھا جس نے کہا'' انا اللہ' یا انا ربکم الاعلیٰ' اس کا اعلان کفر اور شرک اور خدا سے بغاوت ٹھہرا۔ اور دوسرا بندہ منصور تھا جس نے کہا'' انا الحق'' جو اس نے عشق الٰہی کی قوت سے کیا، ظاہری طور پر، معانی و مطلب میں دونوں ایک جیسے تھے لیکن باطن میں دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ منصور کا نعرہ نور ہے اور فرعون کا اعلان غرور ہے۔

بود اناالحق درلب منصور نور
بود اناالله درلب فرعون زُور

ترجمہ: انا الحق کا جو کلمہ منصور کی زبان پر تھا وہ کلمہ نور سے منور تھا اور انا اللہ کا جو کلمہ فرعون کی زبان سے ادا ہوا جو فخر و تکبر اور ضد سے معمور تھا۔

منصور اللہ کی محبت کے سمندر میں غوطہ زن تھا اس کے آس پاس اوپر نیچے محبت موجیں مار رہی تھی گویا وہ خود کو سمندر سمجھ رہا تھا سو اس کی زبان نور کی زبان بن گئی۔ اور فرعون جو اقتدار و اختیار کے نشے میں دھت تھا۔ وہ اپنی سلطنت میں اپنے کارندوں کو جو حکم دیتا تھا وہ پورا ہو جاتا تھا۔ سو اسے گمان ہونے لگا کہ وہ کہ وہ سب کچھ کرسکتا ہے اس خیال نے اسے بھٹکا دیا اور اس نے اپنی خدائی کا اعلان کر دیا۔ اس میں اس کا غرور، انا، اور تکبر تھا سو وہ رحمت الٰہی سے دور ہو کر اندھیرے کا نمائندہ بن گیا اور خدائے واحد کے عذاب کا نشانہ بن گیا۔

یہ محبت ہی ہے جو محبّ سے ایسے ایسے کام کرواتی ہے جو عام حالات میں انسان کیلئے ناممکن دکھائے دیتے ہیں۔ محبّ اپنی بساط سے بڑھ کر کارنامے انجام دے سکتا ہے۔ عام حالات میں انسان کو جان کی پڑی ہوئی ہوتی ہے جب کہ محبت میں انسان جان جیسی قیمتی شے کو قربان کر دینے میں ذرا تامل یا ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کرتا ہے۔ محبت کی وجہ سے بڑے

بڑے تاجدار جو ایک طویل سلطنت کے مالک ہوتے ہیں یا بے انتہا طاقت کے مالک، دنیا میں جن کا رعب و دبدبہ کمال کا ہوتا ہے، انتہائی ملائم طبیعت کے رحم دل شخص بن جاتے ہیں۔ اور دوسروں پر رحیم ہوتے ہوئے ان میں بھی محبت کی ترغیب دیتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔

از محبت سقم، صحت می شود

وز محبت قہر، رحمت می شود

ترجمہ: محبت ہو تو مرض لا دوا بھی بے مثال صحت کی علامت بن جاتے ہیں اور محبت میں ، دوسروں کو بطور خاص محبوب کا غصہ بھی رحمت دکھائی دیتا ہے۔

مولانا کہتے ہیں محبت مفلسی میں بھی امارت کے مزے محسوس کرواتی ہے، اور شدید بیماری کے عالم میں بھی انسان کو کمزور نہیں ہونے دیتی وہ مریض کو صحت مند ہونے کیلئے تحریک کرتی ہے جب مریض ذہنی طور پر صحت مند ہونے کیلئے آمادہ ہو تو اس کی صحت یابی میں کوئی مرض حارج نہیں ہوسکتا۔ محبت گھر کے افراد کے دلوں میں گھر کر لے تو اس گھر کے اندھیرے دور ہوسکتے ہیں بصورت دیگر ساری سہولتیں اور سارے زمانے کی آسائشیں ہونے کے باوجود گھر کے باسیوں میں اطمینان وسکون معدوم ہوتا ہے۔ ایسے گھر مکان ہوتے ہیں اور انہیں محبت کے بغیر گھر بننا نصیب نہیں ہوتا۔

از محبت خار، سوسن می شود

وز محبت خانہ روشن می شود

ترجمہ: محبت کے باعث تو خار (کانٹے) بھی سوسن (پھول) کا روپ دھار لیتے ہیں اور محبت کے سبب گھروں کے اندر سکون واطمینان کی روشنی رہتی ہے۔

مولانا کہتے ہیں محبت ہو تو کانٹے بھی پھولوں جیسا سرور دیتے ہیں بلکہ کانٹے پھول دکھائی دینے لگتے ہیں اور محبت والے گھر اگر بظاہر روشنیوں سے محروم ہوں تب بھی روشن روشن نظر آتے ہیں، ایسے گھروں میں رہنے والے جب گھروں میں داخل ہوتے ہیں تو انہیں ہر طرف محبت کی خوشبوئیں محسوس ہوتی ہیں اور گھر کے ہر مکین پر یہ سرور طاری ہوتے ہی گھر کی

ساری فضا پر سکون ہوجاتی ہے اور گھر خوشیوں سے بھر جاتے ہیں۔محبت کا نور اس گھر کو روحانی طور پر روشن رکھتا ہے اور ایک حدیث پاک کے مفہوم کے مطابق'' آسمان والوں کو ایسے گھر جن میں محبوب حق کا ذکر رہتا ہے روشن تاروں کی مانند دکھائی دیتے ہیں''۔

ازمحبت مردہ، زندہ می شود

وزمحبت شاہ، بندہ می شود

ترجمہ: محبت کے جذبے کی بدولت مردہ زندہ ہو جاتے ہیں (مردہ دل زندہ دل بن جاتے ہیں) اور محبت سے (فرعون صفت) بادشاہ (خاکساری اختیار کر کے) اطاعت گذار بندے بن جاتے ہیں

محبت مردہ دلوں کو زندگی کا تحفہ دیتی ہے، ہر وقت مایوسی کی باتیں کر کے خود کو اور سارے ماحول کو آزردہ کرنے کی بجائے محبت کرنے والے اپنے دلوں میں محبت کی بدولت امیدوں اور آرزوؤں کی گفتگو کر کے مایوسی اور ناامیدی کو بھگا کر دیتے ہیں۔اس سے چہروں کی زندگی لوٹ آتی ہے اور چہروں کی زندگی سے دل زندہ ہوجاتے ہیں۔یہ ساری کرامات محبت کی کرامات ہیں اور محبت دانش سے آتی ہے اس دانش کی بات کرتے ہوئے مولانا کہتے ہیں:

ایں محبت ہم نتیجہ دانش است

کے گزافہ برچنیں تختے نشست

ترجمہ: یہ محبت دانش کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔محبت کے اس تخت پر پر کوئی احمق، کوئی بیہودہ اور بے عقل (ہوس کا مارا ہوا) کہاں بیٹھ سکتا ہے؟۔

رہی محبت کی بات تو محبت کے ہزاروں روپ ہیں اور محبت ہر روپ میں رحمت ہے، محبت شفقت ہے محبت مامتا ہے، محبت کی بہت سی قسمیں ایسی ہیں جو جب جبلت کے ذریعے انسانی زندگی میں داخل ہوتی ہیں تو وہ وہبی، فطری دانش کے علاوہ کسی کسبی دانش کا نتیجہ نہیں ہوتیں۔جیسے والدین کی اپنے بچوں کیلئے محبت کے جذبات، یا بچوں کے دلوں میں اپنے والدین کیلئے محبت، یا فطرت کے حسین مناظر جو ہر دیکھنے والی آنکھ کو اپنی جانب مائل کرتے

ہیں وغیرہ، ایک اور نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اعلیٰ دانش کے نتیجے میں پیدا ہونے والی محبت اعلیٰ اور ارفع ہوگی اور ناقص اور ادنیٰ دانش کے نتیجے میں پیدا ہونے والی محبت بھی ادنیٰ درجے کی اور ناقص ہوگی۔ بچے کی دانش ناقص ہوتی ہے اس لئے وہ بے جان کھلونوں پر جان دیتا ہے، بالغ ہونے کے بعد بھی اگر اس کی دانش ترقی نہ کرے اور اس کی سوئی بچپن ہی میں اٹک جائے تو اس کے اندر مادی چیزوں سے محبت اور شہوات اور لذات میں اس کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے وہ صورت سے محبت کرتا ہے اور سیرت اس کیلئے ثانوی درجے میں چلی جاتی ہے، اس لئے کہ اس میں سیرت جانچنے کی اہلیت مفقود ہوگی۔ اسے معلوم نہیں ہوتا کہ چیزوں اور چہروں کی خوبصورتی، محدود عرصے کیلئے ہے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی مدت بھی محدود ہے۔ چیزوں کا حسن ایک زوال پذیر اور آنی جانی چیز ہے، جو چیز آج حسین معلوم ہوتی ہے وہ کچھ عرصے کے بعد بدشکل، قبیح اور قابل نفرت معلوم ہوگی، پھول مرجھا جاتے ہیں تو انہیں کوڑے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ ناقص دانش کو حسن ازلی اور حسن فانی میں فرق محسوس نہیں ہوتا۔ انسانی زندگی کے دنیاوی مدارج مثلاً بچپن، لڑکپن، جوانی، بڑھاپا یہ سب ایک مخصوص محدود مدت کے مدارج ہیں، نہ ان کی ظاہری حالت ہمیشہ ایک جیسی رہتی ہے نہ ان کی دلچسپیاں یا تعلق ایک جیسے رہتے ہیں اسی طرح ان کے تقاضے بھی ایک جیسے نہیں رہ سکتے یہ سارے تقاضے انسان کی ظاہری موت تک کے ہیں۔ دوسرے یہ کہ انسانی زندگی پر حالات و حوادث اثر پذیر ہوتے ہیں حالات یا حوادث جس کیفیت کے ہوں گے ان کے اثرات بھی اسی کیفیت کے مظہر ہوں گے۔ خوشی، غم، بیماری، صحت، کامیابی، ناکامی وغیرہ یہ سب حالات وحوادث کے ماتحت ہیں۔ حالات وحوادث کا تعلق مادی دنیا سے ہے اور دنیا کی حد مقرر ہے سو ان کیفیات کی مدت، عمر یا عرصہ بھی محدود ہے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے مطابق:

''انسان کی شادی وغم حالات کی مستعار کیفیات ہیں جو حوادث کے رحم وکرم پر ہیں اس لئے مولانا (مولانا رومؒ) ان کو عاریت کہتے ہیں'' (۹)

مولانا رومیؒ ارشاد فرماہیں:

آنکہ او بستہ غم و خندہ بود
او بدیں دو عاریت زندہ بود

ترجمہ: وہ جو غم اور خوشی محسوس کرتا ہے مغموم وخوش رہتا ہے (وہ جان لے) کہ وہ دونوں (غم وخوشی) حوادث سے مستعار لی گئی کیفیات ہیں۔

لیکن عشق کا تعلق چونکہ روح سے ہے اور روح کا کوئی بچپن، لڑکپن، جوانی یا بڑھاپا نہیں ہوتا نہ اس کی دلچسپیاں اور تقاضے متبدل ہیں اس لئے اگر مطلوب کوئی فانی شے، خیال یا مجسم نہیں بلکہ غیر فانی ہو تو عشق کا جذبہ ہمیشہ ترقی پذیر رہتا ہے، مولانا جس عشق کی وکالت کرتے ہیں اس پر حالات وحوادث اثر پذیر نہیں ہوتے، قطرہ جس حالت میں ہو، جس قسم کے حالات کا شکار ہو، وہ پہاڑ کی چوٹی پر برسے یا کسی میدان میں، وہ کسی گھر کی چھت پر برسے یا دالان میں، وہ کھیت میں برسے یا کھلیان میں، وہ سمندر کے عشق میں مبتلا ہے اور واصل بہ بحر ہونے کیلئے بے تاب ہے اس کے راستے میں جو رکاوٹیں حائل ہوں جس طرح کے حوادث سے وہ نبرد آزما ہو وہ سمندر کی جانب پوری توانائی اور جذبے کے ساتھ سفر جاری رکھتا ہے۔ عشق کبھی حالات سے ہار نہیں مان سکتا نہ حالات وحوادث اس کے راستے کی رکاوٹ بن سکتے ہیں، مولانا رومؒ کہتے ہیں:

باغ سبز عشق کو بے منتہاست
جز غم و شادی در و بس میوہ ہاست
عاشقی زیں ہر دو حالت برتر است
بے بہار و بے خزاں سبز و تر است

ترجمہ: عشق کا باغ ہمیشہ سرسبز رہتا ہے۔ اس کے حالات ایک جیسے رہتے ہیں، اس پر موسموں کی کیفیات اثر پذیر نہیں ہوتیں۔ نہ بہار اس پر پھل پھول لاتی ہے نہ خزاں اس سے پھل پھول چھین سکتی ہے۔ عشق ہر حالت سے ماوراء اور برتر ہے۔ غم، خوشی، درد، سکون، عشق کی دنیا میں عنقا ہیں۔ یہ عشق کی دنیا کے جذبات نہیں، اس میں نہیں ہوتے، یہ بس مادی دنیا

کی چیزیں ہیں اوران کی زندگی یہیں تک ہے۔

گرچہ تفسیر زباں روشن گر است
لیک عشق بے زباں روشن تر است
عقل در شرحش چو خر در گل بخفت
شرح عشق و عاشقی ہم عشق گفت

(۱۰)

ترجمہ: ''اگرچہ علم کی بنیاد پر زبان سے عشق کی تشریح، ایک روشن گر شے اور لفظی طور پر سمجھانے والی صفت ہے مگر دل کے اندھیرے میں پلنے والے جذبے تشریح کے محتاج نہیں ہوتے ''خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری'' کے مصداق عشق بے زباں (ایسا عشق جس کا اظہار محض زبان سے نہ کیا جائے بلکہ اپنے عمل سے، اپنی وارفتگی ومحویت سے ثابت کرنا جو ظاہر ہے دل کے اندر کے پختہ یقین کے بغیر ممکن نہیں) ،خموش عشق زیادہ روشن ہوتا ہے عقل جب عشق کی شرح کرنے لگے تو ایسا ہے جیسا کسی گدھے نے پھولوں میں سر دے دیا ہو یا یہ کہ کوئی گدھا کیچڑ میں پھنس گیا ہو۔عشق کی شرح کیلئے عشق ہی کی زبان درکار ہوتی ہے' محبت سے زندگی کی سختیاں آسانیاں معلوم ہوتی ہیں۔محبت میں سولی چڑھ جانے میں زندگی دکھائی دیتی ہے۔اہل محبت کو سولی کی لکڑی تخت شاہی دکھائی دیتی ہے۔محبت خام سونے کو کندن بنادیتی ہے۔ بقول مولانا رومؒ:

از محبت تلخ ہا شیریں شود
از محبت مسّ ہا زرّیں شود

ترجمہ: محبت میں کانٹے پھول لگتے ہیں، درد، سرور دیتا ہے، تلخی شیرینی کا ذائقہ دیتی ہے، محبوب کے دربان کی تلخ کلامی، گالیاں نغمگی کا احساس دلاتی ہیں محبت میں پتھر اور سنگریزے ہیرے جواہر لگتے ہیں، محبت انسان کو کچھ بھی پاس نہ ہوتے ہوئے دل کا غنی کردیتی ہے، محبت گدلے پانی کو صہبائے شفاف اور درد کو شفا کا روپ دے دیتی ہے:

محبت کا یا کلپ کرنے والا جذبہ ہے۔ایک سخت گیر محبت کی بدولت نرم خو بن سکتا ہے۔ زبان سے، لہجے سے تلخ گفتگو والا ذی نفس شیریں لہجے کا حامل ہوسکتا ہے۔محبت میں اگر محبوب کی جانب سے کوئی سخت بات سننے کو ملے تو دلوں کے اندر پنپنے والا جذبہ اس تلخی کو شیرینی میں تبدیل کر کے سماعت پہنچاتا ہے۔محبوب کا پتھر پتھر نہیں لگتا پھول لگتا ہے۔محبت میں والا زخم تکلیف نہیں دیتا راحت دیتا ہے اور ایسے زخم کا نشان کسی تمغے سے کم نہیں نظر نہیں آتا۔محبت رہزن نہیں ایک رہنما جذبہ ہے۔

از محبت سنگ، روغن می شود
از محبت حزن ، شادی می شود
بے محبت موم، آہن می شود
و ز محبت غول،ہادی می شود

(مولانا رومؒ)

ترجمہ:محبت سے سخت پتھر (پر محنت کی جائے تو وہ) پگھل کر سیال بن سکتا ہے،محبت میں غم خوشی کا روپ دھار سکتا ہے اور اگر محبت نہ ہوتو موم لوہا بن جائے گا اور اس پر ساری محنت بے نتیجہ رہ جائے گی،انسان اگر محبت کے ساتھ (پورے خلوص کے ساتھ اپنی منزل کو روانہ ہو اور اسے منزل کا پتہ نہ ہوتو غول بیابانی بھی اس کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔کلید مثنوی دفتر اول ص۱۴ مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ
۲۔مثنوی مولوی معنوی مترجمہ مولانا قاضی سجاد حسین دفتر دوم صفحہ ۵
۳۔ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم : حکمت رومی؛ باب آغاز
۴۔ القرآن سورہ بنی اسرائیل آیت ۸۵
۵۔مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ کلید مثنوی جلد اول صفحہ ۴۴
۶۔ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم۔حکمت رومی باب: عشق
۷۔مثنوی مولانا روم دفتر سوم بیت ۲۰۶۳۔۲۰۶۱
۸۔مثنوی مولانا روم دفتر سوم بیت ۱۹۸۰۔۱۹۷۹
۹۔ ڈکٹر خلیفہ عبدالحکیم:حکمت رومی ص۵۶
۱۰۔مثنوی مولانا رومؒ دفتر اول تمہید

(1).jpg not found.

علامہ اقبال

1877-1938

باب پنجم

تصور عشق اور علامہ اقبالؒ

۱۔حیات اقبال۔ایک سرسری مطالعہ
۲۔اقبال کے مختلف تصورات میں عشق کا سراغ
۳۔۔عشق اصل کائنات
۳۔عشق نغمۂ تار حیات
۴۔عقل و عشق ایک تقابل
۵۔اقبال (کے ہاں) مدارج عشق

متاع من دل درد آشنا ایست
نصیب من فغانِ نارسا ایست
بخاکِ مرقدِ من لالہ خوش تر
کہ ہم خاموش وہم خونیں نوا ایست

ترجمہ : میرا سرمایہ میرا درد آشنا دل ہے اور میرا نصیب (سنی ان سنی کی جانے والی) آہ وفریاد ہے۔ میری قبر کی مٹی سے گل لالہ (میرا عشق) زیادہ اچھا ہے کہ وہ میری طرح خاموش بھی ہے اور خون سے بھری نوا بھی پیدا کرتا ہے

علامہ اقبالؒ (ارمغان حجاز ۔۴)

۔☆۔☆۔☆۔

علامہ اقبالؒ:

علامہ اقبالؒ کی آخری سانسیں چل رہی تھیں۔ان کی نگاہ آسمان کی جانب تھی اور لکنت زدہ زبان سے ان کے آخری الفاظ شعری قالب میں ڈھل کر ادا ہو رہے تھے

سرور رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سرآمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید
ارمغان حجاز۔(۴)

ترجمہ: وہ پرانا نغمہ جو چلا گیا وہ لوٹ کے آتا ہے یا نہیں آتا، حجاز سے ٹھنڈی ہوا (سکون کا پیغام) آتا ہے یا نہیں آتا۔اس فقیر کا آخری وقت آ گیا ہے کوئی دوسرا (اس کی جگہ لینے والا) دانائے راز آتا ہے یا نہیں آتا۔

گویا علامہ اقبال کسی ''دگر دانائے راز'' کے انتظار میں تھے۔(بالکل اسی طرح جس طرح کسی ابدال کے انتقال پر فوراً کسی دوسرے ابدال کی تعیناتی ہو جاتی ہے تاکہ ابدالوں کی گنتی یعنی چالیس کا عدد مکمل رہے)۔اس وقت تو پتہ نہیں ''دگر دانائے راز'' یا ''نئے ''ابدال'' کون ہوئے ہوں گے لیکن یہ بات عیاں ہے کہ حضرت علامہ خود مرتبۂ ابدالیت پر ضرور فائز رہے ہوں گے کیونکہ ان کا ایک ایک شعر آفاقی، الہامی اور غیر مرئی قوت کا عکاس ہے۔ رہا حضرت علامہ کا یہ شعر:

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

یقیناً اس شعر کے مصداق ہم، آپ ہیں۔ ورنہ حکیم الامت اگر ''خود آگاہ'' نہ ہوتے تو خود آگہی کا درس کس طرح دیتے؟ وہ عرفان نفس سے عرفان الٰہی تک کے تمام راستے کے حقیقت شناس نہ ہوتے اور بحر معانی کے غواص نہ ہوتے تو ''اسرار خودی''، ''رموز بیخودی'' اور ''جاوید نامہ'' جیسی آفاقی تخلیقات کے خالق کیسے اور کیونکر ہوتے؟ علامہ اقبال جیسے دیدہ ور تو نرگس کی صدیوں کی بے نوری کے مسلسل ماتم کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے دیدہ ور جو جسمانی طور پر طبقِ زمیں پر ہوتے ہیں۔ لیکن تمام عالم خواہ وہ عالم ملکوت ہو یا عالم لاہوت، عالم جبروت ہو یا عالم ناسوت ان کی بصیرت کے احاطے میں ہوتا ہے۔ ایسے ''دیدہ ور'' جن کا ضعف بشری زمانے کی بیکرانیوں کے مشاہدہ وتصرف میں رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ نہ بعد زمانی آڑے آسکتا ہے۔ اقبال جیسے لوگوں کے سامنے تاریخ عالم ہمیشہ اصلی حالت میں رہی ہے۔ ملوکیت اور زمانہ سوز عیاروں کے دیئے ہوئے لباس اور آوارہ مزاج دانشوروں کے کئے ہوئے میک اپ کے بغیر۔ ہر قسم کی من گھڑت واقعاتی آلودگی سے پاک۔ تاریخ کے سٹیج کے تمام کرداروں، واقعات اور مناظر کی حقیقت تک ان جیسے دیدہ وروں کی رسائی، بغیر کسی واسطے کے ہوتی ہے، ایسے تاریخ ساز لوگ (باز مانہ ستیز) ملک وقوم بناتے ہی نہیں تہذیب و تمدن کی بنیادیں بھی استوار کرتے ہیں۔ یہ لوگ محو غم دوش رہتے ہوئے بھی (محض ناسٹیلجیا کا شکار نہیں ہوتے) فکر فردا کا بار گراں اٹھائے رکھنے کی صلاحیت وحوصلہ رکھتے ہیں۔ ہماری خوش نصیبی، ہماری خوش بختی کہ اقبال جیسا دیدہ ور ہماری قوم میں پیدا ہوا اور ہماری کم نصیبی کہ ہم اقبال سے آگاہ ہی نہیں ہو سکے (کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہیں۔) ہم پیام اقبال کو سمجھ ہی نہ پائے۔ اور ہم سمجھتے بھی کیسے کہ:

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

اقبال کے سارے کلام کو اگر کائنات کے کسی جغرافیائی، حیاتیاتی، نظام سیارگان یا نظام شمسی کی قبیل کے کسی نظام کا مثیل فرض کیا جائے تو ان کا سارا کلام ایک بنیادی سیارے کے گرد گردش کرتا ہے۔ گو علامہ کے نظام میں متعدد سیارے ہیں جن کے اپنے اپنے محور ہیں اپنے اپنے مدار ہیں۔ان میں ہر سیارہ ایک مکمل کائنات تو ہے لیکن وہ اسی بنیادی سیارے (مرکزی سیارے) سے حیات کشید کرتا ہے۔ ہر سیارے کی زندگی اس مرکزی سیارے کی زندگی کے تابع ہے۔علامہ کے محیط کائنات کا بنیادی سیارہ ایمان یا عشق ہے۔عشق کے بے شمار رنگ ہیں لیکن سب کا منبع نور ایک ہے وہیں سے سب رنگ روشنی حاصل کرتے ہیں۔وہ نور ''نور عشق الٰہی'' ہے۔اس نور تک ایک دوسرا دریائے نور رہنمائی اور نشاندہی کرتے ہوئے لے جاتا ہے اور اس ذات حق کے عشق کی طلب کرنے والے ہر کسی کو اسی نور کی رہنمائی حاصل کرنا ضروری ہے اور اس رہنمائی کیلئے اس نور والے سے شدید محبت، ایمان اور پرخلوص وآنکھیں بند کر کے اتباع کی حاجت ہے۔ علامہ کے نزدیک اللہ کے عشق کی دنیا میں قدم رکھنے کیلئے اللہ کے سچے اور آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عشق لازم ہے۔اللہ ایسے شخص کا دعویٰ عشق قبول ہی نہیں کرتا جس کی گردن میں عشق رسول ؐ کے شناخت نامے کا ٹیگ آویزاں نہ ہو۔گردن میں رسول ؐ کی غلامی کا طوق اور دل عشق رسول ؐ سے لبریز، بس یہی شناخت نامہ شہر عشق الٰہی میں داخلے کیلئے ضروری ہے۔ایک اہم بات کہ علامہ علیہ الرحمہ خود اپنے لئے اور اپنے جملہ سیارگان (تصورات) کی حیات کے لئے عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم ، رسول اللہ ؐ کی غلامی کا ٹیگ آویزاں کرتے ہوئے اپنے آقا ومحبوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روشنی کے اکتساب کی گدا مانگتے ہیں:۔

''اے نبیٔ پاک ﷺ اس کائنات کی شاہکار تخلیق کی ہر نشانی، زمان کا ہر لمحہ، مکان کی ہر ساعت کی اصل غایت آپ ﷺ ہی ہیں۔کائنات میں اس وقت جو ہوا ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے یا جو کچھ ہونے جا رہا ہے اس کی حقیقت آپ ؐ ہی ہیں۔ دنیا کی ہر بوقلمونی آپ ؐ کی ذات ہی کی رہین منت ہے۔ دنیا میں خوشبوؤں کے، رنگوں کے تمام قافلے آپ ؐ ہی کی ذات

کی تلاش میں ہیں۔اس لئے کہ آپؐ ہی عشق کی مکمل تصویر ہیں۔جس کی تلاش میں سارا زمانہ ہے۔سارے علوم کے ماخذ و مرجع آپ ہی ہیں۔لیکن آج آپ کی سیرت کا درس دینے والے محض لفظوں کے بازی گر ہیں ان کی نگاہیں آپ کے مقام سے نا آشنا نظر آتی ہیں۔کہ کور نگاہی، کم بصری ان کے سد راہ ہے وہ لفظ وحروف کی دیوار سے آگے دیکھ ہی نہیں سکتے۔ ان کا ذوق مردنی کا شکار ہے۔کہ ان کی دوڑ ان کے شکم کو عبور کر ہی نہیں سکتی۔ادھر خانقاہوں میں جہاں کبھی عشق کا درس دیا جاتا تھا، جہاں خلوت میں عشق کی تہذیب، عشق کا اخلاق سکھایا جاتا تھا آج وہاں دھول اڑتی ہے جو سیکھنے والے ہیں ان میں طلب کا فقدان ہے اور جو سکھانے والے ہیں ان کے پاس سکھانے کو کچھ ہے ہی نہیں۔دونوں طرف کی جانے والی دعائیں بھی صرف اپنی مختصر سی زندگی کیلئے ہوتی ہیں اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت کے حاصل کرنے کیلئے نہیں ہوتیں۔میری نوائے قلم میں میرے خیال میں میری نوائے پریشاں، میری تمام تگ و دو ملت کے شاندار ماضی کی بازگشت ہے۔آج تہذیب حاضر کی تمام چمک دمک محض نمود و نمائش اور ظاہری زیبائش کا بھرم قائم رکھنے کیلئے ہے۔لیکن میری سانسوں میں بس ایک ہی آرزو کی مہک ہے اور وہ یہ کہ میری قوم کو اپنے خالی دلوں میں آرزو کا پودہ اگانے کا خیال آجائے۔اور اس پودے کی نشو ونما پر آمادہ ہو جائیں۔دل جدوجہد کی راہ پر آجائیں اور کبھی نہ ختم ہونے والی جدوجہد ان کی منزل ہو جائے منزل قریب آکر بھی دور ہو جائے۔کہ یہی سعی انسان کی زندگی کی ضمانت ہے۔

آیۂ کائنات کا معنیٔ دیریاب تو
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو
جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق
خلوتیانِ میکدہ کم طلب و تہی کدو
میں کہ مری غزل میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

باد صبا کی موج سے نشوونمائے خار و خس
میرے نفس کی موج سے نشوونمائے آرزو
خون دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش
ہے رگ ساز میں رواں، صاحب ساز کا لہو
فرصت کشمکش مدہ ایں دل بے قراررا
یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را
(فرصت کشمکش نہ دے اس دل بے قرار کو
اک دو شکن زیادہ دے گیسوئے تابدار کو)

علامہ کے چار عشروں کے تخلیقی، تدریجی سفر میں عشق کی اصطلاح نے بھی تدریجی ارتقا کا مرحلہ طے کیا ہے۔ ان کے تصور خودی کے تحت جب انسان خودی کے مراحل طے کرنے میں محو ہے تو اس کے سامنے کائنات کی ایک الگ سے تصویر بنتی ہے۔ جس میں اس کا کردار الگ نوعیت کا رنگ دکھتا ہے۔ فرد پوری انسانیت کے متعلق فکر میں مبتلا ہوتا ہے۔ اور انسانیت کی بہتری کیلئے اس کے اندر ایک جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ہمت، حوصلہ، عزم اور بے خوفی اس جذبے کے بنیادی اراکین ہیں۔ وہ نتائج سے بے پرواہ ہو کر حیات انسانی کیلئے عمل پر مستعد ہو جاتا ہے۔ اب اس کے ذہن میں بس جاتا ہے کہ میں قطرہ نہیں سمندر ہوں پس یہی مقام عشق کا ہے کہ عشق مصدر و مقصود حیات ہے۔ اور وجہ تکوین و ارتقائے کائنات ہے۔ جو تمام ہستی کی رگ و پے میں جاری اور سنگ و نبات اور حیوان و انسان پہ کسی نہ کسی رنگ میں طاری ہے۔ اقبال کے سامنے جو نیا تصور عشق ہے اس کے تقاضے بھی نئے ہیں اور اس کا صحرا بھی نیا ہے۔ اعلیٰ نصب العین سے وابستہ ہو کر جذبۂ عشق تعمیری و تخلیقی سرگرمیوں کا زبردست محرک بن جاتا ہے۔ لہٰذا دیوانگان عشق کی جولاں گاہ صحرا نہیں بلکہ انسانی معاشرہ ہے:

گئے وہ ایام اب زمانہ نہیں ہے صحرا نوردیوں کا
جہاں میں مانند شمع سوزاں میانِ محفل گداز ہو جا

صدیوں سے گہری نیندسوئی ہوئی قوم کو جگانا کوئی معمولی کارنامہ نہیں ۔لیکن اس کا ادراک کتنوں نے کیا؟ غیروں سے کیا گلہ اقبال کی اقبال مندی کے سورج کو گہنانے کا کام اپنوں نے ہی کیا۔ اور پھر ان لوگوں نے جو بزعم خود اقبال کے مفسرین میں شمار ہونے کے دعویدار تھے۔انہوں نے قوم کو الجھا دیا۔ کہ اقبال شاعر فلسفی ہیں کہ فلسفی شاعر؟ وہ پین اسلام ازم کے داعی ہیں یا سیکولرازم کے؟ وہ مارکس ازم سے متاثر ہیں یا مسولینی کے فاشزم سے؟ وہ گوئٹے کے خوشہ چین ہیں یا برگساں کے؟ نیٹشے کے یا مولانا رومؒ کے؟ وہ حافظ کے ناقد کیوں ہیں؟ انہیں شیخ اکبر سے اعراض کیوں ہے؟ انہیں امام رازی کی تفسیر سے کیا الجھن ہے؟ وہ حسین ابن حلاج منصور کے نعرۂ انا الحق پر ایمان کیوں نہ لائے؟ وغیرہ وغیرہ۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہماری ملت اسلامیہ کے جسم کو پارہ پارہ کرنے کیلئے عربی گرامر (صرف ونحو) کے مسائل یا نور بشر، حاضر ناظر کے مسئلوں کو اس طرح کے دوسرے مسائل کو (جن سے ایک عام مسلمان کا کوئی لینا دینا نہیں ہے) مرکز توجہ بنا دیا گیا۔ علامہ اقبال کے سادہ پیام کو عام کرنے کی بجائے پیچیدہ بحثوں کا آغاز ہوا۔ عہد حاضر میں سرمایہ دارانہ، معاشرے کے بیچ tug of war کے کھلاڑیوں نے ہماری نوجوان نسل کے کچے ذہنوں کو جنسی آوارگی اور ذہنی عیاشی کی جانب مائل کرنا شروع کیا۔ اور پھر شاعری کی معراج یہ قرار پائی کہ کوئی شاعر جو مذہب سے جتنا دور ہے اتنا ہی بڑا شاعر ہے۔ لامذہبیت کا یہ عفریت طلسم خانۂ افراسیاب کے حجرۂ نفت بلا سے اقبال کے اثرات کو رد کرنے کیلئے بہت کوششوں کے ساتھ لایا گیا۔ اب یہ عفریت جب پوری قوم کے نظریات کو ہڑپنے پر اتارو ہے تو ان بزرجمہروں کو سمجھ نہیں آرہا کہ اس کا ردّ کہاں سے تلاش کیا جائے؟ حالانکہ عام قاعدے کلیے کے مطابق اس سحر کا ''ردِ سحر اسم'' کلام اقبال کے اندر ہی تلاش کیا جانا چاہیئے تھا۔

ہم نے اقبال پر دوسرا بڑا ظلم یہ کیا کہ اقبال کو قوالوں، تھڑے والوں اور عطائی دانشوروں کے حوالے کر دیا اب ہم علامہ اقبال کا نام سنتے ہیں تو اس نام کے سابقے لاحقے یعنی حضرت اور رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ الفاظ لگا کر اور سروں کو احتراماً جھکا کر مطمئن ہو لیتے ہیں کہ چلو ہم نے

حکیم الامت کا حق ادا کر دیا۔ اقبال، اس کے پیغام اور اس درد کو سمجھے، جانے اور محسوس کئے بغیر۔ ایک اقبال پر ہی کیا موقوف ہمارا رویہ تو ''نعوذ باللہ'' اللہ میاں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہے۔ ہم عبادت کرتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں، ذکر کرتے ہیں، دعا کرتے ہیں یہ جانے بغیر کہ ہم کیا پڑھ رہے ہیں؟، کیا کر رہے ہیں؟، اور اللہ سے کیا مانگ رہے ہیں؟ کچھ ایسا ہی معاملہ ہمارا اقبال کے ساتھ بھی ہے۔ آج ہم بڑے طمطراق کے ساتھ اقبال کے اشعار استعمال کرتے ہیں۔ اپنی تقریروں میں، اپنے خطبات میں ''تاویل سے قرآں کو بنا دیتے ہیں پاژند'' کے مصداق۔ بے محل، بلا تحقیق، غلط ترتیل، غلط تقطیع کے ساتھ۔ ٹرکوں، رکشاؤں اور بسوں ویگنوں اندر باہر، دیواروں بینروں اور اشتہارات میں۔ ہر جگہ۔

حالانکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ ہم پیام اقبال کی تسہیل کے ساتھ اس کی ترویج کا خاص اہتمام کرتے گنجلک اصطلاحات کا ملمع چڑھا کر عام آدمی سے اسے دور کرنے کی دانستہ کوشش نہ کرتے، برگسان، نیٹشے، دانتے، اور دوسرے مغربی مفکرین کی مشکل اصطلاحات اور تشریحات کو خالص فلسفیانہ انداز میں بیان کر کے اپنے آپ کو ماہرین اقبالیات کہلوانے کی بجائے مقلدین اقبال سمجھے جانے کو کافی سمجھتے۔ آج تمام سکولوں کے بچے صبح سویرے اسمبلی میں ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری'' کورس میں گاتے ہیں۔ وہاں اس بات پر تو دھیان دیا جاتا ہے کہ کوئی سُر بگڑنے نہ پائے۔ آوازوں کا آہنگ درست رہے، بچوں کی آوازیں سریلی ہیں یا نہیں ہیں، لیکن کوئی ان بچوں کو یہ نہیں سمجھاتا کہ اس نظم میں علامہ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ اس کا عنوان ''بچوں کی دعا'' کیوں ہے؟ اگر ہمارے عہد کے بچوں کو اس دعا کے مفہوم سے آگاہ کر دیا جائے تو ان بچوں کے دلوں میں اس نظم یا دعا کی ہر بات راسخ ہو کر عمل پذیر ہو سکتی ہے اور یہیں سے معاشرے کی اصلاح کا کام شروع ہو سکتا ہے۔ اقبال اکادمی میں ایک علیحدہ سے شعبہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ اساتذہ کی تربیت کی جا سکتی ہے، ان کیلئے اقبالیات کے موضوع پر ریفریشر کورسز کا اہتمام کیا جا سکتا ہے ہر یونیورسٹی، کالج یا ابتدائی درجے کے تعلیمی اداروں میں اقبالیات کی تدریس اس سطح کے معیار کے مطابق کی جا سکتی ہے۔ علامہ ایک ننھے

سے بچے سے ایک بزرگ دانشور تک سب کے اقبال ہیں اور سب کی اقبال مندی، وطن کے اقبال اور ہم وطنوں کی اقبال مندی کے ضامن بن سکتے ہیں اگر ان کے پیغام کو دین اسلام کی روشنی میں پڑھا، پڑھایا، سمجھا اور سمجھایا جائے۔

علامہ اقبال کا تصور عشق۔۔۔

ا۔ عشق اصل کائنات:

عاشق آں نیست کہ لب گرم فغانے دارد
عاشق آں است کہ بر دو کف دو جہانے دارد
عاشق آن است کہ تعمیر کند عالم خویش
در نسازد بہ جہانے کہ کرانے دارد
دل بیدار ندادند بہ دانائے فرنگ
ایں قدر ہست کہ چشمے نگرانے دارد
عشق ناپید و خرد می گزدش صورت مار
گرچہ در کاسۂ زر لعل روانے دارد
دُرد من گیر کہ در میکدہ ہا پیدا نیست
پیر مردے کہ مئے تند و جوانے دارد

(۱)

ترجمہ: ا۔ اسے عاشق نہیں کہتے جو اپنے لبوں سے نالہ وشیون کرتا ہے بلکہ عاشق تو وہ ہے جو دونوں جہان اپنی ہتھیلی پر رکھتا ہے۔ (دونوں جہان اس کی دسترس میں ہوتے ہیں)

۲۔ عاشق وہ ہے جو اپنی دنیا آپ تعمیر کرتا ہے اور وہ دوسروں کا دست نگر نہیں ہوتا نہ دوسروں کی تعمیر کردہ دنیا میں رہنا پسند کرتا ہے۔ اور وہ ایسی دنیا سے تعلق بھی نہیں رکھتا جس کی کوئی حد مقرر ہو۔

۳۔ یورپ کے دانشوروں کو (قانون قضا وقدر نے) روشن دل نہیں دیا صرف اس قدر ہے کہ وہ چشم بینا رکھتے ہیں (جس سے وہ باہر کی دنیا کے ذرے ذرے کا مشاہدہ تو کر سکتے ہیں لیکن دلوں کے اندر کی حقیقت کے مشاہدے یا تجربے سے محروم رہتے ہیں۔)

۴۔ اہل یورپ کے ہاں ان کے دانشوروں میں جذبۂ عشق کا فقدان ہے اور ان کی عقل انہیں سانپ کی طرح ڈس رہی ہے (وہ عقل سے کائنات کے اسرار تو سمجھ سکتے ہیں لیکن خدا کی معرفت۔ روح کی معرفت۔ سے دور ہیں)۔ اگرچہ وہ سونے کے جام میں لعل و جواہر کی طرح قیمتی اور چمکتی شراب رکھتے ہیں۔ (عیش وعشرت کے سبھی لوازمات موجود ہیں) لیکن ان کے دل معرفت الٰہی سے کالی ہیں۔

۵۔ مجھ سے پیالوں میں بچی ہوئی تلچھٹ لے (میں نے اپنی شاعری میں خود شناسی، خدا شناسی اور عشق کی جو بات کی ہے اسے سمجھنے کی کوشش کر) کیونکہ شراب خانوں میں ایسی شراب موجود نہیں جو میرے پاس ہے (یہ شراب مجھ تک میرے اسلاف کے ذریعے پہنچی ہے) اور ایسا ساقی تلاش کر جس کی شراب تیز اور سرور والی ہو (معرفت الٰہی کے نشے سے بھرپور ہو۔

اقبال کے تصور عشق کے باب کے شروع میں عرض کیا جا چکا ہے کہ علامہ کے نظام کائناتِ کلام کا مرکزی سیارہ ''عشق'' ہے اور دوسرے تمام تصورات اسی سیارے (تصور) سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ ہر فلسفے کی بنیاد عشق ہے۔ یہی عشق ایمانیات کی بھی اصل ہے اور دینیات کی بھی۔ علامہ کے فلسفہ خودی کا محرک بھی یہی ہے اور بے خودی کا بھی یہی، ان کے تصور مرد مومن کا حامل ''مرد مومن'' ایک مکمل عاشق اور سراپا عشق ہے۔ یہ اسی تصور کا نظریہ ہے کہ ''عشق تمام مصطفےٰ'' علامہ اقبال کے تصور مرد مومن کی آئیڈیل شخصیت حضور اقدس حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ ہیں اور یہاں ''عشق تمام مصطفےٰ'' میں اسی تصور کا تکملہ ہے۔ یہ کائنات اور اس میں انسان اللہ کے اس ارشاد کے مطابق خلق کیے گئے ''میں زمین میں اپنا نائب بنانا چاہتا ہوں'' سو اصلی نیابت کا حق صرف ایک ہی ہستی کو حاصل ہو سکتا ہے اور وہ ہیں حضور نبیٔ

محترم حضرت محمد ﷺ۔ سو وہی ''مردمومن'' اور وہی ''عشقِ تمام'' (عشق اور ایمان مترادف ہیں)۔ یہ اس دعوے کا ثبوت ہے کہ علامہ کا ''تصورِ عشق'' ہی دراصل ان کے تمام فلسفے کی بنیاد ہے۔ عشق تمام کی منزل اللہ اور راہ نوردانِ عشق کی منزل عشق رسول ﷺ۔ علامہ اس تصور عشق کے خالق نہیں ہیں، وہ عشق کے شارح ہیں۔ عشق کا خالق تو خود خالق ازل ہے۔ جس نے اس تصور کو ایمان، اسلام، یقین، محبت کے نام دلوا کر اس کی تشریح و دعوت کیلئے سوا لاکھ انبیاء کو دنیا میں بھیجا سب نے اپنے اپنے منصب کا حق ادا کیا نبی آخر الزمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایمان و یقین کی دعوت دی، اللہ نے خود اللہ سے محبت کو اس ایمان و یقین کی کسوٹی قرار دیا ''والذین اٰمنو اشد حبا للّٰہ'' اور ایمان والے اللہ سے شدید محبت والے ہیں۔ یہ محبت عشق الٰہی ہے۔ علامہ نے جگہ جگہ اسی عشق کی تشریح کی ہے۔ علامہ بھی حکم الٰہی اور اسوۂ رسولؐ کے تابع ہیں وہ اس سے باہر کا سوچتے بھی نہیں۔ ان کے ہاں بھی (اللہ کے حکم کے مطابق) عشق الٰہی کیلئے عشق رسولؐ شرط اول ہے اور عشق رسولؐ کیلئے اتباع رسولؐ لازم ہے۔

علامہ اقبال عشق کو اصل کائنات کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک علم کی دو شاخیں ہیں ایک theory ہے یعنی عقل اور دوسرا practical یعنی عشق۔ ایک سرتاپا خیال ہے اور دوسرا سرتاپا عمل جو اعضاء کا رہین منت نہیں۔ حضرت بایزید بسطامیؒ اور حضرت بوعلی سیناؒ کے درمیان مکالمے کے اختتام پر حضرت بسطامیؒ کا یہ کہنا کہ ''جو یہ کہتے ہیں (جس عالم کے بارے میں ان کا علم کہتا ہے) میں اسے براہ راست دیکھتا ہوں''۔ ایک عالم اور عشق کے راستے کے ایک معروف راہ نورد کے فرق کو ظاہر کرتا ہے۔

حضرت علامہ اقبال کے ہاں بھی زیادہ مستعمل اصطلاح ''عشق'' ہے۔ علامہ نے عشق کو جن معنوں میں استعمال کیا ہے ان کے معاصر تنقید نگاروں اور شعراء کے ایک طبقے نے ان کو آڑے ہاتھوں لیا۔ ان حضرات کے ہاں ''عشق'' حسن کو پا لینے اور ہوسنا کی کا متبادل لفظ تھا۔ لیکن علامہ نے عشق کی اصلاح کو جن معنوں میں برتا اس سے مراد وہ جذبہ ہے جو ستاروں پر

کمند ڈالنے کا محرک ہو، وہ جذبہ جو ایک انسان 'انسان کامل' کو ایک جست میں زمیں و آسمان کا فاصلہ طے کروالیتا ہے۔ عشق بندے یا مردِ مومن کو خدا سے بالواسطہ ملانے کا محرک جذبہ ہے، یہ واسطہ کوئی اور نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات ہے۔ مخلوق کو خالق سے متعارف کرنا ہی دراصل نبوت کا حقیقی کام ہے اسی کام کیلئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کرامؑ مبعوث فرمائے اور سب سے آخر میں خاتم المرسلین آقائے نامدار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ علامہ اقبال کی نظر میں عشق کی تصویر اس طرح ہے

عشق دم جبرئیلؑ عشق دل مصطفیٰؐ
عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام

فلسفۂ اقبال کے ایک معتبر شارح ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کہتے ہیں:

''جس عشق کی مدح سرائی حکماء صوفیاء اور شعرائے متصوفین نے کی ہے اس کے دو پہلو ہیں ایک تاثراتی اور جذباتی اور دوسرا نظریاتی۔ یہ دونوں پہلو ایک دوسرے سے جدا بھی ہو سکتے ہیں اور باہم مخلوط بھی ہوتے ہیں۔ جن حکماء کا میدان فقط عقلیت ہے ان کے ہاں اس چیز سے متعلق نظریات ملتے ہیں جسے انہوں نے مشاہدۂ کائنات وحیات سے مدد لے کر استدلال سے مستحکم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے مقابلے میں ایسے صوفیاء بھی ملتے ہیں جن کے ہاں عشق کی کیفیت بڑے جوش وخروش کے ساتھ موجود ہے لیکن وہ اس کی عقلی توجیہہ کی کوشش نہیں کرتے۔ یہ کیفیت ان سے دوسروں کی طرف برکت، صحبت اور فیض روحانی سے کم وبیش منتقل ہوتی ہے۔ راہ استدلال تو دراز اور پر پیچ ہے اور تسکین آفرین بھی نہیں لیکن لبریز عشق، عاشق کی توجہ ایک لمحے میں مستفیض انسان کی کایا پلٹ دیتی ہے'' (۲)

علامہ کے ہاں عشق ایک پاکیزہ جذبہ ہے جو کائنات کے سربستہ راز کھولنے میں انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔ عشق علیم وبصیر ہے، عشق ذوق یقین وایمان کی کیفیت ہے، وہ عشق جس کا دیوتا اندھا ہے وہ یورپ کا تصور ہے، ادھر اقبال کی آنکھوں کا سرمہ ''خاک مدینہ ونجف'' ہے اقبال کا عشق ، جوش صاحب کے '' اٹھارہ بڑے بڑے عشقوں میں سے سترہ

عشقوں۔۔۔'' جیسا نہیں، یہ جنسی ہیجان نہیں، نفسیاتی مسئلہ نہیں، جنسی مزدکیت نہیں، جنسی تلذذ بھی نہیں۔ بلکہ حضرت ابراہیمؑ کو آتش نمرود میں بے خطر کود جانا سکھانے والا، بدر کے میدان میں تقریباً نہتے ساتھیوں کے ساتھ ایک بڑے لشکر سے بھڑ جانے، کربلا میں مٹھی بھر ساتھیوں، خاندان کے بچوں اور عورتوں کو لے کر ایک بڑی سپاہ کے مقابلے میں آجانے اور اپنی جان، اپنے ہمراہیوں کی جانوں کو دین اسلام کی سربلندی کیلئے قربان کروا لینے کے جذبے کا نام ہے۔

صدق خلیل بھی ہے عشق، صبر حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

عشق جس کی ایک جست میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حدود آفاق کو عبور کر جائیں، اور وہ عشق جو خدا کا کلام، رسول خدا کا دل، جبرئیل کی قوت، اس کی سانس (روح) ہے۔ اللہ خالق کل، اس کا کلام سب کلاموں سے افضل، جبرئیلؑ سب فرشتوں کے سردار اور اللہ کے اہم ترین مشن پر عظیم ترین کام کرنے والے، اور اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے محبوب ترین رسول، عشق الٰہی کا مکمل ترین نمونہ:

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمیں و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

بقول ڈاکٹر طاہر فاروقی ''اسی لئے عشق کی برکت سے عاشق کو بے پناہ قوت حاصل ہو جاتی ہے اور وہ ابوالوقت اور ابوالحال بن جاتا ہے، انفس و آفاق اس کے زیر نگیں ہوتے ہیں اور وہ جن و ملائکہ کو صید زبوں سمجھنے لگتا ہے'' (۳)

صوفیائے کرام نے عشق کے جتنے مراحل بیان کئے، ہر ایک شارح عشق کے ہاں ان کی تعداد مختلف ہے ان کے مدارج کے ساتھ کوئی نہ کوئی عدد وابستہ ہے لیکن علامہ اقبال زمانوں اور ناموں کے حوالے سے عشق کے مدارج کو تعداد میں محدود نہیں کرتے بلکہ انہیں لا محدود کہہ رہے ہیں۔ کیونکہ یہ طے نہیں ہوا کہ عشق کے مدارج بس یہی ہیں۔ عشق لا فانی ہے

اور لا فانیت لامتناہیت کی دلیل ہے۔روح ہبوط آدم سے یا جسم میں منتقل ہوتے ہی اپنی اصل یعنی روح الا روح کی جانب سفر کا آغاز چاہتی ہے،عشق کی ابتدا وہیں سے ہوتی ہے اور انتہاء نامعلوم۔لہٰذا عشق مدارج کے اعتبار سے عدد میں مقید نہیں ہوسکتا ۔۔۔۔۔۔

علامہ کے عشق کے حوالے سے جو نتائج اخذ ہوتے ہیں ان کے کے مطابق:

۱۔ مرد خدا کے عمل کی سمت عشق سے متعین ہوتی ہے۔

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات، موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
(۴)

۲۔ عشق غیر فانی ہے اور موت اس پر حرام ہے۔

عشق شبخونے زدن بر لا مکاں
گور را نادیدہ رفتن از جہاں

۔عشق لا مکاں پر شبخون مارنے کا نام ہے اور قبر دیکھے بغیر رخصت ہو جاتا ہے۔(اسے موت نہیں آتی،عشق امر ہے،صاحب عشق اگر جسمانی طور پر مر بھی جائے تب بھی وہ حقیقت میں زندہ ہوتا ہے۔اور اسے رزق۔نعمتیں۔دی جاتی ہیں۔)

اے حرم قرطبہ عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام، جس میں نہیں رفت و بود

دنیا میں جس کسی نے کوئی شاہکار تخلیق کیا اس کے پس پردہ یا محرک عشق ہی کی قوت کارفرما رہی ہے صدیوں سے ایستادہ اپنے ماضی کی شاندار روایات کی داستان بزبان حال

سنانے والی مسجد قرطبہ آج بھی اپنے تعمیر کرنے والوں کی شدت عشق کی گواہ ہے۔ کیونکہ عشق ایسی قوت ہے جو زوال آشنا نہیں۔ اسے ہمیشگی حاصل ہے عشق امر ہے۔ اس پر موت کبھی نہیں آتی۔ اور اس میں کہیں کسی ماضی کا شائبہ تک نہیں یہ تو ہمیشہ لمحہ حال میں رہنے والی قوت ہے۔

۳۔ عشق کی ہمت و حوصلہ اور اس کا عزم غیر متزلزل ہے۔ اور یہ ہر قسم کے نامساعد حالات کا کامیاب مقابلہ کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

کوہ پیش عشق چوں کاہے بود
دل سریع السیر چوں ماہے بود
زور عشق از بادو خاک و آب نیست
قوتش از سختیٔ اعصاب نیست
عشق با نان جویں خیبر کشاد
عشق در اندام مہ چاکے نہاد
کلّۂ نمرود بے ضربے شکست
لشکر فرعون بے حربے شکست

(۵)

ترجمہ۔ عقل محنت سے پہاڑ میں تو شگاف ڈال سکتی ہے یا اس پہاڑ کے گرد طواف کرتی رہ جاتی ہے، سر پٹکتی رہ جاتی ہے۔ (پہاڑ عقل کے نزدیک ایک مضبوط، بلند، سخت ترین اور مشکل ترین ہدف ہے)۔

۔عشق کے نزدیک پہاڑ گھاس کے ایک کمزور تنکے کی مانند ہے (وہ اسے کوئی رکاوٹ نہیں سمجھتا نہ اسے کوئی حیثیت دینے پر آمادہ ہے)۔ اور (عشق سے) دل چاند کی طرح تیز رفتار ہوتا ہے، وہ اپنی منزل جلد ہی حاصل کر لیتا ہے

۔عشق کا زور، اس کی قوت ہوا یا مٹی یا پانی سے مرتب نہیں، نہ اس کی قوت جسمانی طاقت اور پٹھوں کی سختی سے عبارت ہے (عشق کی قوت کا تعلق جسمانی طاقت سے ہرگز نہیں)

۔عشق نے جو کی روٹی کھا کر قلعۂ خیبر فتح کیا۔ یہ عشق ہی تھا جس نے چاند کے جسم کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔(حضورؐ کا معجزۂ شق القمر)۔

۔اسی عشق نے بغیر ضرب کے نمرود کا جبڑا توڑ دیا نمرود کی سلطنت کو پارہ پارہ کر دیا۔اور یہ عشق ہی تھا جس کے طفیل فرعون کسی جنگ کے بغیر مارا گیا۔اور لشکر فرعون کو شکست ہوئی۔

۴۔عشق زمان ومکان کی حدود سے ماورا ہو جاتا ہے۔

جاوید نامہ میں علامہ(زندہ رود)،مولانا رومؒ(زروان) کی زبانی عشق کے بارے میں فرماتے ہیں:

می نداند عشق سال و ماہ را
دیر و زود و نزد و دورِ راہ را
عقل در کوہے شگافے می کند
یا بگرد اُو طوافے می کند
عشق در جاں چوں بچشم اندر نظر
ہم درون خانہ ، ہم بیرون در
عشق ہم خاکستر و ہم اخگر است
کار او از دین ودانش برتر است
عشق سلطان است و برہان مبیں
ہر دوعالم عشق را زیر نگیں
لا زماں و دوش فردائے ازو
لامکان و زیر و بالائے ازو

ترجمہ :۔عشق ماہ وسال کو نہیں جانتا وہ راستے کے دیر وزود(زماں)اور نزدیک ودور (مکاں) کو نہیں جانتا(عشق کے نزدیک زمان ومکاں کی کوئی حقیقت نہیں نہ وہ ان کی کسی پابندی کی پرواہ کرتا ہے۔

۔عشق جان و روح میں اس طرح ہے جیسے آنکھ میں نظر۔ جو گھر (آنکھ) کے اندر بھی ہے اور بیرون در بھی (پلکوں سے باہر بھی سارے عالم کو دیکھتی ہے)

۔عشق راکھ بھی ہے اور شعلہ بھی ہے، اس کا کام علم الکلام اور عقل و دانش سے بڑھ کر ہے۔

۔عشق سلطان یعنی قوت بھی ہے اور روشن دلیل بھی، دونوں جہاں عشق کی قلمرو میں ہیں۔ (سورۃ الرحمٰن کی اُس آیہ کہ جانب اشارہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ تم زمین و آسمان کی پہنائیوں کو عبور نہیں کر سکتے " لا تنفذون الا بسلطان " سلطان یعنی قوت کے بغیر اور یہ قوت عشق کی ہے۔ عشق کائنات کو مسخر کر لیتا ہے۔ اور لامکاں تک جا پہنچتا ہے۔ اس کی دلیل کیلئے انبیاء کے تصرفات دیکھے جا سکتے ہیں۔)

۔اگرچہ عشق کا کوئی زمانہ نہیں۔ مگر ماضی و حال سب اسی سے ہیں۔ وہ لامکاں ہے لیکن پستی و بلندی (مکاں) اسی سے ہے گویا عشق اس عالم کے وجود میں آنے کا باعث ہے۔ (۶)

۵۔ عشق راستے بناتا ہے، محض بنے بنائے راستوں پر چلنا اس کی سرشت نہیں۔

عشق فقیہہ حرم، عشق امیر جنود
عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام

عشق اپنی فقہ اپنے قوانین خود مرتب کرتا ہے اور عشاق اسی پر عمل کر کے ہی اصل مقام حاصل کر سکتے ہیں عشق راستہ بھی ہے اور اس کا مسافر بھی ہے یہ اپنے راستے خود بناتا ہے اور خود اس پر چلتا ہے کسی دوسرے کے بنائے ہوئے رستے پر چلنا عشق کی سرشت میں نہیں۔ یہ اپنے لشکر کا خود ہی امیر (امیر العسکر) ہے کائنات کے سارے مقام اس کے اپنے مقام ہیں اور یہ ہر مقام کا قائم ہے کسی ایک مقام کو یہ اپنی منزل قرار نہیں دیتا، یہ ہمیشہ قریب سے اقرب کی جانب بڑھنے کو ترجیح دیتا ہے۔ محبوب کے قریب سے قریب تر ہونے کی جدوجہد اس کی سرشت ہے۔

۶۔ اللہ کے رسولوں کے پاس اصل طاقت عشق کی رہی ہے۔ اللہ سے عشق، اس کی مخلوق کی بہتری کی جدوجہد سے عشق۔

عشق دم جبرئیل عشق دل مصطفٰے
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
عشق کی ہستی سے ہے پیکر گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام

اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہبوط آدم کے وقت بظاہر حضرت آدم علیہ السلام سے لیکن درحقیقت تمام بنی آدم کو خطاب کرتے ہوئے تنبیہاً ارشاد فرمایا تھا ''ہم نے کہا یہاں (جنت) سے چلے جاؤ سب (تمام بنی آدم۔ حضرت آدم سے آخری آدمی تک) (پھر جب تم زمین کو اپنا مسکن بنالو گے تو) میری طرف سے (وقتاً فوقتاً) تمہارے لئے ہدایت (رسولوں اور کتابوں کی شکل میں) بھیجی جاتی رہے گی، جس نے اس ہدایت پر عمل کرلیا تو اس کو (جنت کی جانب) واپسی میں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ حزن یا ملال، بے شک جن لوگوں نے ہماری نشانیوں کا انکار کیا اور انہیں جھٹلایا تو وہی لوگ جہنمی ہوں گے اور ہمیشہ اسی میں رہیں گے

اللہ نے اپنے ارشاد کے مطابق دنیا میں انسان کی ہدایت کیلئے سوا لاکھ کے قریب انبیاء بھیجے ان کے ساتھ چار بڑی کتب اور متعدد صحائف بھی نازل کئے، تمام انبیاء کی خدائے بزرگ و برتر نے خود تربیت فرمائی اور ان پر حضرت جبرئیل امین کے ذریعے کتب وصحائف نازل فرمائے۔ حضرات انبیائے کرامؑ اور نبی آخرالزمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے پیغام کو لوگوں تک پہنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور پیغام پہنچانے کا حق ادا کیا۔ اس راستے میں انبیاء کرام علیہم السلام کو اپنی اپنی امتوں کی جانب سے بے شمار رکاوٹوں کا سامنے کرنا پڑا۔ اور اپنے عرصۂ دعوت کے دوران اذیت کی انتہائی شدت کا سامنا کیا لیکن ان کے پائے استقلال میں ذرا لغزش نہیں آئی۔ اس لئے کہ ان میں اللہ نے اپنے عشق کی قوت پیدا کردی تھی اور جو عشق کی دولت سے مالا مال ہو۔ دنیا اور اس کی خوشیاں، اس کے غم، اس کی آسانیاں، اس کی اذیتیں اس کے سامنے کوئی وقعت نہیں رکھتیں۔ اللہ کا ارشاد، حضرت جبرئیلؑ کی قوت، نبی کی استقامت، اور پیغام حق سب عشق ہی ہیں۔ عبادات تو عشق الٰہی کے حصول

کا ذریعہ ہیں۔

۷۔عشق کی حرکت پذیری ہی کائنات میں زندگی کی ضامن ہے۔یہی عمل کی بنیاد ہے۔ اگرعشق ہے تو زندگی ''نورحیات'' کی غماز ہے بصورت دیگر ''نارحیات کی عکاس۔

عشق کے مضراب سے نغمۂ تار حیات
عشق سے نور حیات، عشق سے نار حیات

عشق کہتا ہے میری تب وتاب ہمیشہ کیلئے ہے یعنی میں امر ہوں لافانی ہوں۔عاشق دنیا سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے ''اے عالم رنگ وبو میرا اور تیرا ساتھ ہے ہی کتنا؟ موت ہمیشہ تجھ پر مسلط ہے اور عشق مجھے ہمیشگی بخشتا ہے''۔

۸۔عشق معجز نما ہے اس سے معجزے سرزد ہوتے ہیں،اس کی حدود لامتناہی ہیں زمان ومکاں اس کے راستے میں رکاوٹ ڈالنے سے اجتناب کرتے ہیں۔

عشق کے ہیں معجزات ، سلطنت فقر و دیں
عشق کے ادنیٰ غلام، صاحب تاج ونگیں
عشق مکان ومکیں، عشق زمان و زمیں
عشق سراپا یقیں ، اور یقیں فتح یاب

''رجال پرست اقبال کیلئے عشق ہی سب کچھ تھا بحر بے کراں بھی،سفینہ بھی،اور ساحل بھی:اسی لئے کہتے ہیں عشق کا سمندر ہی میری کشتی ہے اور عشق کا سمندر ہی میرا ساحل ہے۔ مجھے نہ کشتی کے نہ ہونے کا خوف ہے نہ،ڈوبنے یا ٹوٹنے کا خطرہ ہے۔اور نہ کنارے پر نہ پہنچنے کا خوف ہے۔

یم عشق کشتیٔ من ، یم عشق ساحل من
نہ غمِ سفینہ داری، نہ سر کرانہ دارم''

عشق کا میدان عمل،عشق کی کل کائنات، دل ہے اور علامہ اقبال کی شاعری کی کل کائنات کا مرکز ومحور بھی دل ہے اور ان کی آرزو،دل کا آرزومند ہونا ہے۔اس نتیجے سے قطع

نظر کہ آرزو برآتی ہے یانہیں، دل کے اندھیرے میں آرزو کا روشن رہنا ہی دل کی زندگی کا ضامن ہے۔ وہ خود اپنے آپ کو دنیا کے باغ میں خوشبو سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اس باغ (دنیا) میں خوشبو کی طرح پریشاں ہوں۔ خوشبو جو پھیلتی جاتی ہے وہ دنیا کو معطر کرتی ہے یہ خوشبو کی صفت ہے مگر خوشبو آخر اس طرح پریشاں ہو کر چاہتی کیا ہے؟ پھول سے نکل کر ادھر ادھر بکھر نے کا مقصد کیا ہے؟ اس کی منزل کیا ہے؟ یعنی خود علامہ کیا چاہتے ہیں؟ وہ کہتے ہیں میں نہیں جانتا کہ میں کیا چاہتا ہوں؟ کیا تلاش کرتا ہوں؟ میری آرزو پوری ہوگی یا نہیں؟ مجھے اس کی خبر نہیں۔ میں تو صرف آرزو کے سوز و ساز کا مارا ہوا ہوں (میرا کام، میری آرزو کی تلاش ہے، میرا درد، درد کی تلاش میں ہے۔ میرا ذکر، ذکر کی تلاش میں ہے۔ مجھے اپنے پیغمبرؐ کی سنت پر عمل کرنا ہے کہ میرا کام صرف ذکر یا بیان یا دعوت ہے دلوں کو طاعت کیلئے آمادہ کرنا خالق کل کے ذمے ہے مجھے اپنے اس عمل کیلئے داروغہ کا کردار نہیں ادا کرنا) مجھے صرف یہ حکم ہے کہ (فذکّر. انّما انت مذکّر 0 لست علیهم بمصیطر.) پس دعوت دیتا رہ کہ تیرا کام دعوت دینا ہی ہے تجھے ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا۔ (۷)

دریں گلشن پریشاں مثلِ بُویم
نمی دانم چہ می خواہم ، چہ جویم
بر آید آرزویا بر نیاید
شہید سوز و ساز آرزویم

(۸)

ترجمہ: میں باغوں میں خوشبو کی طرح ہوا کے دوش پر ادھر ادھر کسی کی جستجو میں ہو پھر رہا ہوں، میں یہ جانتا کہ میں کیا تلاش کرتا پھرتا ہوں، مجھے کس چیز کی جستجو ہے، میری جو بھی آرزو ہے پوری ہو یا نہ ہو، میں ہر طرح کامیاب ہوں کہ اگر میری آرزو کامیاب ہوگئی تو میں آرزو کی کامیابی کی خوشی میں خوش ہوں اور اگر میری آرزو پوری نہ ہوئی اور میں اسی آرزو کی کھوج

میں مرجاؤں، اس کی آگ میں جاؤں تو میں شہید آرزو ہو جاؤں گا، دونوں اعتبار سے یہ میری کامیابی ہے۔

جہان مشت ِگل، دل حاصل اوست
ہمیں یک قطرۂ خوں مشکل اوست
نگاہ ما دوبیں افتادہ ورنہ
جہان ہر کسے اندر دل اوست

(۹)

ترجمہ: یہ جہان (جسم) ایک مٹھی بھر خاک ہے اور دل اس کا حاصل ہے بس ایک بوند لہو یعنی دل اس کی مشکل ہے اس کا سنبھالنا اس کیلئے مشکل ہے ہماری دنیاوی نظر ادھر ادھر بھٹکتی ہے، وہ اصلی ہدف تک پہنچ نہیں پا رہی اسے ایک کے دو دو نظر آ رہے ہیں وہ دل کے اندر جھانک کر اس کے اندر پنپنے والی آرزو کو نہیں دیکھ پا رہی ہے حالانکہ ہر کسی کی کل کائنات اس کے دل اندر ہی ہوتی ہے ۱۰

بباغان باد فروردیں دہد عشق
براغاں غنچہ چوں پرویں دہد عشق
شعاع ِ مہر ِ او قلزم شگاف است
بماہی دیدۂ رہ بیں دہد عشق

ترجمہ: عشق باغوں کو بہار دیتا ہے، عشق جنگلوں کو ستاروں کی مانند پیچ در پیچ کلیاں اور سفید غنچے عطا کرتا ہے۔ عشق کے سورج کی ایک کرن سمندر کی گہرائی کو چیر سکتی ہے عشق سمندر میں موجود مچھلی کو سمندر کی گہری تہوں میں راستہ دیکھنے والی آنکھ بخشتا ہے۔ گویا کائنات میں ہر جگہ عشق ہی کی جلوہ گری ہے۔ (۱۱)

عقاباں را بہائے کم نہد عشق
تدوراں را بہ بازاں سر دہد عشق

نگہ دارد دل ما خویشتن را
ولیکن از کمینش بر جہد عشق

ترجمہ: عشق عقابوں کا مول گھٹا دیتا ہے۔ اگر ان کے شکار پرندوں یا جانوروں میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے تو وہ عقابوں کو بھی خاطر میں لاتے۔ عشق کا اپنا معیار ہے وہ بعض اوقات چکوروں کو بازوں پر فوقیت دے دیتا ہے عشق کسی کی حیثیت کو خاطر میں لاتا۔ ہمارا دل اپنی بہت حفاظت کرتا ہے لیکن عشق اسی کی گھات سے نکل کر جست لگاتا ہے عشق ایک فطری جذبہ ہے جو ہر انسان میں کارفرما ہے۔

ہمیں دنیا میں جو رنگ دکھائی دیتا ہے جس چیز میں دکھائی دیتا ہے وہ عشق کی بدولت ہے۔ گل لالہ کی پنکھڑیوں میں عشق کی رنگ آمیزی ہے ہماری جانوں میں جو طوفان اٹھتے ہیں جو تحریک ہوتی ہے یہ جو ہمارا جی کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ ھل من مزید کا نعرہ لگاتا ہے۔ اس نے کسی اور جہان کے مزے اٹھائے ہوئے ہیں اور اسے اس جہان کا کوئی مزہ ،مزہ لگتا ہی نہیں یہ سب عشق کی بلا انگیزی ہے اگر تو زمین کا سینہ چیرے تو اس کے اندر سبزہ اگانے، موسم بدلنے پر ہیئت بدلنے کی صلاحیت طوفان اٹھانے کی اہلیت یہ سب عشق ہی کی کارستانی ہے۔ گویا ہر کہیں عشق ہی کی حکومت ہے۔ (۱۲)

بہ برگ لالہ رنگ آمیزی عشق
بجان ما بلا انگیزی عشق
اگر ایں خاکداں را بر شگافی
درونش بنگری خونریزی عشق

(ترجمہ: گل لالہ کی پتیوں پر رنگوں کی بوقلمونی عشق ہی کی بدولت ہے، ادھر میری روح میں تڑپتے انقلاب کا اصل ماخذ بھی عشق ہے اگر اس زمیں کے خاکدان کو (میرے جسم کو) میں برائے تحقیق گہرائی تک شگاف ڈالا جائے تو اس کے اندر عشق ہی کا لاوہ ابلتا نظر آئے گا۔ دنیا کے سارے حسن کی بنیاد بھی عشق ہے اور اس کے سارے انقلابات سطح زمین پر

ہونے والی ساری تبدیلیاں بھی عشق کی بلا انگیزیوں کی رہین منت ہیں)

نہ ہر کس از محبت مایہ داراست
نہ با ہر کس محبت سازگار است
بروید لالہ با داغ جگر تاب
دل لعل بدخشاں بے شرار است
(۱۳)

لیکن یہ محبت، یہ عشق ہر کسی کی سمجھ میں آتا ہے نہ یہ ہر کسی کو ودیعت ہوتا ہے، نہ ہر دل اس دولت کو اپنے پاس رکھنے کا ظرف رکھتا ہے، محبت ہر کسی کو سازگار بھی نہیں ہوتی۔ ہر کسی کو موافق بھی نہیں آتی۔ گل لالہ (جیسا نازک پھول) جگر چمکانے والا داغ ساتھ لئے کھلتا ہے۔ مگر لعل بدخشاں (جیسے سخت اور چمکدار قیمتی پتھر) میں کوئی چنگاری نہیں، کوئی حرارت نہیں۔

ظاہر بین حضرات (نام نہاد دانشور، علماء سوء) علامہ پر عقل کی مخالفت یا مذمت کا الزام لگاتے ہیں۔ ایسا کر کے وہ محض اتہام کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یہ بات سو فیصد صحیح ہے کہ وہ عشق کے پرزور مبلغ ہیں۔ لیکن عقل کے مخالف ہرگز نہیں، تاہم وہ عقل و عشق کی ان دو متوازی (لیکن باہم متضاد بالکل نہیں) قوتوں میں سے عشق کو محبوب حقیقی تک رسائی کا نزدیک ترین راستہ سمجھتے ہیں۔ اور عشق کو ''عمل'' کی اساس گردانتے ہیں جو عقل کی طرح اسباب و علل میں الجھتی نہیں نہ وہ سود و زیاں کی فکر میں مبتلا ہوتی ہے اور بے خطر عمل پر آمادہ جانے کو ترجیح دیتی ہے۔ پیام مشرق میں اقبال عشق کے دور حاضر میں کردار پر تاسف کرتے ہیں:

ز افسونِ تو دریا شعلہ زار است
ہوا آتش گذار، و زہر دار است
چو با من یار بودی نور بودی
بریدی از من و نورِ تو نار است

ترجمہ۔ تیرے شعبدے سے دریا شعلہ زار ہے (دریا کے پانی سے شعلے اٹھتے ہیں) ہوا

آگ چھوڑتی ہے اور زہریلی ہے (انسان کش، فضا کو زہر آلود کرنے والے ہتھیاروں کی کثرت کی وجہ سے) تو جب میرا (انسان کا) دوست تھا تو نور تھا مجھ سے الگ ہو کر (انسان دوستی کی انسان دشمنی کی رہ پر لگ کر) تو نور سے نار بن گیا۔ (تمام آلات حرب جو انسان کش ہیں وہ علم ہی کی بدولت عالم وجود میں آئے، اس لئے علم نے انسانیت کی خدمت کی بجائے انسانیت سوزی کا راستہ اپنا لیا۔ انسان کی جدوجہد جو انسان کے کام آنی چاہیے تھی وہ انسان کے خلاف استعمال ہو رہی ہے۔ علم اگر عشق کے تابع ہوتا تو ایسا ہرگز نہ ہوتا یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ عشق علم کے تابع ہو گیا ہے عشق قوت عمل ہے اور علم اس قوت عمل کو اپنے تابع رکھ کر انسانیت کے خلاف کام کروا رہا ہے۔ جو عشق کی توہین ہے۔ علامہ علم کے اسی کردار کے مخالف ہیں۔

علامہ ملت اسلامیہ کے ہر مرد و زن کو جب عشق کا درس دیتے ہیں تو ان کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس اور ان کے تربیت یافتہ جماعت کے عشق رسول کے مینار کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں سے وہ تشبیہات اور تلمیحات جمع کرتے ہیں اور انہی کی مثالیں پیش کر کے عشق کی ترغیب دیتے ہیں علامہ نے ''پیام مشرق'' کے اولیں اوراق میں اعلیحضرت امان اللہ خان والیٔ افغانستان کے حوالے سے 'پیش کش' سے جن خیالات کو نظم کی ہے وہ ایک مکمل ترغیب ہے:

آں مسلماناں کہ میری کردہ اند
در شہنشاہی فقیری کردہ اند
در امارت فقر را افزودہ اند
مثل سلماںؓ در مدائن بودہ اند

ترجمہ :

ان مسلمانون نے اس طرح حکمرانی کی کہ انہوں نے پادشاہت میں بھی انداز فقیرانہ اپنائے، انہوں نے امارت (حکمرانی) میں فقر کو پروان چڑھایا، (وہ دنیا میں بطور حکمران اس طرح رہے) جس طرح حضرت سلمان فارسیؓ مدائن میں رہے۔

حکمرانے بود، سامانے نداشت
دست او جز تیغ وقرآنے نداشت
ہر کہ عشق مصطفیٰؐ سامان اوست
بحر و بر درگوشۂ دامان اوست

ترجمہ: اگرچہ وہ حاکم تھے مگران کے پاس سامان (دنیا) کچھ نہ تھا۔ان کے ہاتھ میں یا ان کے پاس تلوار اور قرآن کے سوا کچھ نہ تھا۔جس کی پونجی (سامن) عشق رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہے خشکی اور تری ان کے دامن (پلو) میں بندھی ہوئی ہے۔

سوز صدیقؓ و علیؓ از حق طلب
ذرّۂ عشق نبیؐ از حق طلب
زانکہ ملت راحیات از عشق اوست
برگ و ساز کائنات از عشق اوست

ترجمہ: اللہ تعالیٰ سے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کا سوز مانگو۔اپنے رب سے نبیٔ پاک ﷺ کے عشق کا ایک ذرّہ مانگو (کہ اسی عشق سے سوز تمہیں ودیعت ہوگا) کیونکہ ملت اسلامیہ کی بقا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عشق میں مضمر ہے سو کائنات کا سارا ساز وسامان آپ ﷺ کی محبت ہی تو ہے یہی عشق، کائنات کا ساز وسامان ہے اور حیات بعد الممات کا سامان بھی۔(۱۴)

علامہ نے پیام مشرق میں عشق کی تعریف کرتے ہوئے ایک منفرد بات کہی ہے کہ عقل جس کا ایک جلوۂ بے باک دنیا کو جلا دیتا ہے۔اس نے (جلانے کی بجائے) جہان کو روشن کرنے کا طریقہ عشق ہی سے سیکھا ہے۔یہ عشق ہی ہے جو تیری (ہر انسان کی) روح میں ہر کیفیت پیدا کرتا ہے۔رومی کے جوش اور تڑپ سے لے کر فارابی کی حیرت تک۔(رومی مسلک عشق کے علمبردار ہیں اور عشق کا ثمرہ پیچ وتاب ہے۔فارابی مذہب عقل کے نمائندہ ہیں اور عقل کا نتیجہ حیرت واستعجاب وجستجو ہے)، میں (اقبال) اس نشاط آور حرف کا ورد کرتا ہوں۔

اور ناچتا ہوں، اس تمام بیتابی کے باوجود دل عشق ہی سے چین حاصل کرتا ہے، سکون پاتا ہے محض حرف میں ہر پیچیدہ معنی نہیں سماتا، ایک پل کیلئے اپنے دل کے اندر نظر ڈال شاید کہ تو اسے پا جائے۔

عقلے کہ جہاں سوزد یک جلوۂ بے باکش
از عشق بیاموزد ، آئین جہاں تابی
عشق است کہ در جانت، ہر کیفیت انگیزد
از تاب و تب رومی تا حیرت فارابی
ایں حرف نشاط آور، می گویم و می رقصم
از عشق دل آساید ، با ایں ہمہ بے تابی
ہر معنیٔ پیچیدہ، در حرف نمی گنجد
یک لحظہ بہ دل در شو ، شاید کہ تو دریابی

(۱۵)

مثنوی ''اسرار و رموز'' میں علامہ نے ایک عنوان قائم کیا ہے ''در معنیٔ ایں کہ پختگیٔ سیرت ملّیہ از اتباع آئین الٰہیہ است'' اس میں ارشاد فرماتے ہیں: شریعت میں کوئی دوسرے معنی تلاش نہ کر۔ موتی کے اندر چمک دمک اور روشنی کے سوا کچھ اور مت ڈھونڈ۔ اس موتی یعنی شریعت کو خود خدا نے بنایا ہے۔ اس کا ظاہر بھی گوہر بے بہا ہے اور اس کا باطن بھی بیش قیمت موتی۔ یہ جو شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت کی اصطلاحیں وضع کی گئی ہیں (عشق کے بغیر) ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ واضح رہے کہ علم حق شریعت کے سوا کچھ نہیں۔ شریعت وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں تک پہنچائی۔ اور تجھے معلوم ہے کہ سنت کی اصلیت کیا ہے؟ محض اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم و عمل سے محبت۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی شریعت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کیلئے جذب و کشش اپنے اندر نہیں رکھتا اس کی زبان سے محبت کا دعویٰ جھوٹا سمجھا جائے گا۔ رسول صلی اللہ

علیہ وسلم کی پیروی کا درجہ اتنا بلند ہے کہ خدا نے قرآن میں فرمایا:

'' قُل اِن کُنتُمُ تُحِبُّون اللّٰہ فَا تَّبِعُوْنَیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُ نُوْبَکُمْ ط وَاللّٰہُ غَفُورٌ رَّ حِیْمٌ0 (۱۶)

ترجمہ ''اے نبیؐ مومنین سے کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میری (نبیؐ کی) اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں (خطاؤں لغزشوں) کو معاف کرے گا اور اللہ بخشنے والا انتہائی رحم کرنے والا ہے''۔

یعنی رسول ﷺ کی محبت (دلی لگاؤ سے پیروی) خدا کی محبت کا وسیلہ ہے'' فرد کیلئے شریعت ایسا زینہ ہے جو اسے یقین کی بلندی پر پہنچا دے شریعت ہی کی پیروی سے یقین کے مقامات پختہ اور مستحکم ہوتے ہیں:

در شریعت معنیٔ دیگر مجو
غیر ضو در باطن گوہر مجو
ایں گہر را خود خدا گوہرگراست
ظاہرش، گوہر، بطونش گوہر است
علم حق غیر از شریعت ہیچ نیست
اصل سنت جز محبت ہیچ نیست
فرد را شرع است مرقات یقیں
پختہ تر از وے مقامات یقیں

(۱۷)

ترجمہ: شریعت میں ایک حکم پر فوراً من وعن عمل کرنے کی بجائے اس حکم کی من پسند تاویل کرنے کیلئے دوسرے معانی تلاش نہ کر۔ علم حق کی روشنی کے بغیر شریعت کے گہرے سمندر میں غوطہ لگا کر کوئی موتی تلاش کرنے کی کوشش نہ کر، کہ اس موتی (دین، شریعت) کے موتی کا خالق خود خدا ہے۔ اس حکم کا ظاہر بھی خالص سُچا موتی ہے اور باطن بھی موتی ہے۔ حق

کا علم شریعت پر عمل کرنے کے راستے ہی سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔(اور شریعت آقائے نامدار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا نام ہے)اور یہ پیروی نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کے بغیر ممکن نہیں۔(اس محبت کے بغیر اعمال اعضائے جسمانی کی جنبش کے علاوہ کچھ نہیں)۔ایک مسلمان کی لئے شرع کی ابتدا غیر متزلزل یقین (ایمان باللہ اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب) سے ہوتا ہے۔سو اپنے ایمان کو شریعت کے احکام پر عمل کرتے ہوئے پختہ سے پختہ تر کئے جاؤ۔

علامہ اقبال کی نظم ''پیام عشق'' کے حوالے سے پروفیسر ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی رقمطراز ہیں ''عشق کا لفظ ایک مخصوص فلسفیانہ اصطلاح کے طور پر پہلے پہل ''پیام عشق'' میں استعمال ہوا ہے جس سے مراد کسی بلند نصب العین سے والہانہ لگاؤ ہے۔نصب العین اتنا بلند ہونا چاہیئے کہ وہ انسان کی پوری شخصیت کو اپنی گرفت میں لے لے۔اقبال نے اسرار خودی کے ایک باب میں اسی نصب العین کی آرزو کو حیات خودی کا ضامن قرار دیا ہے جو انسان کے پورے وجود پر چھا جائے۔اور اس کی شان ذیل کے اشعار میں بیان کی ہے: (۱۸)

اے ز راز زندگی بیگانہ، خیز
از شراب مقصدے مستانہ ، خیز
مقصدے مثلِ سحر تابندۂ
ما سوا را آتش سوزندۂ
مقصدے از آسماں بالا ترے
دل ربائے ،دل ستائے،دل بَرے
باطل دیرینہ را غارت گرے
فتنہ در جیبی سراپا محشرے''
ما ز تخلیق مقاصد زندہ ایم
از شعاع آرزو تابندی ایم

ترجمہ:۔

۔ اے زندگی کے راز سے ناواقف شخص اٹھ، بیدار ہوجا، اور مقصد حیات جان کر اسی مقصد کی شراب پی کر مستی کے عالم میں اٹھ کھڑا ہو۔ (اس مستی کو اوڑھ لے۔ اسے حرز جاں بنا لے)

۔، وہ مقصد ایسا ہو جو صبح کی طرح روشن ہو۔ (کہ صبح کے وقت فضا میں آلودگی نہیں ہوتی، اسی طرح تو اپنے مقصد کو دنیاوی آلودگیوں سے پاک رکھ)۔ ایسا مقصد جو غیر اللہ کو جلا کر خاکستر کردے۔

۔ایسا مقصد جو آسمان سے بھی بلند ہو، جو دل لبھانے والا، بہت ہی دل پذیر، اور بہت ہی دلکش ہو۔

۔ایسا مقصد جو قدیم باطل، رسموں روایتوں کے بتوں کو پاش پاش کردے اس کے گریبان میں قیامت کے ہنگامے موجود ہوں۔

۔ہم نت نئے مقاصد نت نئی منزلوں، نئے طور، نئی تجلیوں کی تخلیق ہی کے سبب زندہ رہتے ہیں۔ ان مقاصد کے حصول کی جدوجہد ہی ہمیں زندہ رکھتی ہے۔

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح وشام بدلتی ہیں ، ان کی تقدیریں

''لالہ طور'' میں علامہ نے عشق کی مزید پرتیں کھولی ہیں۔ لالہ طور کی ابتدا حمدیہ اشعار ہی سے ہوتی ہے، کہتے ہیں ساری کائنات اللہ تعالیٰ کی کبریائی پر نثار ہے، بندگی تمام موجودات کی سرشت میں ہے، کیا تو نہیں دیکھتا کہ آسمان کو چمکانے والا سورج صبح کے ماتھے پر محراب (نشان سجدہ) کی طرح ہے۔ مراد ہے کہ صبح کی روشنی سورج کی رہین منت ہے۔ اگر سورج نہ ہوتا تو صبح کی روشنی نہ ہوتی، اور اگر خدا جو سورج کا اور ہر مخلوق کا خالق ہے اگر اس سورج کو تخلیق نہ کرتا تو اس کا وجود ہی نہ ہوتا۔ یعنی ساری کائنات اپنے وجود اور بقا کیلئے خدا کی محتاج ہے۔ اور اس میں وحدۃ الوجود پنہاں ہے۔ علامہ نے آفتاب کو استعارۂ سحر کی پیشانی پر

سجدہ ہائے نیاز کا داغ قرار دیا۔ علامہ کہتے ہیں میرا دل باطن (سوز دروں) کی آنچ سے روشن ہے میری آنکھ خون کے آنسوؤں کے باعث دنیا آسانی سے، زیادہ واضح انداز سے دیکھتی ہے۔ میری آنکھ اسرار و رموزِ جہاں کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے، جو شخص عشق کو پاگل پن (جنسی ہیجان وغیرہ) سمجھتا ہے خدا کرے زندگی کے راز سے بے خبر ہی رہے کیونکہ اسے معلوم ہی نہیں کہ زندگی کا بنیادی تصور، زندگی کی رمز اور اس کی حقیقت عشق ہی ہے۔ عشق باغوں کو بہار کی ہوا دیتا ہے، عشق جنگلوں کو ستاروں کی مانند جوڑ جوڑ کے گلدستے سجا کر کلیاں اور غنچے عطا کرتا ہے۔ عشق کے سورج کی کرن سمندر کی گہرائی کو چیرتی گذرتی ہے، عشق سمندر میں مچھلی کو پانی کی گہرائی میں راستہ دیکھنے کی صلاحیت بخشنے والا ہے۔ کائنات میں ہر جگہ عشق ہی کی حکمرانی ہے اسی کی جلوہ گری ہے۔ عشق عقابوں کا مول گھٹا دینے والا ہے یعنی اس کے نزدیک عقاب کی اعلیٰ ترین صلاحیتیں کم تر ہیں، عشق چکوروں کو بازوں پر حاوی کر سکتا ہے، یہ کسی بڑے چھوٹے، طاقتور، کمزور کو نہیں دیکھتا۔ بس اس کے اندر خود کی صلاحیتوں کا گراف دیکھتا ہے۔ ہمارا دل اپنی حفاظت آپ کرتا ہے۔ لیکن عشق اسی کی گھات سے نکل کر جست لگاتا ہے عشق ایک فطری جذبہ ہے جو ہر ذی حیات میں کارفرما ہوتا ہے۔ گل لالہ کی پنکھڑیوں میں عشق کی رنگ آمیزی ہے، ہماری جانوں میں عشق کی بلا انگیزی (شور) ہے، اگر تو زمین کو چیرے تو اس کے اندر عشق کی خوں ریزی نظر آئے گی۔ مراد کہ کائنات میں ہر جگہ عشق ہی حکومت ہے۔

شہید ناز او بزم وجود است
نیاز اندر نہاد ہست و بود است
نمی بینی کہ از مہر فلک تاب
بسیمائے سحر داغ سجود است
دل من روشن از سوز درون است
جہاں بیں، چشم من از اشک خون است

ز رمز زندگی بیگانہ تر باد
کسے کو عشق را گوید جنون است
(۱۹)۔

ترجمہ: ساری کائنات اس (اللہ تعالیٰ) کی کبریائی کے نثار کہ اس کی کل کائنات میں اس کی ساری تخلیقات، سب موجودات کی سرشت، بنیاد میں اطاعت و بندگی، موجود ہے
۔کیا تو نہیں دیکھتا کہ آسمان (کائنات۔نظام شمسی) کو چمکانے والا سورج (فی نفسہٖ) صبح کے ماتھے پر داغ سجدہ (محراب) کی مانند ہے۔(یہ اللہ کے حکم سے خود کو ودیعت کردہ فرض کس کو بی سے نبھا رہا ہے اور یہ کائنات کے ماتھے کا جھومر بنا ہوا ہے۔)
۔میرا دل میرے اندر کے سوز (تڑپ۔باطن کی حرارت۔روحانی روشنی) سے روشن ہے میری آنکھ خون کے آنسو روتی ہے اور ان آنسوؤں کی وجہ سے میری آنکھوں کی بینائی کی قوت میں اتنا اضافہ ہو گیا ہے کہ یہ عالم کا نظارہ کرتی ہیں۔پوری کائنات کو دیکھتی ہیں (زمان ومکان شفاف ہو گئے ہیں)
۔یہ آنکھیں اسرار و رموز کائنات سے باخبر ہوتی جا رہی ہیں۔اللہ کرے وہ شخص زندگی کے رازوں سے زیادہ بے خبر رہے جو عشق کو (عقل کے مقابلے میں) پاگل پن قرار دیتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔کلیات اقبالیات ارمغان حجاز
۲۔فکر اقبال ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم باب 'عشق کا تصور' صفحہ ۲۵۹۔
۳۔ ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی ''اقبال اور محبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم''
۴۔کلیات اقبال اردو (ذوق وشوق)
۵۔کلیات اقبال فارسی جاوید نامہ (تمہید زمینی۔جواب رومیؒ)
۶۔ایضاً
۷۔القرآن۔سورۃ الغاشیہ پارہ ۳۰ ۔
۸۔علامہ اقبال پیام مشرق ۔لالۂ طور ۷ ؒ
۹۔ایضاً
۱۰۔ایضاً
۱۱۔ایضاً ۴
۱۲۔ایضاً ۵
۱۳۔ایضاً ۶
۱۴۔علامہ اقبال :پیام مشرق : پیش کش
۱۵ ۔ایضاً
۱۶۔ القرآن آل عمران ۳ آیۃ ۳۱
۱۷کلیات اقبال فارسی رموز بیخودی۔۔۔از اتباع آئین الٰہیہ
۱۸۔کلیات اقبال فارسی (اسرار خودی)
۱۹۔علامہ اقبال کلیات اقبال فارسی پیام مشرق (لالۂ طور= ق ۱۔۲)

علامہ اقبال کا تصور عشق۔۔۔

۲۔عشق نغمۂ تار حیات:

یہاں پھر عشق کی بات ہو رہی ہے۔علامہ اپنی سخنوری میں ذرا پہلو بدلتے ہیں تو عشق کا اک نیا باب کھل جاتا ہے۔وہی عشق جسے علامہ ''نغمۂ تار حیات'' قرار دیتے ہیں۔وہی عشق جس سے نور حیات ہے وہی عشق جس کی کمیابی سے عمل کی زندگی جہنم بن جاتی ہے۔وہی عشق جو ایک مومن کی شان ہے اور اس کی پہچان ہے۔جس کے نہ ہونے کی بدولت مسلمان دنیا میں خوار ہو رہا ہے۔علامہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اعتراف کرتے ہیں کہ جب انہوں نے اپنے آپ کو اپنے دامن میں کھینچ لیا۔اپنے دل میں خودی کا گوہر تلاش کیا۔اپنی دنیاوی ضرورتوں کو محدود کیا اور دین کے دامن میں پناہ لی۔جب میں نے آپ صلی اللہ علیہ و سلم کا دامن پکڑ لیا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سایۂ رحمت میں آ گیا تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نور سے اپنے مقام کو دیکھ لیا۔اقبال کہتے ہیں جب میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کی عطا سے اپنے مقام کو پہچانا تو میں نے اس خودی کی تربیت سے اس زمانے میں صبح کی نوا سے عشق و مستی کا جہان پیدا کیا۔

چو خود را در کنار خود کشیدم
بہ نور تو مقام خویش دیدم
دریں دیر از نوائے صبح گاہی
جہان عشق و مستی آفریدم

علامہ مسلمان کو خودی درس دیتے ہیں تو ارشاد فرماتے ہیں کہ خودی ہر مسلمان کے دل کا جوہر ہے۔اس کے مراحل طے کرنے کے بعد بھی اس کے استحکام و ترقی و مضبوطی کی جانب توجہ کی ضرورت ہے اور اس کا استحکام عشق میں مضمر ہے اور مستحکم خودی ہی نیابت الٰہی کی دلیل ہے:جب عشق و محبت کی بدولت خودی پختہ ہو جاتی ہے تو اس کی قوت و طاقت کائنات

پر حکمرانی کرنے لگتی ہے ۔ پیر گردوں نے ستاروں سے جو تصویریں بنائیں اصل میں یہ ستاروں سے بنی ہوئی تصویریں نہیں بلکہ خودی کی شاخ سے پھوٹی ہوئی کلیاں ہیں۔ (رات کو آسمان کی جانب نگاہ کریں تو ستاروں کے مختلف جھرمٹ الگ الگ تصویروں کی صورت میں نظر آتے ہیں، جیسے بنات النعش یا ثریا، سات ستاروں، سات سہیلیوں کا جھرمٹ، دب اکبر، صبح کے ستارے کا کارواں، کہکشاں وغیرہ) جب خودی مستحکم ہو جاتی ہے تو مومن کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے اور اس کی انگلی چاند کو شق کر سکتی ہے۔ (اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اشارۂ انگشت مبارک سے چاند دو ٹکڑے ہونے کے معجزے کی جانب اشارہ کیا گیا ہے) ۔ اقوام عالم میں تو برتر درجہ کی وجہ سے منصف کی کرسی پر براجمان ہے اور دارا و جمشید تیرے حکم کے تابع ہیں۔ دور حاضر کی طرح نہیں کہ مسلمانوں کے اندر خودی کے معدوم ہونے کے سبب سب اقوام مسلمانوں کے خلاف ایکا کر لیتی ہیں اور ان کے خلاف فیصلہ سازی کرتی ہیں اس لئے مسلمان اس وقت ایک کمزور پوزیشن میں ہیں۔

از محبت چوں خودی محکم شود
قوتش فرماندہ ٔ عالم شود
پیر گردوں کز کواکب نقش بست
غنچہ ہا از شاخسار او شکست
پنجۂ او پنجۂ حق می شود
ماہ از انگشت او شق می شود
در خصومات جہاں گردد حَکَم
تابع فرمان او دارا و جم

۱۔۱۔ (کلیات اقبال فارسی۔ اسرار خودی :۔۔ خودی از عشق محکم می گردد)

مسلمانوں کے ساتھ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا تھا اور آج تک ہو رہا ہے اس کی کئی بنیادی وجوہات ہیں ان میں بنیادی وجہ یہ ہے کہ مسلم ممالک کے عوام آئین اسلامی سے دور جا پڑے

ہیں۔ان کی اسلام سے دوری اور دین بیزاری سے جو امراض ان میں پیدا ہو رہے ہیں وہ ان کا علاج اسباب امراض ہی میں ڈھونڈ رہے ہیں۔

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے ' لڑکے' سے دوا لیتے ہیں

عام مسلمان کی دین سے بیزاری پر اقبال بہت کڑھتے تھے اور مسلمان کی بطور مسلمان تربیت کے خواہاں تھے۔ یہی تڑپ ان کو بے قرار رکھتی تھی۔قرون اولیٰ کے مسلمانوں کا سا جذبہ وہ ہر مسلمان میں دیکھنا چاہتے تھے۔ایک ایسا مسلمان جس کی زندگی لا الٰہ الا اللہ کے سائے میں گذرے۔جس کی زندگی کا مقصد عشق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کچھ نہ ہو۔لیکن وائے افسوس کہ ان مسلمانوں میں وہ صلاحیتیں موجود ہونے کے باوجود ایمان کی وہ کیفیت پیدا ہوتی نظر نہیں آتی۔اس پر ان کا دل روتا ہے اور آنکھیں پرنم ہیں۔وہ کہتے ہیں:

دریں عالم بہشتِ خرمے ہست
بشاخِ او ز اشک من نمے ہست
نصیب او ہنوز آں ہاؤ ہو نیست
کہ او در انتظار آدمے ہست

ترجمہ: اس دنیا میں اسلام، توحید و رسالت کی ایک تروتازہ جنت ہے اور میرے آنکھوں کی نمی اس جنت کے درختوں کی شاخون کو ہرا رکھے ہوئے ہے(لیکن ہندوستان کا عام مسلمان اس کیفیت سے دوچار نہیں وہ خواہش، آرزو کے بغیر زندگی گذارنے کی عادت میں مبتلا ہے اس میں وہ عمل کی یا خودی کی صفت پیدا نہیں ہو رہی جو اسے گہرے خواب سے بیدار کر سکے)اسے کسی آدم (ایسے مرد کامل یا رہنما) کا انتظار ہے(جو خود'' خلیفۃَ اللّٰہ علی الارض'' کے اوصاف کا حامل ہو اور اسے مومنانہ بصیرت، فیضان نظر سے راہ راست پر لا سکے)

-☆-☆-☆

علامہ اقبال کا تصور عشق۔۔۔

۲۔ عقل و عشق:

عشق صید از زور بازو افگند
عقل مکار است و دامے می زند
عقل را سرمایہ از بیم و شک است
عشق را عزم و یقیں لا ینفک است
عقل چوں باد است ارزاں در جہاں
عشق کم یاب و بہائے او گراں

(۱)

ترجمہ: ا۔عشق اپنے زور بازو سے شکار پکڑتا ہے لیکن عقل فطرتاً مکار اور وہ مکر و فریب کے جال پھیلاتی رہتی ہے۔

۲۔عقل کا سارا سرمایہ (زور، نظریہ) خوف اور شک وشبہ ہے وہ اپنے مقلدین کی تعلیم کی ابتدا شک سے کرتی ہے۔اس کے برعکس عشق سے عزم و یقین جدا ہو ہی نہیں سکتے۔عشق کے راستے کے سالکین کا پہلا قدم ہی ''پکا ارداہ یقین'' سے اٹھتا ہے۔

۳۔عقل جو تعمیر کرتی ہے اس کا نتیجہ ہمیشہ ویرانی کی صورت میں نکلتا ہے، عقل کی تعمیر میں تخریب کا پہلو ہوتا ہے لیکن عشق کی ہر تخریب میں تعمیر کا عنصر غالب ہوتا ہے عشق اس غرض سے ویران کرتا ہے کہ اسے مستقلاً آباد کر سکے (لا الہ الا اللہ۔ ہر الہ، ہر سبب، ہر غیر کی نفی دراصل اللہ کے اثبات کیلئے ہے)۔

۴۔عقل اس دنیا میں ہوا سے بھی سستی ہے۔اور عشق کمیاب ہے،اور اس کی قیمت بہت زیادہ ہے۔عشق کی قیمت کا ادائیگی جان کی بازی لگا کر ادا کی جاتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا عقل یا خرد عشق کی کوئی متحارب یا متضاد قوت ہے؟ یا عشق کی معاون قوت ہے جو متوازی لکیر پر سفر کر رہی ہے۔عشق کو عقل پر کیوں فوقیت حاصل ہے؟عشق میں ایسی کیا قوت ہے جو ہر میدان میں (علامہ اقبال کے خیال مطابق) عقل کو پچھاڑ رہی ہے۔

علامہ اقبالؒ کی تمام کلیات (فارسی اور اردو) کا مطالعہ کرنے سے ایک مختلف الاضلاع مثلث کی شکل کا احساس ہوتا ہے جس کا اساسی ضلع علم کا ہے جس کے دو نقاط ''الف''، و''ب'' واضح ہیں، نقطہ الف سے ایک ضلع کی اٹھان ہوتی ہے اسے آپ عقل کا ضلع کہہ سکتے ہیں تیسرا ضلع نقطہ 'ب' سے افقی طور پر ایک واضح روشنی کی لکیر چھوڑتا بڑھتا چلا جاتا ہے۔یہ عشق ہے دوسرا ضلع جو نقطہ الف سے اٹھتا ہے تیسرے ضلع سے ملنے کی آرزو میں ایک خاص فاصلہ طے کرنے کے بعد آگے نہیں جا سکتا اور اس تیسرے ضلع کو تکتا رہ جاتا ہے اس کا آخری نقطہ اس کا مقام سدرہ ہے جو اس کے محدود اور بے بس ہونے کی علامت ہے۔تیسرا ضلع عشق کا ضلع ہے جس کی منزل لامتناہیت ہے۔جس کی پہنچ 'پرے ہے چرخ نیلی فام سے'۔اور 'ستارے اس کی گرد راہ ہیں' اسے بھلا عقل کب پہنچ سکتی ہے۔عقل اور علم اس کی سطح سے بہت نیچے ہیں۔عشق ان کی دسترس میں نہیں ہے لیکن یہ عشق کی دسترس میں ہیں۔کبھی کبھی ان کے بیچ تصادم بھی ہو جاتا ہے۔کیونکہ عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے'۔علم کو اپنا زعم ہے لیکن عشق ان کی پرواہ نہیں کرتا اور بڑھتا چلا جاتا ہے۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کہتے ہیں :عشق انسان کے اندر بصیرت اور قوت دونوں کا اضافہ کرتا ہے اور اسے ایسی حقیقت سے آشنا کرتا ہے جو زمانی اور مکانی نہیں۔عقل عالم مادی کو مسخر کرنے میں ید طولیٰ رکھتا ہے۔عقل خار اشگاف ہے مگر عشق عالم مادی کو پر کاہ کے برابر سمجھتا ہے عشق کی قوت طبیعیات کے علم سے پیدا نہیں ہوتی اس کا ماخذ روح انسانی ہے جس کی باطنی قوتیں لامتناہی ہیں۔ ۲۔

حضرت علامہ اقبال کا ارشاد ہے:

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰؐ، عقل تمام بولہب

یعنی وہ معرکہ جو تخلیق آدم سے شروع ہوا اور ابد تک جاری رہے گا۔ وہ لمحہ جب (سراپا عشق) فرشتوں نے تعمیل حکم الٰہی میں ذرا حیل و حجت نہیں کی اور فوراً آدم کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ اور حسن ازل (خالق کائنات) کے حکم کو پورا کیا اور دوسری طرف شیطان نے عقلی استدلال یا بالفاظ دیگر کٹ حجتی کا مظاہرہ کیا اور سجدے سے انکار کر دیا۔ مجھ پر، میرے وجدان میں ازل سے جاری عقل و عشق کا یہ معرکہ ایک بار پھر تازہ ہو گیا مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ اس معرکے کی بنیاد عشق و خرد، یقین و عدم یقین یا تشکیک ہے۔

یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے، (فلسفیوں اور دانشوروں کی کتابوں کے انبار چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں۔) کہ عقل کے نظریات استدلال سے بنتے بگڑتے ہیں۔ لیکن عشق کی بنیاد یقین پر استوار ہے، اسے چوں و چرا سے کوئی دلچسپی نہیں وہ تو حسن کے اشارۂ ابرو پر بے خطر آتش میں کود پڑنے میں خوش ہوتا ہے۔ ہر جذبہ، ہر حقیقت دلیل کی محتاج نہیں ہوتی۔ مولانا روم فرماتے ہیں:

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود
گر باستدلال کارِ دیں بُدے
فخر رازی رازدارِ دیں بُدے

ترجمہ:۔ استدلالیوں (عقلی دلائل والوں) کی عمارت لکڑی کے پایوں پر کھڑی ہوتی ہے۔ لکڑی کے پائے فی نفسہٖ کمزور اور سخت ناقابل اعتماد ہوتے ہیں۔ اگر استدلال سے دین کی ناؤ کھینچی جا سکتی یا دین کے کام ہوتے تو تو امام فخر الدین رازی دین کے سب سے بڑے رازدار ہوتے۔

یہی مضمون علامہ اقبالؒ نے بھی بیان کیا ہے:

علاج، ضعف یقیں ان سے ہو نہیں سکتا
غریب اگرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق

حضرت امام رازیؒ (صاحب تفسیر کبیر) اپنی تفسیر اور اپنی نگارشات میں اگرچہ دین کے بارے میں نادر الوجود نکات لاتے ہیں لیکن یقین کی کمزوری کا علاج ان نکات میں نہیں نہ دلائل ضعف یقین کا علاج کر سکتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا عقل یا خرد عشق کی کوئی متحارب یا متضاد قوت ہے؟ یا عشق کی معاون قوت ہے جو متوازی لکیر پر سفر کر رہی ہے۔ عشق کو عقل پر کیوں فوقیت حاصل ہے؟ عشق میں ایسی کیا قوت ہے جو ہر میدان میں (علامہ اقبال کے خیال مطابق) عقل کو پچھاڑ رہی ہے۔ یہاں کچھ باتیں تشریح طلب یا کم از کم غور طلب ہیں ان میں سب سے پہلے عشق کو لیتے ہیں:

عشق علامہ اقبالؒ کی تمام شاعری کی جان ہے۔ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ عشق وہ جذبہ ہے جو انسان کو جینے کا حوصلہ دیتا ہے۔ یہ شاید مومن کے دل میں موجود ایمان کا ایک مترادف لفظ ہے جو ایک عام انسان سے ایسے ایسے محیر العقل کارنامے انجام دلاتا ہے جسے عقل تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں۔ اس جذبۂ ایمانی کی کئی مثالیں پہلے گذر چکی ہیں۔

گاہ بحیلہ می برد گاہ بزور می کشد
عشق کی ابتدا عجب عشق کی انتہا عجب
عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگ آرزو، ہجر میں لذت طلب
عین وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا
گرچہ بہانہ جو رہی میری نگاہ بے ادب
گرمیٔ آرزو فراق، شورش ہائے و ہو فراق
موج کی جستجو فراق، قطرہ کی آبرو فراق

عشق ابتدا سے انتہاء تک (حالانکہ اس کی اس حیات میں کوئی انتہاء نہیں)۔عقل وصل پر مطمئن ہونے والے جذبے کی وکیل ہے جب کہ عشق فراق کو زندگی کی علامت قرار دیتا ہے عشق کے نزدیک وصل ''مرگ آرزو'' کا سبب ہے اور فراق ''لذت طلب'' میں مبتلاء کرنے والا جذبہ۔فراق گرمیٔ آرزو، زندگی میں حرکت و جدوجہد کی علامت ہے۔اس کے مقابلے میں عقل کسی نتیجے کی آرزو اور اس پر اطمینان کی طلب کرتی ہے۔یہاں اس کی جدوجہد ختم ہوجاتی ہے۔لیکن عشق کی دنیا میں یہ مقام (اطمینان) زندگی کی بجائے موت کا مقام ہے۔ عشق اور عقل کا موازنہ کرتے وقت ہمیں علامہ اقبال کی ایک غزل کے کچھ اشعار سامنے رکھنا ضروری ہیں:

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی
بے خطر کود پڑا ، آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لب بام ابھی
عشق فرمودۂ قاصد پہ سبک گام عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنیٔ پیغام ابھی

(۳)

ان اشعار کا خلاصہ یہ ہے کہ عقل مصلحت اندیش ہوتی ہے جبکہ عشق کے نزدیک مصلحت اندیشی ایک کمزوری ہے ایک جرم ہے، عشق کا نتیجہ بے تابی اور اضطراب ہے ادھر عقل کا نتیجہ اطمینان اور سکون ہے۔جو علامہ کے نزدیک فرد اور قوم کیلئے موت کا پیغام ہے تاہم عشق کیلئے عقل ایک حد تک معاون ہے کہ یہ اس کیلئے چراغ راہ کا کام کرتی ہے۔عشق نتائج کی پرواہ کئے بغیر آتش نمرود میں کود جانا آسان سمجھتا ہے۔لیکن ایسی کیفیت میں عقل ہمیشہ تذبذب کا شکار رہتی ہے۔عشق محبوب کے قاصد کو بھی قابل اعتماد سمجھتی ہے اور اس کی جانب سے موصول ہونے والے اشارات کو بھی محبوب ہی کا حکم سمجھ کر پوری قوت سے اس عمل پیرا ہونے

پر آمادہ ہے۔ جب کہ عقل اس خط کے حوالے سے مخمصے کا شکار ہے حضرت ابراہیمؑ کا خواب میں دیئے گئے حکم کو حکم ایزدی سمجھنا اور پورے جذبۂ ایمانی سے اس حکم کی تعمیل کیلئے اپنے عزیز ترین بیٹے کی قربانی کیلئے مقتل کی جانب چل پڑنا حضرت اسمٰعیلؑ کیلئے مکمل آمادگی اور خود سپردگی نیز راہ میں عقل کی جانب سے اس قربانی کے خلاف تمام حرکات کے خلاف ردعمل عشق کی سربلندی کی دلیل ہے حضرت اسمٰعیلؑ کا یہ جذبہ کسی علم کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ عشق کی بدولت تھا

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

عشق کی تمام تر جدوجہد کا احاطہ عقل کیلئے محال ہے۔ عشق عقل کی مدد کے بغیر اپنی منازل طے کرسکتا ہے جبکہ عقل عشق کے بغیر بے معنی جدوجہد کے سوا کچھ نہیں کرسکتی۔ بغیر نور عشق کے علم و عقل کی مدد سے دین وتمدن کی جو توجیہہ کی جائے گی وہ حقیقت پر کبھی حاوی نہیں ہوسکتی۔ عقل تصورات کا بت کدہ بنا سکتی ہے لیکن زندگی کی صحیح رہبری نہیں کرسکتی۔

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

ڈاکٹر یوسف حسین ''روح اقبال'' میں رقمطراز ہیں: ''عشق ایک زبردست شعری محرک ہے وہ انسانی جذبوں کا سرتاج ہے، اس کی وارداتیں عالمگیر ہیں۔ یہ شعری محرک دنیا کی ہر قوم کی شاعری کا سرمایہ رہا ہے'' وہ مزید کہتے ہیں ''مولانا رومؒ کے زمانے سے لے کر اب تک ہمارے شاعروں نے عشق کو عقل و علم کے حریف کے طور پر پیش کیا ہے۔ اقبال نے بھی اس مضمون پر خامہ فرسائی کی اور اسے ایسا اپنایا ہے کہ وہ گویا اسی کا ہوگیا۔ وہ جذبات کی ترجمانی اس طرح کرتا ہے کہ علم و حکمت کا پس منظر بدستور باقی ہے۔ اس لئے اس کے مطالب نہایت دقیق اور اشارے کنائے دوررس ہوتے ہیں۔ اقبال عشق کو عقل کے مقابلے میں فضیلت دیتا ہے اس واسطے کہ اس سے حقائقِ اشیاء کا مکمل علم اور بصیرت حاصل ہوتی ہے'' (۴)

اقبالیات کے سمندر کے شناوروں کے نزدیک 'خرد' فکر اقبال میں عشق کی کوئی متحارب

قوت یا حریف نہیں بلکہ ایک امدادی قوت ہے۔عقل اور عشق دونوں کی بنیادی ضرورت علم ہے نہ عقل علم کے بغیر کوئی معرکہ مار سکتی ہے نہ عشق علم کے بغیر کسی منزل سے آشنا ہوسکتا ہے۔یہ درست ہے کہ عشق علامہ کا ہمیشہ سے سب سے زیادہ پیارا موضوع رہا ہے۔اگر ان کے کلام کو جسم فرض کرلیا جائے تو عشق کو اس کی روح سمجھنا لازم ہے۔اس عشق کی وہ ہزار طرح سے تاویلیں کرتے ہیں اور اس کی سینکڑوں جہتیں بیان کرتے ہیں۔حضرت علامہ کا یہ وہ لاڈلا موضوع ہے جسے وہ جھولا جھولاتے نہیں تھکتے۔اسے بناتے ہیں سنوارتے ہیں اسے سینے سے لگاتے ہیں اور پھر پورے زور سے عشق عشق الاپنا شروع ہوجاتے ہیں۔

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعل راہ
کسے خبر کہ جنوں بھی صاحب ادراک

یہ بھی درست ہے کہ علامہ اقبال کے نزدیک عشق کے حوالے سے علم و عقل کا ایک کردار ہے اگرچہ ان کا کردار محدود ہے وہ صرف رہنمائی کا کام کرتے ہیں اسے منزل آشنا نہیں کرسکتے۔ان دونوں کرداروں کیلئے ان کی آخری منزل ان کا اپنا اپنا مقام ''سدرہ'' متعین ہے جہاں سے ایک قدم پرے رکھنے سے ان کے پر جلنے احتمال رہتا ہے۔سو یہاں سے آگے جانے کی ان کی مجال نہیں۔اس مقام سے اگلی منزل تک عشق کو اکیلے ہی سفر کرنا پڑتا ہے۔یہیں سے اس کے صاحب ادراک ہونے کی خبر ملتی ہے۔

عشق اس کتاب کا ایک مستقل موضوع ہے۔لیکن فی الحال اس وقت ہمارا موضوع عشق اور عقل کے درمیان معرکہ ہے اس لئے ضرورت ہے کہ سب سے پہلے عقل کے بارے میں گفتگو کرلی جائے۔جب سے انسان نے سوچنا شروع کیا تو اس کا پہلا موضوع کائنات اور اس کی تخلیق کے اسباب و علل ہی رہے۔اور اس کی مختلف پرتوں، حقیقتوں پر غور و فکر شروع ہوا۔کیوں، کیسے، کب، کون، وغیرہ سوالوں کے جوابات تلاش کئے جانے لگے۔عقل بنیادی کل (مشین) کے طور پر کارفرما رہی، کائنات پر غور و فکر کرتے دانشوروں نے صدیوں کا فاصلہ طے کیا۔اس تمام عرصے میں عقل کو بنیادی اہمیت حاصل رہی۔غور و فکر اور

عقل لازم وملزوم سمجھے گئے، غور وفکر کیلئے اور اپنے مرتب کئے جانے والے نتائج کو استدلالیت کی کسوٹی پر پرکھنے کیلئے عقل ہی کو استعمال کیا جاتا رہا۔ یہ سفر یونانی دبستان فلسفہ تک آ کر ایک مکمل تحریک بن گیا اور تمام علوم کا سرچشمہ عقل اور استدلال، علت اور معلول کے گرد ہی گھومنے لگا۔ کائنات کی تخلیق پر غور کرتے ہوئے افلاطون نے نظریہ دیا کہ ''وجود کی حقیقت خدا ہے جو عقل خالص ہے یہ عقل تصورات کا ایک منطقی انجام ہے، زمانی، مکانی یا جسمانی چیز نہیں''۔ (۵)۔

یہ پہلا مرحلہ تھا جہاں افلاطون نے عقل کے احاطے کے باہر ''وجود کی حقیقت'' کو ایک مبہم سے اشارے کے ساتھ ''عقل خالص'' کہہ کر علیحدہ تصور کے طور پر پیش کیا۔ یونان کے اسی دبستان کے دانشور ارسطو نے کہا:

''عقل حقیقی ہستی ہے اور اس کے علاوہ عدم ہی عدم ہے۔ لیکن اس عدم میں یہ انفعالی استعداد موجود ہے کہ وہ عقلی تصورات کو قبول کر کے وجود کی صورت اختیار کرے۔ جب تک عدم عقلی تصورات یا اعیان ثابتہ سے متاثر نہیں ہوتا تب تک وہ کوئی وجود اختیار نہیں کر سکتا، ارسطو مزید کہتا ہے کہ موجودات کا تدریجی نظام اسی اصول کی بدولت ہے'' (۶)

اس تمام گفتگو سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ عقل ہمیشہ سے موجودات اور مظاہر فطرت سے متعلق بحث وجدال میں مصروف رہی۔ یہ بات بھی عیاں ہے کہ عقل صرف خارج کو زیر بحث لا سکتی ہے جیسے آسمان، زمین، چاند، تارے سیارے، سورج، صحرا، سمندر پہاڑ موسم اور عناصر وغیرہ۔ یا وہ اشیاء جو انسان کے حواس خمسہ کی زد میں آتی ہیں اور بس عقل کا میدانی یہیں تک محدود ہے۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ''عقل وعشق'' کے حوالے سے کہتے ہیں: ''یونان میں فلسفہ ایک قسم کی مادیت سے شروع ہوتا ہوا اور ترقی کرتا ہوا خالص عقلیت تک پہنچ گیا لیکن سقراط اور افلاطون کی عقلیت بھی ماورائے عقل کنہ وجود کے تصور سے مطلقاً معریٰ نہیں خود افلاطون کے ہاں ''ایروس''، یعنی عشق ازلی کا ایک بلند تصور ملتا ہے۔ سقراط نے بھی اقرار کیا کہ میں ایک غیر

عقلی الہام سے زندگی کے اہم مواقع پر ہدایت حاصل کرتا ہوں۔ میرے اندر ایک 'دیوتا' ہے جو مجھے ایسے اقدام سے ہمیشہ دور کر دیتا ہے جو نا مناسب اور نا معقول ہو۔ اور میں اس مصدر ہدایت کے راز سے واقف نہیں۔ جو ہدایت مجھے ملتی ہے وہ استدلال کا نتیجہ نہیں ہوتی اسی لئے کسی استدلال سے میں اس کی صفت کا ثبوت بھی پیش نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔'' (۷)

اس سے یہ نتیجہ حاصل کرنا کچھ مشکل نہیں کہ حکمائے یونان بھی جو اس وقت تک عقل کے سب سے بڑے وکیل ہیں ان کے ہاں بھی کسی غیر عقلی قوت کا سراغ ملتا ہے۔ جسے بعد ازاں وجدان یا عشق کا نام دیا گیا۔ جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ کائنات کا ایک ظاہر ہے جس میں مختلف تخلیقات موجود ہیں ان کی حقیقت کا کھوج لگانے کیلئے حسی ادراک یا ریاضیاتی یا سائنسی توجیہات سے سراغ لگانے کی کوششیں کی گئی ہیں لیکن خود انسان کی طرح کائنات کا ایک بطون ہے جس تک عقل کی رسائی ممکن نہیں۔ انسان کی روح اور کائناتی بطون کا کھوج لگانے کیلئے عقل سے زیادہ وجدان کی ضرورت ہے۔ جس کے ذریعے اسرار حیات و کائنات کا انکشاف ممکن ہو سکتا ہے۔

مختلف سطحوں یا مختلف زمانوں کی دانش مختلف نتائج اخذ کرتی رہی ہے۔ ایک نسل کے مرتب کئے جانے والے نتائج بعد میں آنے والی نسلوں نے من وعن قبول نہیں کئے بلکہ اس میں یا تو مکمل تبدیلی کی گئی اور بالکل برعکس نتائج مرتب ہوئے یا جزوی تبدیلیوں کے ساتھ قبول کئے گئے اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کہتے ہیں:

''امریکہ کا مشہور ماہر نفسیات و فلسفی ولیم جیمز بھی طبیعی اور استدلالی عقل کو ہستی کے لامتناہی پہلوؤں کو مدرک نہیں سمجھتا'' (۸)

عقل و عشق دو باہم متوازی، غیر متحارب قوتیں ہیں لیکن جو انسانی نظام فکر و تدبر کیلئے لازمی عناصر ہیں۔ ان کے درمیان ایک توازن کا ہونا لازم ہے۔ یہ گراف میں دو سیدھی لکیروں سے ظاہر ہو سکتی ہیں لیکن یہ بات قابل توجہ ہے کہ عقل کی لکیر ایک خاص فاصلے کے بعد ختم ہو جاتی ہے جبکہ عشق کی لکیر لامتناہیت کی حامل ہے۔ اس کی کوئی انتہاء نہیں۔ یہ عام

مقولہ یا محاورہ ہے کہ عقل سب کچھ نہیں ہوتی نہ محض طبیعی عقلیت سے اسرار حیات و کائنات منکشف ہو سکتے ہیں ۔اس طرح صرف محض طبیعی عقلیت پر انحصار لا حاصل ہے۔عقل استدلالیت کے بھنور میں اس طرح پھنسی ہوتی ہے کہ اصل حقیقت سے دور نکل جاتی ہے ۔

عقل در پیچاک اسباب وعلل
عشق چوگاں بازِ میدان عمل
عقل را سرمایہ از بیم وشک است
عشق را عزم ویقیں لا ینفک است

ترجمہ: عقل اسباب وعلل (استدلال) کے الجھاووں میں الجھی ہوتی ہے۔عشق میدان عمل میں فراٹے بھرتا ہے۔عقل کا سرمایہ امید وشک سے کشید ہوتا ہے وہ تشکیک سے اپنے سفر کا آغاز کرتی ہے۔لیکن عشق کیلئے اس کا ہر قدم مصمم ارادے اور مکمل یقین کے ساتھ اٹھتا ہے۔عزم ویقین اس کی کل کائنات کے اجزائے لاینفک ہیں۔

عقل کو اسباب کی ضرورت پڑتی ہے،سبب خواہ لفظی ہوں یا طبیعی،ان کے بغیر عقل دو قدم نہیں چل سکتی۔زندگی اور زندگی کے مسائل ومعاملات کو بھی وہ اسباب وعلل کے ترازو پر تولتی اور ان کے حل کیلئے انہی اسباب سے کام لینا اس کی مجبوری ہے۔لیکن عشق مجبور نہیں زندگی کے جس چاک کو عقل نہیں سی سکتی اس کو عشق اپنی کرامات سے سی سکتا ہے۔اس کیلئے اسے کسی قسم کے اسباب کی ضرورت نہیں پڑتی نہ سوئی کی نہ دھاگے کی۔

وہ پرانے چاک جن کو عقل سی سکتی نہیں
عشق سیتا ہے انہیں بے سوزن و تار رفو

شاعر مشرق حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ بے شک عشق کے مقابلے میں عقل کو سب کچھ نہیں سمجھتے بلکہ شاید بہت کچھ بھی نہیں۔آپ ارشاد فرماہیں:

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں

وہ مزید کہتے ہیں:

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

خرد کی بنیاد تشکیک اور تذبذب ہے جب کہ عشق کی بنیاد یقین اور اعتماد ہے۔ خرد کی بنیاد استدلال پر ٹکی ہے اور عشق استدلال کی پرواہ نہیں کرتا، نری استدلالیت سے عشق کو چڑ ہے۔ عشق ایسی منزل کا راہی ہے جس کی کوئی انتہا نہیں لیکن اسے منزل کی اتنی فکر بھی نہیں وہ تو کوشش پیہم سے عبارت ہے۔ اس ضمن میں ایک اور اقبال شناس مولانا سید ابوالحسن ندوی کی رائے ہے کہ ''اقبال حکمت و فلسفہ اور دوسرے علوم نظری میں بھی اپنی ایک مخصوص رائے رکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کوئی بھی نظریہ اور فلسفہ جب تک اپنی پشت پر جہد و جہاد کی قوت اور ایثار و قربانی کی ہمت نہیں رکھتا وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ فلسفہ ہو یا کوئی اور علم ہو اگر محض علمی بحث و نظر، لفظی بازی گری اور مابعد الطبیعی مناقشہ آرائی تک محدود ہے اور زندگی کے میدان میں نہیں اترتا اور انسانی معاشرے کے مسائل سے صرف نظر کرتا اور اپنی الگ دنیا میں رہنا چاہتا ہے تو ایسے علم و فلسفہ کیلئے زندگی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ ایسا نظریہ و فلسفہ ایک دن اپنی موت آپ مر جائے گا۔ (۹)

یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خون جگر سے''

علامہ اقبال جب بھی خرد اور عشق کے درمیان امتیاز کرتے ہیں۔ تو ان دونوں کی صفات بیان کرتے ہوئے دونوں کے درمیان تفاوت کا اظہار ضرور کرتے ہیں۔ وہ خرد کی افادیت کے منکر نہیں لیکن عشق کے مقابلے میں خرد کو کم تر ضرور ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پیام

مشرق میں ''محارہ علم وعشق'' میں اسی طرح کا مکالمہ ہے: (اشعار ذیل میں ہیں)

علم کہتا ہے کہ میری نگاہ ساتوں ولایتوں (ساری کائنات) اور چاروں عناصر (آگ، پانی، مٹی، اور ہوا) سب پر ہے۔ تمام آسمانوں اور زمینوں کے سارے بھیدوں کی واقف ہے۔ زمانہ میرے پھندے میں پھنسا ہوا ہے یعنی میں (خرد) اس کے نشیب وفراز سے آگاہ ہوں اللہ تعالیٰ نے میری آنکھیں اس رخ پر (جانب ارضی) کھولیں۔ بھلا مجھے آسمان سے اُدھر کی جانب کیا کام۔ مجھے تو آسمان سے نیچے کے علوم سے غرض ہے۔ میں ایک ایسی کائنات ہوں کہ پر کھولتا ہوں تو ہزاروں سینکڑوں راز مجھ پر آشکار ہوتے ہیں۔ میرے ساز سے سینکڑوں نغمے پھوٹتے ہیں۔ میری تحقیق لوگوں میں عام ہوتی ہے میں ہزاروں راز کھول کر بازار میں پھینک آتا ہوں اور عوام الناس اس تحقیق سے مستفید ہوتے رہتے ہیں۔ میں اپنی کسی تحقیق کو پوشیدہ نہیں رکھتا۔ میری تحقیق تو لوگوں کے فائدے کے لئے ہوتی ہے۔

نگاہم رازدار ہفت و چار است
گرفتار کمندم روزگار است
جہاں بینم نہ ایں سو باز کردند
مرا با آں سوئے گردوں چہ کار است
چکد صد نغمہ از سازے کہ دارم
بہ بازار افگنم رازے کہ دارم

خرد کی اس گفتگو کے بعد عشق اپنی بات کرتا ہے وہ علم کے پردے میں خرد سے مخاطب ہے:

ز افسون تو دریا شعلہ زار است
ہوا آتش گذار و زہردار است
چو با من یار بودی ، نور بودی
بریدی از من و نورِ تو نار است

بہ خلوت خانۂ لاہوت زادی
ولیکن در نخ شیطاں فتادی
بیا زیں خاک داں را گلستاں ساز
جہانِ پیر را دیگر جواں ساز
بیا یک ذرّہ از دردِ دلم گیر
تہِ گردوں بہشت جاوداں ساز
ز روزِ آفرینش ہم دم استیم
ہماں یک نغمہ رازیر وبم استیم

۔اے خرد تیرے علمی شعبدوں سے دریا شعلہ زار ہے (دریا کے پانی میں بھی آگ لگتی ہے، دریا کے پانیوں میں شعلہ پیدا ہوتا ہے) ہوا آگ چھوڑتی ہے اور فضا زہریلی ہوتی ہے۔ ۔یہ کائنات کیلئے زندگی کا نہیں موت کا سبب بن رہا ہے۔۔اے خرد تو جب تک میرے ساتھ تھا تو نور تھا لوگوں کیلئے راحت وآرام کا سبب تھا۔سکون کا باعث تھا۔مجھ سے الگ ہوا تو تو یہ نور اب نار بن گیا ہے۔ تیرا وجود مفید ہونے کی بجائے مضر رساں ہو گیا ہے۔ تیری تحقیق انسانیت کیلئے تباہ کن ہو رہی ہے۔ ہر طرف آگ ہی آگ ہے۔ چیخ وپکار ہے۔ تیرا جنم خلوت خانۂ لاہوت میں تھا جس کا اب تو اس کا منکر ہو گیا ہے۔تمہاری اس روش سے تو شیطان کے پھندے میں پھنس گیا ہے۔جس کام ہی کائنات کے نظام کو تباہ کرنا ہے۔اور یہی کام اس نے اپنے لئے پسند کیا۔سو تو نے بھی اسی کے کام کو اپنے لئے پسند کر لیا ہے۔

تو اپنی اس روش سے باز آ۔آ اور میرا ایک بار پھر ہم جلیس بن کہ ہم دونوں مل کر اس آگ کو بجھائیں ۔ اس تباہی سے دنیا کو نجات دلائیں۔اس خاکداں کو ایک بار پھر گلزار بنا دیں دنیا کے اس ضعف کو جو تیری بدولت پیدا ہوا ہے ایک بار شباب میں تبدیل کریں۔

آ اور میرے درد دل سے ایک ذرہ لے اور آسمان کے نیچے اس دنیا کو ہمیشہ کیلئے جنت بنا دے۔

اے خرد اس حقیقت کو کبھی فراموش مت کر کہ ہم ازل سے ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ ہم ایک ہی نغمے کے مختلف سر ہیں (زیر و بم ہیں)۔ علم بے عشق اور عشق بے علم دونوں غیر مفید ہیں۔ (۱۰)

حوالہ جات

۱۔اقبال،علامہ :کلیات فارسی؛رموز بیخودی
نظم:درمعنی حریت اسلامیہ وسر حادثۂ کربلا
۲۔خلیفہ عبدالحکیم ،ڈاکٹر ،فکر اقبال صفحہ ۲۷۳
۳۔اقبال،علامہ،کلیات اردو بانگ درا غزلیات حصہ سوم غزل ۳
۴۔ڈاکٹر یوسف حسین ''روح اقبال''
شاعت پنجم صفحہ ۴۹ ناشر جامعہ ملیہ دہلی ۱۹۴۲ء)
۵۔ خلیفہ عبدالحکیم،ڈاکٹر: حکمت رومی صفحہ ۲۵۵۔
۶۔ایضاً
۷۔خلیفہ عبدالحکیم ،ڈاکٹر : فکر اقبال صفحہ ۲۵۲ ناشر بزم اقبال جنوری ۲۰۱۰ء
۸۔۱۰ایضاً ء)
۹۔ابوالحسن ندوی' نقوش اقبال' صفحہ ۹۹ ناشر سروسز بک کلب کراچی ۱۹۸۸ء
۱۰۔اقبال ،علامہ :کلیات فارسی، پیام مشرق 'محاورہ علم وعشق'

اقبال کے دیگر تصورات اور عشق

ا۔تصور خودی

عرفان ذات سے نیابت الٰہی، نیابت الٰہی سے وصل الی الحق تک

عرفان نفس، اطاعت رسولؐ، اطاعت الٰہی، عرفان رب کائنات

نیابت الٰہی، قربت الٰہی، دیدار الٰہی

وصل دائمی (وصل الی الحق)

علامہ اقبال نے جو تصورات بھی اپنی حکمت، فلسفے، نثر اور شاعری کے ذریعے ملت اسلامیہ یا دنیا کو دیئے۔ان سب کا مقصود و مطلوب صرف آدمی کو انسان بنانا ہے۔فرد کو اس کی اپنی شناخت، عرفان نفس کیلئے آمادہ کرنا ہے۔خودی، بے خودی، مرد مومن، عشق، حرکت اور دوسرے تصورات ان سب کا مقصد، ان سب کا مرکز انسان ہے۔ایک انسان کی تعمیر، اس کی روح کی تعمیر اور اس تعمیر شدہ روح کو جسمانی تقاضوں کے اندھیروں سے عشق الٰہی کی روشنی کی طرف لے جانے کی کوشش۔خود خالق کائنات، خدائے مطلق بھی انسان سے ارشاد فرماتا ہے : اللہ ایمان والوں (جن کے دلوں میں عشق الٰہی کی شمع جل رہی ہے) کا دوست ہے اور انہیں اندھیروں سے روشنی کی جانب لے جاتا ہے''۔

خودی:

اقبال کے ہاں بھی باقی شیوخ وصوفیاء کی طرح عشق کا سب سے پہلا اور دوسرا مرحلہ ''ہویٰ'' اور ''علاقہ'' ہی ہے لیکن متبادل نام (عرفان) سے، علامہ علاقہ سے مراد کسی

دوسرے سے شناسائی یا جان پہچان کو نہیں کہتے بلکہ خود اپنے آپ سے جان پہچان، اپنی ذات کے عرفان، اپنی صلاحیتوں کی پہچان اور اپنے مقصد تخلیق سے آگاہی کو کہتے ہیں۔ یہ مرحلہ علامہ کے معروف ترین مقدمے یا فلسفے ''فلسفہ خودی'' کا بھی پہلا مرحلہ ہے۔ علامہ اقبال کے پورے کلام کی روح خودی ہے یہ آدمی کی تربیت کا پہلا زینہ ہے جو عرفان نفس سے نیابت الٰہی کے مراحل پر مشتمل ہے۔

خودی فرد کی تربیت کی لئے کتنی اہم ہے؟ اور یہ مرحلہ آدمی کو انسان بننے کیلئے کیسے ضروری ہے؟ خود علامہ نے ''اسرار خودی'' کے پہلے ایڈیشن کے مقدمے میں اس پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے: اس مقدمے کا مختصر تذکرہ شاید یہاں بے محل نہ ہو:

''ا۔ یہ وحدت وجدانی یا شعور کا نقطہ جس سے تمام انسانی تکمیلات و جذبات و تمنیات مستنیر ہوتے ہیں یہ پراسرار شے جو فطرت انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے، یہ 'خودی' یا 'انا' یا 'میں'، جو اپنے عمل کی رو سے ظاہر ہے لیکن اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے، جو تمام مشاہدات کی خالق ہے مگر جس کی لطافت مشاہدہ کی گرم نگاہوں کی تاب نہ لاسکتی، کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے؟ یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنی فوری عملی اغراض کے حصول کی خاطر، اپنے آپ کو اس فریب تخیل یا دروغ مصلحت آمیز کی صورت میں نمایاں کیا ہے، اخلاقی اعتبار سے افراد و اقوام کا طرز عمل، اس نہایت ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جس کے حکماء و علماء نے کسی نہ کسی صورت میں اس سوال کا جواب پیدا کرنے کیلئے دماغ سوزی نہ کی ہو، اگر اس سوال کا جواب افراد و اقوام کی دماغی قابلیت پر اس قدر انحصار نہیں رکھتا جس قدر ان کی افتاد طبیعت پر، مشرق کی فلسفی قومیں زیادہ تر اسی نتیجے کی طرف مائل ہوئیں کہ انسانی انا محض ایک فریب تخیل ہے اور اس پھندے کو گلے سے اتار دینے کا نام نجات ہے۔ مغربی اقوام کا عملی مذاق ان کو ایسے نتائج کی طرف لے گیا جس کیلئے ان کی فطرت متقاضی ہے۔۔'' (۱)

خودی کی تشریحات علامہ اقبال کے سارے کلام میں جگہ جگہ موجود ہیں۔ علامہ ارشاد

فرماہیں:

پیکر ہستی ز آثار خودی است
ہر چہ می بینی ز اسرار خودی است
خویشتن را چوں خودی بیدار کرد
آشکارا عالم پندار پندار کرد
صد جہاں پوشیدہ اندر ذات او
غیر او پیداست از اثبات او

ترجمہ: ۔عالم موجودات خودی کے نشانوں میں سے ایک نشاں ہے ۔تُو جو کچھ یہاں دیکھ رہا ہے اس کا تعلق خودی کے رازوں کا کرشمہ ہے۔

۔جب خودی نے اپنے آپ کو جگایا تو اس نے عالم کبریائی کو آشکارا کر دیا۔

۔اس (خودی) کی ذات میں سینکڑوں عالم چھپے ہوئے ہیں ۔اس کے اثبات ہی سے اس کا ماسوا ظاہر ہے (جب خودی تعین کرتی ہے اور اس طرح اپنا ثبات وقیام چاہتی ہے تو اس کا غیر پیدا ہو جاتا ہے)

در جہاں تخم خصومت کاشت است
خویشتن را غیر خود پنداشت است
سازد از خود پیکر اغیار را
تا فزاید لذت پیکار را
می کشد از قوت بازوئے خویش
تا شود آگاہ از نیروئے خویش
خود فریبی ہائے او عین حیات
ہمچو گل از خوں وضو عین حیات

۔اس (خودی نے عالم امکان میں اپنی ضد خود پیدا کی اور خود کو اپنا غیر سمجھ لیا۔

۔وہ اپنی طرف سے یا اپنی ذات سے (خود) اپنے غیروں کے وجود تیار کرتی ہے، تا کہ پیکار (کشاکش، کشمکش) کی لذت میں اضافہ ہو سکے۔

۔(پھر) وہ اپنی قوت بازو سے اپنے حریف (غیر) کو مار ڈالتی ہے تا کہ وہ اپنی طاقت و توانائی سے آگاہ ہو سکے۔ (گلاب کے پودے کی بہترین کھاد خون ہے)

۔اس کی تمام خود فریبیاں سراسر اصل حیات ہیں۔گلاب کی طرح خون سے وضو کرنا ہی اس کی زندگی ہے۔

جس طرح گلاب کے پودے کو خون حیوان سے سینچتے ہیں کہ اس پودے کی نشو ونما بہتر انداز میں ہو اور اس کے مآل یعنی پھول کے رنگ میں زیادہ چمک زیادہ نکھار اور خوشبو میں زیادہ بہار آئے، اسی طرح خودی کو خون (شدید و مسلسل محنت اور قربانی) سے سینچنے کی ضرورت ہے۔خودی کو کبھی گلاب سے تشبیہہ دیتے ہیں کبھی گل لالہ سے، اور اس کی قبا کیلئے ''خون عرب''، یعنی امت مسلمہ کی قربانیوں کو ضروری سمجھتے ہیں۔اب خودی کوئی خالی تصور نہیں بلکہ یہ تربیت آدم (مومن) کی ترتیب ہے یہ ہر انسان کی لازمی صفت کے طور پر سامنے آتی ہے۔ جو شدید محنت اور قربانیوں سے وجود میں آتی ہے۔

ہستیٔ مطلق کی ماہیت خودی ہے۔'ماسوا' اس کی ذات کے اظہار کیلئے ضروری ہے لیکن ماسوا بھی خدا کے سوا کچھ نہیں (اس کا وجود خدا ہی کی تخلیق کی ہوئی اشیاء وصفات کا محتاج ہے۔شیطان کے پاس جو جو کچھ ہے وہ اللہ ہی کا بخشا ہوا ہے، بت جن چیزوں سے بنتے ہیں وہ ساری چیزیں اللہ ہی کی مخلوق ہیں) اگر چہ (دنیا میں) عمل کی خاطر خدا اس کو اپنا غیر سمجھ لیتا ہے۔خدائے مطلق جوانائے مطلق ہے ان سب کا خالق ہے کہ وہ ایک ہیجو:

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود کل کوزہ
خود بر سر آں کوزہ خریدار برآمد

ترجمہ: وہ خود ہی کوزہ ہے، خود ہی کوزہ گر ہے اور خود ہی کوزے کا مادۂ تخلیق بھی ہے اور پھر جب کوزہ تیار ہو جاتا ہے تو خود ہی اپنے بازار میں اپنے بنائے ہوئے کوزے کا خریدار بھی

ہے

ضد کا وجود اصل کی پہچان کیلئے لازم ہے۔ اندھیرا، دن کے اجالے کی پہچان کا ذریعہ ہے، ظلم عدل کی پہچان کا، کفر، ایمان کا، برائی اچھائی کی پہچان کراتی ہے۔ کیونکہ اصل اور ضد کے مابین کشمکش ہی عین حیات ہے اور باعث تکمیل حیات ہے۔ خدا نے خود نفس کی قسم کھا کر ارشاد فرمایا کہ اسی نے نفس میں برائیوں کو بھی رکھا اور نیکی کرنے کی جبلت بھی رکھی۔ (اب عمل کا انحصار نفس پر ہے کہ وہ کس کو اختیار کرتا ہے) اگر اس نے تزکیہ والا راستہ اپنایا تو وہ کامیاب ہوگا اور اگر اس کے برعکس والا راستہ اپنایا تو وہ خجل ہو جائے گا۔۔ (**قد افلح من زکّھا و قد خاب من دسّھا**. ترجمہ: جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا وہ کامیاب ہوا اور جس نے ایسا نہیں کیا وہ برباد ہوا۔ (۲)

ایک مومن کی مثال لیں تو کہہ سکتے ہیں کہ مومن کے تن کا خالق وہی ہے، وہی اس کی روح کا خالق بھی ہے اس کے دل کا، اس میں بسنے والے ایمان کا، اس کے جسم سے سرزد ہونے والے اعمال کا، جنت جہنم کا، میدان حشر کا، سزا جزا کا ان سب کا خالق وہی ایک ہے۔ وہی انائے مطلق ہے۔

انائے انسانی بھی انائے مطلق کا پرتو ہے، اسی کے وجود کا حصہ ہے، انسانی خودی کا ہدف بھی انائے مطلق کا قرب ہے۔ یہی انسانی معراج ہے اور انسان کی تخلیق، ہبوط آدم، وصل الی الحق کا مقصد حقیقی بھی، راستہ (صراط مستقیم) بھی سفر بھی، زادراہ بھی اور منزل حقیقی بھی ہے۔ ہم اللہ سے خودی کی طلب کرتے ہیں اور خودی سے اللہ کی طلب۔ کیونکہ خودی کا اصل مدعا خدا سے وصل یا اس کا قرب ہے۔

از ہمہ کس کنارہ گیر صحبت آشنا طلب
ہم ز خدا خودی طلب، ہم ز خودی خدا طلب

صحبت آشنا کی طلب ہر ذی نفس کے دل کی آواز ہے وہ جہاں کہیں جائے، جس سطح پر ہو یہ تڑپ اس کے اندر باقی رہتی ہے، سو، خدا سے خودی (وجود کے نفس کی بقا کے ساتھ) اور

خودی سے خدا طلب مطمعٔ نظر ہے۔ خدا سے اس کے قرب کی طلب کیلئے خدا سے محبت کا ہونا لازم ہے، خدا سے محبت کیلئے اتباع رسولؐ شرط اول ہے اور اتباع کیلئے محبت لازم ہے محبت کے بغیر دعویٰ اتباع فضول اور بغیر عشق کے عبادت الٰہی محض جسمانی مشقت ہے۔

خودی کی سب سے پہلی منزل ''عرفان'' ہے۔ اسے آپ عرفان نفس سے شروع کریں یا عرفان خودی سے، خودی کے تصور سے آگہی پہلی منزل ہی ٹھہرتی ہے۔ خودی کے مراحل اس کے بعد شروع ہوتے ہیں۔ خودی کی صفت کے حصول کیلئے نفس کے لئے خودی کی صفت سے آگاہی لازمی ہے۔ جب تک ایک شخص کو خودی کے متعلق علم نہ ہو اور وہ اس کیلئے اپنے دل سے، جی جان سے تیار نہ ہو۔ وہ خودی کے سفر پر روانہ سے پہلے اپنی منزل سے آگاہ نہ ہو تو وہ خودی کی لذتوں سے آشنا نہیں ہوسکتا۔ خودی کے حصول کی خواہش'' ہوٗ ''ہے۔ یہ درجہ 'ہوٗ' کا یعنی خواہش سفر۔ یہی عشق کا پہلا زینہ ہے۔

خودی کی منزل کے حصول کیلئے مسافر کے دل میں اپنے سفر اور منزل سے محبت لازمی ہے۔ کیونکہ محبت کے بغیر وہ ایک قدم بھی اپنی منزل کی جانب نہیں اٹھا سکتا۔ یہی آشنائی عشق کا دوسرا مرحلہ یا درجہ یا زینہ ہے جسے شیوخ یا صوفیائے کرام کے نزدیک 'علاقہ' کا نام دیا گیا ہے۔ یعنی تعلق، اور تعلق کی یہ ڈور جب انسان کے دل سے بندھ جاتی ہے تو اس کیلئے اپنی ذات کی پہچان اور انائے مطلق سے قرب کی منزل پر قدم رکھنا آسان ہوجاتا ہے۔

تلاش او کنی جز خود نہ بینی
تلاش خود کنی جز او نہ بینی

ترجمہ: تلاش حق خود سے آشنائی (عرفان نفس) کے بغیر بے معنی اور اپنی تلاش (عرفان نفس) (اس کے عشق کے بغیر) اس کو دیکھے بغیر فضول۔

علامہ اقبال خودی کے حوالے سے اپنی نظم ''خطاب بہ اقوام سرحد'' میں ارشاد فرماہیں:

اے زخود پوشیدہ، خود را بازیاب
ور مسلمانی حرام است ایں حجاب

رمز دینِ مصطفٰے دانی کہ چیست؟
فاش دیدن خویش را شاہنشیست

اے وہ شخص تو جو اپنی ذات ہی سے ناواقف ہے اور خود سے ہی پوشیدہ ہے، اپنے آپ کو ڈھونڈ، اپنا آپ پہچان، اپنے آپ کو دوبارہ پالے (قرون اولیٰ کے مومن کی طرح) اس طرح کے حجاب میں کہ تو خود ہی خود کے حجاب میں ہے مسلمانی حرام ہے۔ کیا تو جانتا ہے کہ مسلمان ہونا کسے کہتے ہیں، دین مصطفیٰؐ (اسلام) کی رمز و شناخت کیا ہے؟ مصطفوی ہونا کسے کہتے ہیں؟ تو جان لے کہ اپنے آپ کو آشکارا کرنا، خود کو خود پر ظاہر کرنا، اپنی ذات کا عرفان ہی دراصل پادشاہی ہے۔ (جو خود کا عرفان حاصل کر لیتا ہے کائنات کے ہر ہر ذرے پر حکمران ہو جاتا ہے ہر ایک ذرہ اس کا مطیع ہو جاتا ہے)۔

اسی خیال کو زیادہ اصرار کے ساتھ بیان کرتے ہوئے اسی نظم میں کہتے ہیں:

آں مسلمانے کہ بیند خویش را
از جہانے برگزیند خویش را
تا دلش سرّے ز اسرار خدا ست
حیف اگر از خویشتن نا آشناست

ترجمہ: وہ مسلمان جو خود کو پہچان لیتا ہے، اپنے آپ کو پالیتا ہے، وہ خود کو اس کائنات میں برگزیدہ بنالیتا ہے۔ چونکہ اس کا دل اسرار خداوندی میں سے ایک بھید ہے اس لئے ایسے مسلمان پر افسوس ہے جو اپنے آپ ہی سے ناآشنا رہتا ہے۔

۳۔

یہی خودی انفرادیت سے ترقی کر کے اجتماعی خودی بن کر بے خودی کا روپ دھار لیتی ہے۔ اس روح یعنی خودی کی بھی ایک روح ہے جسے عشق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ خودی کی انتہائی بلندی یعنی نیابت الٰہی کی منزل تک پہنچنے کیلئے اسے اسی عشق کی ضرورت ہے یہ عشق امتی کا رسولؐ سے اور رسولؐ کا اللہ سے اور رسولؐ کے واسطے سے بندے کا اللہ سے عشق۔

کائنات کے سارے منظر نامے کی کل حقیقت یہی ہے یہی مثلث ہے جو کائنات کی تخلیق کی غایت اولیٰ ہے جس کے بغیر امت کا وجود ممکن نہیں۔ انسانوں کے کسی بھی گروہ میں اگر عشق یا بالفاظ دیگر ایمان کی صفت موجود ہوگی تو وہ امت کہلائے گی جس کا ایک ہی نصب العین ہوگا یعنی اللہ کا قرب، اور وہ اپنے نصب العین سے بہت مخلص ہوگی اس پر پوری سچائی سے ایمان رکھتی ہوگی اپنے نصب العین کو پورا کرنے کیلئے کسی بھی قربانی سے گریز نہیں کرے گی اعلان نبوت سے ہجرت تک، بدر سے حنین تک وہی عشق جس کی ابتدا اسماعیلؑ ہے اور انتہا حسینؓ۔ وہی عشق جو کبھی یرموک میں نظر آتا ہے کبھی قادسیہ میں، کبھی کربلا میں۔ کبھی بیت المقدس میں، کبھی سومنات میں، کبھی ترائن میں، کبھی پانی پت میں، کبھی سرنگاپٹم میں۔ کبھی اندلس میں کبھی نیشاپور میں کبھی قسطنطنیہ میں۔ الغرض میدان کوئی بھی ہو قربانیوں کی لازوال داستانیں تاریخ کے اوراق کی زینت ہیں۔ ایسی داستانوں کا وجود جذبۂ عشق کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ پس ایسا ہی گروہ امت کہلانے کے قابل ہے اور علامہ یہی جذبہ یعنی جذبۂ عشق امت کے ہر فرد کے دل میں پیدا کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ قرآنی اسلوب کی پیروی کرتے ہوئے مسلمانوں کو ان کے ماضی سے آگاہ کرکے، رسول اللہ ﷺ، عشاق رسول ﷺ کی داستانیں سنا سنا کر ان کی مثالیں دے دے کر دور حاضر کے مسلمانوں کو باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ سابقہ قرون والوں کے عروج کی حقیقی وجہ ان کے دلوں میں عشق رسول ﷺ کے جذبے کی شدت تھی۔ اور یہی مستقبل میں بھی عروج کی دلیل ہوسکتی ہے دور حاضر میں مسلم امت جس زوال کی کیفیت سے گذر رہی ہے اس صورت حال سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں صرف اس سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ پیدا کرنا چاہئے دلوں کے اندھیروں میں ایمان کی روشنی، اللہ سے شدت محبت اور رسول اللہ ﷺ کی (غیر مشروط) پیروی، بس یہی ہتھیار کافی ہیں۔ اسرار خودی میں علامہ نے فرمایا ہے:

عالم از ما صاحب تکبیر شد
از گِلِ ما کعبہ ہا تعمیر شد

حرف 'اقراء' حق بما تعلیم کرد
رزق خویش از دست ما تقسیم کرد
گرچہ رفت از دست ما تاج و نگیں
ما گدایاں را بچشم کم مبیں
در نگاہ تو زیاں کاریم ما
کہنہ پنداریم ما ، خواریم ما
اعتبار از لا الٰہ داریم ما
ہر دو عالم را نگہ داریم ما
از غم امروز و فردا رستہ ایم
باکسے عہدِ محبت بستی ایم
در دل حق سرّ مکنہ نیم ما
وارث موسیٰ ؑ و ہارونیمؑ ما
مہر و مہ روشن ز تاب ما ہنوز
برق ہا دارد سحاب ما ہنوز
ذات ما آئینۂ ذات حق است
ہستیٔ مسلم ز آیات حق است

(۴)۔

ترجمہ:۔۱۔ساری دنیا کو ہم نے تکبیر سکھائی، انہیں اللہ سے روشناس کروانے والے ہم ہی ہیں۔ ہماری مٹی یعنی ہمارے ہی دم سے کئی کعبے تعمیر ہوئے (دنیا میں اسلام کی روشنی پھیلی)۔

۲۔اللہ نے ہمیں 'اقراء' کے لفظ کی تعلیم دی تھی اور اس نے اپنی مخلوق کا رزق ہم سے وابستہ کیا تھا ہمارے ہاتھوں سے تقسیم کرایا تھا۔

۳۔اگر چہ ہم سے تاج و نگیں چھن گیا یعنی دنیا کا اقتدار ہمارے ہاتھوں سے جاتا رہا تاہم (اے غیر) تو ہم فقیروں کو حقارت سے نہ دیکھ۔غیر مسلم ہمیں حقارت سے نہ دیکھیں۔ کیونکہ زوال کی یہ کیفیت عارضی ہے۔دنیا کی امامت کیلئے جن اوصاف کی ضرورت ہے وہ بہت جلد امت مسلمہ میں پیدا ہونے والے ہیں۔یعنی شجاعت،امانت اور صداقت۔

سبق پھر پڑھ شجاعت کا صداقت کا امانت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امانت کا

۴۔تیری نظروں میں تو ہم گھاٹے کا سودا کرنے والے ہیں۔رجعت پسند ہیں، دقیانوسی سوچ کے حامل ہیں۔ماضی پرست ہیں اور ذلیل وخوار ہیں۔

۵۔کیا کبھی سوچا ہے کہ لا الٰہ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) ہی سے ہماری عزت و آبرو تھی اور ہے۔اور ہم دونوں جہانوں کو پیش نظر رکھتے ہیں کیونکہ یہ کلمہ دونوں جہانوں کی کامیابی کی کلید ہے۔

۶۔ہم حال اور مستقبل کے غم سے نجات پائے ہوئے ہیں۔(فکر کی بات نہیں) ہم نے ایک ہستی (حضرت محمد ﷺ) سے محبت کا عہد کر رکھا ہے۔ہمیں اپنے اللہ پر مکمل ایمان اور بھروسہ ہے۔وہ ہمیں دنیا و آخرت میں سرخرو کرنے کے اسباب ضرور فراہم کرے گا۔

۷۔ہم خدا کے دل کا چھپا ہوا بھید ہیں۔ہم حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے ترکے کے وارث ہیں۔

۸۔سورج اور چاند ابھی تک ہماری تب و تاب سے روشن ہیں ابھی تک ہمارے بادل میں بجلیاں روشن ہیں۔

۹۔ہمارا وجود خدا کے وجود کا آئینہ ہے مسلمان کا وجود خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔'

علامہ کے دل کے اندر سے اپنے زمانۂ حال کی حالت دیکھتے ہوئے،اور ہم مسلکوں اور ہم مشربوں کو دنیاوی زندگی کی رنگا رنگی میں بہکتے ہوئے اور لحاتی مزے کیلئے جدوجہد کرتے

ہوئے دیکھنے کا دکھ محسوس ہوتا ہے۔ایک لمحے کیلئے مایوسی ان پر غالب آتی ہے اوران کا سوز ان کی زبان پر آجاتا ہے۔انہیں اپنے آس پاس اپنا کوئی ہمنوا نظر نہیں آتا جس سے وہ اپنے دل کی بات کہہ سکیں۔وہ یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ایسی غلامی کی زندگی ان کے لئے زہر ہے،موت کا پیغام ہے۔گو یہ بزم کائنات صدیوں پرانی ہے۔اوران کے دیس میں صدیوں کی غلامی نے عوام کے دلوں کو غلامی پر راضی کرلیا ہے لیکن وہ اس صورت حال کو اس طرح قبول نہیں کر سکتے جس طرح ان کے باقی ہم وطنوں نے قبول کرلیا ہے۔ان کے دل میں ایک انقلاب کروٹیں لے رہا ہے اور وہ قوم کو اس بندِ غلامی سے نجات دلانے کیلئے تڑپتے ہیں۔اورعشق کے جذبے کو ایک ایک کے دل میں جگانا چاہتے ہیں۔اوران کو پھر وہی مقام دلانے کے آرزو مند ہیں جس پر کبھی یہ قوم فائز رہ چکی ہے۔وہ اس پر بھی افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ ہر دل میں زمانے کے آزروں کے بنائے گئے (روایات کے، رواجوں کے) سومناتوں کو ڈھانے کیلئے کوئی غزنوی میدان میں موجود نہیں حالانکہ روایات کے یہ بت اپنی سکت کھو چکے ہیں اور گرائے جانے کے منتظر (volnerable) ہیں۔خیاباں میں لالہ منتظر ہے اوراس کو خون عرب سے قبا چاہئے لیکن ایسا ہوتا نظر نہیں آتا۔کیونکہ آج کارزار حیات میں ایک بھی حسینؓ نہیں دوسری طرف بے شمار شمر ہیں، یزیدوں کی بھرمار ہے۔حالانکہ گیسوئے فرات کی تاب ابھی تک قائم ہے اس میں اب بھی وہی دم خم ہے اور اس میں کربلا کا میدان سجانے کی صلاحیت اب بھی موجود ہے لیکن جب قافلۂ اسلام اپنے امام، اپنے مرشد حضرت امام حسینؓ کے وجود ہی سے خالی ہے تو قربانی کہاں سے آئے۔زمانے کو پھر اسی راہ پر لانے کیلئے جس جذبے کی ضرورت ہے اور جس کا نام عشق ہے۔کیونکہ یہی جذبہ عقل ودل ونگاہ کا مرشد اولیں ہے۔اگر دلوں میں عشق کا جذبہ موجزن نہیں تو خدا تک پہنچنے کے ہر راستے میں، عشق الٰہی کی راہ میں دیگر رکاوٹوں کے ساتھ ساتھ خود عشق کو آگے بڑھانے والے تمام مروجہ تصورات بھی سدراہ بن سکتے ہیں۔ہر نبیؑ کی طرح (بلکہ اس کچھ زیادہ ہی) سیرت نبی ﷺ کا ہر لمحہ، ہر عمل ، ہر معرکہ گواہ ہے کہ بدر سے حنین تک آپ ؐ کی زندگی عشق الٰہی کی لازوال داستان ہے۔اسی

طرح نبی پاک ﷺ کے تربیت کردہ اصحاب کبارؓ اور آپ ﷺ کے (اہل بیت) کنبے والوں کی تمام داستانیں بھی عشق ہی سے عبارت ہیں۔

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لئے مئے حیات
کُہنہ ہے بزم کائنات، تازہ ہیں میرے واردات
کیا نہیں اور غزنوی کارگہِ حیات میں
بیٹھے ہیں کب سے منتظر، اہل حرم کے سومنات
ذکر عرب کے سوز میں، فکر عجم کے ساز میں
نے عربی مشاہدات ، نے عجمی تخیّلات
قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں
گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات
عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات
صدق خلیلؑ بھی ہے عشق، صبر حسینؓ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

علامہ کے مطلع فکر پر عشق، روشنی کا اصلی اور بڑا ذریعہ ہے وہ ہر طرح، ہر کہیں اس کا تذکرہ کرتے ہیں ایسا لگتا ہے کہ عشق کا بیان ہی جیسے ان کا مقصد اولیٰ ہو، یہی ان کے پیام کی کلید ہو، ان کا کلام، ان کا فلسفہ، ان کا پیام اونچی نیچی سطح والی زمین ہے، اس میں پہاڑ اور پہاڑیاں ہیں، میدان ہیں مرغزار ہیں، ٹھنڈے میٹھے چشمے ہیں، لاوہ اگلتے آتش فشاں ہیں، سمندر ہیں، صحرا ہیں، پھول ہیں رنگ ہیں خوشبو ہے، ان باغوں میں بادصبا اور بادشمیم کے جھونکے ہیں، ان سب کیلئے عشق آفتاب عالمتاب ہے جو ان سب جگہوں کو روشن رکھتا ہے اور زمین، اقبال کی کوئی جگہ اس روشنی سے محروم نہیں رہتی، سورج جو کائنات کی تمام اشیاء کی بالیدگی اور ان نشوونما کیلئے مامور ہے وہی کردار 'کلام اقبال' میں 'تصور عشق' ادا کرتا ہے علامہ

فرماتے ہیں:

عشق باغوں کو بہار دیتا ہے، عشق جنگلوں کو ستاروں کی مانند پیچ در پیچ کلیاں اور سفید غنچے عطا کرتا ہے۔ عشق کے سورج کی ایک کرن سمندر کی گہرائی کو چیر سکتی ہے عشق سمندر میں موجود مچھلی کو سمندر کی گہری تہوں میں راستہ دیکھنے والی آنکھ بخشتا ہے۔ گویا کائنات میں ہر جگہ عشق ہی کی جلوہ گری ہے۔

عشق عقابوں کا مول گھٹا دیتا ہے۔ اگر ان کے شکار پرندوں یا جانوروں میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے تو وہ عقابوں کو بھی خاطر میں لاتے۔ عشق کا اپنا معیار ہے وہ بعض اوقات چکوروں کو بازوں پر فوقیت دے دیتا ہے عشق کسی کی حیثیت کو خاطر میں لاتا۔ ہمارا دل اپنی بہت حفاظت کرتا ہے۔ لیکن عشق اسی کی گھات سے نکل کر جست لگاتا ہے۔

عشق ایک فطری جذبہ ہے جو ہر انسان میں کارفرما ہے۔ ہمیں دنیا میں جو رنگ دکھائی دیتا ہے جس چیز میں دکھائی دیتا ہے وہ عشق کی بدولت ہے۔ گل لالہ کی پنکھڑیوں میں عشق کی رنگ آمیزی ہے ہماری جانوں میں جو طوفان اٹھتے ہیں جو تحریک ہوتی ہے یہ جو ہمارا جی کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ ھل من مزید کا نعرہ لگاتا ہے۔ اس نے کسی اور جہان کے مزے اٹھائے ہوئے ہیں اور اسے اس جہان کا کوئی مزہ ،مزہ لگتا ہی نہیں یہ سب عشق کی بلا انگیزی ہے۔ اگر تو زمین کا سینہ چیرے تو اس کے اندر سبزہ اگانے، موسم بدلنے پر ہئیت بدلنے کی صلاحیت طوفان اٹھانے کی اہلیت یہ سب عشق ہی کی کارستانی ہے۔ گویا ہر کہیں عشق ہی کی حکومت ہے۔ (۵)

نہ ہر کس از محبت مایہ داراست
نہ با ہر کس محبت سازگار است
بروید لالہ با داغ جگر تاب
دل لعل بدخشاں بے شرار است

یعنی یہ محبت، یہ عشق ہر کسی کی سمجھ میں آتا نہ یہ ہر کسی کو ودیعت ہوتا ہے، نہ ہر دل اس

دولت کو پاس رکھنے کا ظرف رکھتا ہے، محبت ہر کسی کو سازگار بھی نہیں ہوتی۔ ہر کسی کو موافق بھی نہیں آتی۔ گل لالہ (جیسا نازک پھول) جگر چمکانے والا داغ ساتھ لئے کھلتا ہے۔ مگر لعل بدخشاں (جیسے سخت اور چمکدار قیمتی پتھر) میں کوئی چنگاری نہیں۔ کوئی حرارت نہیں۔

گراں بہا ہے تو حفظ خودی سے ہے ورنہ
گہر میں آب گہر کے سوا کچھ اور نہیں

==========

حوالہ جات:

۱۔ دیباچہ مثنوی اسرار خودی طبع اول از علامہ اقبالؒ
۲۔ القرآن سورۃ والشّمس
۳۔ علامہ اقبال کلیات فارسی خطاب بہ اقوام سرحد
۴۔ علامہ اقبال کلیات اقبال فارسی مثنوی اسرار خودی
۵۔ پیام مشرق ۔ لالۂ طور ۶ (علامہ اقبال)

عشق دلِ مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم

جلوۂ بے پردۂ او وا نمود
جوہرِ پنہاں کہ بود اندر وجود
روح را جز عشقِ او آرام نیست
عشق او روزیست کو را شام نیست

(وجود کا چھپا ہوا جوہر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے آشکار (ظاہر) ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق کے بغیر روح کو چین نہیں کیونکہ آپ کا عشق ہی وہ روشن دن ہے جس میں اجالا ہی اجالا ہے۔ دن ہی دن ہے اور جس کی کبھی شام نہیں ہے۔)

''علامہ اقبال ۔ پیام مشرق ۔۔۔ پیشکش''

عقل ہے تیری سپر، عشق ہے شمشیر تری
میرے درویش خلافت ہے جہاں گیر تری
ماسوااللہ کیلئے آگ ہے تکبیر تری
تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری
کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

علامہ اقبال: بانگ درا؛ جواب شکوہ

اقبال کا تصور عشق۔۔۔۔۔

عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کا اللہ کی ذات سے تعلق اور حسن ازل یعنی ذات باری۔ اور ان دونوں کے درمیان کے فاصلے کو ماپنے والا بیرومیٹر ''عشق''۔ یہ عشق ہی ہے جو انسان اور خدائے لم یزل کے درمیان کے فاصلے کو ظاہر کرنے میں مددگار بھی ہے اور درمیانی فاصلہ کم کرنے اور مخلوق و خالق کی دوئی کو ختم کرنے کی جدوجہد کا نام ہے۔ عشق کے ذریعے ذات باری کا قرب حاصل کرنے والے کو کبھی وہ پروانہ اور کبھی کرمک شب تاب کا نام دیتے ہیں۔

علامہ کے نزدیک ''عشق حقیقی'' اللہ تک پہنچ کر ہی قیام کرتا ہے۔ عشق ایک پیمانہ ہے جو اس درمیان کے فاصلے کی کمی بیشی کو ظاہر کرتا ہے۔ عشق کم ہے تو فاصلہ زیادہ ہوگا اور اگر عشق زیادہ ہے تو فاصلہ کم ہے مزید اگر عشق عروج پر ہے تو فاصلہ نہ ہونے کے برابر۔ اس سے آگے کا مقام ''قاب قوسین او ادنیٰ'' (کمان کے دونوں سروں کا درمیانی فاصلہ یا اس سے کم) ہے۔ اور مدارج عشق میں یہ آخری درجہ ہے اور اس درجے کا کوئی نام نہیں۔ کیونکہ اس مقام پر کائنات میں، کسی مخلوق کا کوئی فرد سوائے آقائے نامدار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پہنچا ہی نہیں اور نہ کوئی پہنچ سکتا ہے۔ نہ کسی کو اس مقام کے بارے میں کچھ علم ہے۔ بس اُتنا ہی معلوم ہے کہ جو انسان کی ذہنی استعداد کے پیش نظر بتایا گیا۔

حضرت علامہ عشق کو اور وہ بھی ''عشق مصطفےٰ'' کو محض ایک جذبہ نہیں بلکہ ایک متحرک جذبہ اور عمل کیلئے ایک آفاقی والہامی قوت سمجھتے ہیں۔ عمل کا انحصار اخلاص پر ہے اور وہ یہ ہے کہ عمل کو مالک کی مرضی کے مطابق، مالک کی منشا کے مطابق اس طرح کرنا کہ مالک بھی

راضی ہو اور عمل کرنے والا بھی مالک سے، اس کے حکم سے، انتہائی محبت کے ساتھ عمل کر گذرے۔ یہی عمل عمل صالح کہا جائے گا اور ایسی ہی صورت حال میں اللہ کی جانب سے ارشاد ہوتا ہے کہ یہی ''خیرالبریہ ہیں جن کا اجر '' جزاء ھم عند ربّھم جنّٰتُ عدنٍ تجری من تحتھا لانھار خٰلدین فیھا ابداً رضی اللّٰہ عنھم و رضو عنہ . ذٰلک لمن خشی ربّہ O القرآن. سورہ البلد پارہ ۳۰ ترجمہ: ان لوگوں (عشاق) کی جزاء یہ ہے کہ انہیں خوبصورت باغوں میں رکھا جائے گا جن کے نیچے (دودھ اور شہد کی) نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوگا اور یہ اللہ سے راضی ہوں گے یہ اجر اس کے لئے ہوگا جو اپنے رب کی خشیت میں ہوگا۔

عشاق کو ان کے عشق الٰہی کی جزا میں جو جنتیں دی جائیں گی ان جنتوں میں انہیں جو سب سے بڑا انعام دیا جائے گا وہ یہ کہ انہیں دیدار الٰہی نصیب ہوگا اور یہی دنیا میں ان کا مطمعٔ نظر اور ان کی منزل رہی تھی۔ جو تمام عشاق کیلئے عشق کا آخری درجہ ہے۔

علامہ دل کے ترجمان ہیں اور دل محبت یا عشق کی آماجگاہ ہے۔ جس کے بارے میں حضرت ذوقی شاہ تحریر فرماتے ہیں ''انسان سب سے اعلیٰ وارفع مخلوق ہے بعد از خدا بزرگ توئی انسان کامل ہی کی شان ہے۔ اس لئے محبت کا انتہائی سرمایہ یعنی عشق بھی انسان ہی کے حصے میں آیا کوئی انسان اس حکمرانی سے آزاد نہیں۔ کوئی شخص نہیں جسے یہ بیش بہا جوہر عنایت نہ ہوا ہو، وہ اس کا صحیح استعمال کرے خواہ غلط۔''

علامہ بصارت کی نہیں بصیرت کی جستجو کرتے ہیں۔ محض رنگ کی نہیں خوشبو کے بھی طالب ہیں۔ صرف نام کے ہی نہیں عمل کے بھی خواہاں ہیں۔ اور عملِ محض کے نہیں پورے شعور کے ساتھ محبت کے جذبے کے ساتھ عمل کے خواہاں ہیں۔ ان کا قول ہے ''اصل سنت جز محبت ہیچ، نیست''

پروفیسر ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ''عروج اقبال'' علامہ اقبال کے 'عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا جمالی پہلو' میں رقم طراز ہیں

''جمالی پہلو سے زلف وگیسو اور لب ورخسار کی تعریف ہرگز مراد نہیں۔ بلکہ وہ نعتیہ کلام جس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن سیرت اور رحمت وشفقت کا بیان ہے۔ نظریاتی سطح کے ساتھ جمالی سطح بھی، ابتدا ہی سے اقبال کے کلام میں موجود ہے۔ بغور دیکھا جائے تو طالب علمی کے ابتدائی زمانے ہی سے اقبال کے شعور میں یہ دونوں لہریں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ لڑکپن میں جہاں ابن عربی کی تعلیمات اور ''فصوص الحکم'' کے درس کی صدائیں ان کے کان میں پڑنے لگی تھیں۔ وہاں (جیسا کہ مثنوی رموز بیخودی میں بیان کردہ واقعے سے ظاہر ہوتا ہے) باپ کی دردمندانہ تلقین سے دین کی حقیقت اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق عظیم کا ایک گہرا نقش بھی اقبال کے قلب وذہن پر ثبت ہو چکا تھا، اور ان پر یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ اس رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان خلق محمدی رنگ میں اپنے آپ کو رنگ لے'': (!)

غنچہ ای از شاخسار مصطفیٰؐ
گل شو از باد بہار مصطفیٰؐ
از بہارش رنگ و بو باید گرفت
بہرۂ از خلقِ او باید گرفت
فطرت مسلم سراپا شفقت است
در جہاں دست وزبانش رحمت است

'تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شاخ کا ایک غنچہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی نسیم بہار سے شگفتہ ہو پھول بن جا۔ تجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی نسیم بہار سے رنگ و بو حاصل کرنی چاہیئے یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے خلق عظیم سے حصہ لینا لازم ہے۔ مسلمان کی فطرت سر سے پاؤں تک۔ سراسر۔ شفقت ہے۔ اس دنیا میں ان کا ہاتھ اور زبان رحمت کا پیغام ہے:

اس کے آخری شعر میں اللہ کے اس فرمان کی تشریح ملتی ہے جس میں نبی پاک صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم سے ارشاد خداوندی ہوا ''**فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا انْفَضُّوْ مِنْ حَوْلِكَ** ...(۲)

ترجمہ: اے نبیؐ اللہ کی آپ پر بے پایاں رحمت ہے کہ اس نے آپ کو نرم خو بنایا ہے۔ اگر آپ غصہ ور یا ترش رو ہوتے تو یہ آپ کے پاس بھی نہ پھٹکتے (قریب سے چھٹ جاتے)۔ سو یہ آپؐ کی رحمت اور نرم روی ہی اثر تھا کہ جو آپ کے قریب آتا وہ ہمیشہ آپ کا ہو جاتا۔

ڈاکٹر افتخار صدیقی مزید رقمطراز ہیں ''حقیقت یہ ہے کہ اقبال اپنی زندگی کے آئندہ ادوار میں بھی، جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیغمبرانہ اور بشری عظمت کی کامل معرفت حاصل کر چکے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا یہ جمالی پہلو ان کے لئے سب سے زیادہ جذب وکشش کا باعث رہا اور اکثر اسی پہلو سے متعلق احادیث اور روایات اقبال کیلئے سب سے زیادہ رقّت آور ثابت ہوتی تھیں۔ انہوں نے اپنی مثنوی ''رموز بیخودی'' میں سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روح ایک مصرع میں یوں سمودی ہے کہ: ''اصلِ سنت جز محبت ہیچ، نیست'' یعنی سنت کی بنیاد دراصل رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت ہی ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں، محبت کے بغیر ہر دعوئے اتباع واطاعت باطل ہے۔

علامہ کا فلسفہ حرکت دراصل عشق ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ ایمان ایک سا نہیں رہتا یہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ مثبت عمل، عشق میں ترقی کا باعث اور منفی عمل یا کسی جدوجہد میں سکتہ تنزل کا سبب بن جاتا ہے۔ علامہ کے نزدیک ٹھہرا ہوا پانی خواہ کتنی میں مقدار میں کیوں نہ ہو ناقابل استعمال اور بے فائدہ ہے اس کے مقابلے میں چلتا پانی خواہ وہ تھوڑی مقدار میں ہو پاک اور فیض رساں ہے۔

ہر لمحہ نیا طور نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

دنیا اور دنیا کے اندر مقرر کی جانے والی ہر منزل فنا سے پاک نہیں ہے۔ لیکن عشق ایسی ہستی کو اپنی منزل قرار دیتا ہے جو ازل کی مالک، ابد کی مختار ہے۔ کسی کوئی حد ہے نہ حساب،

عشق حسن ازل کا پجاری ہے جو زوال نا آشنا ہے یہ وہ نغمہ ہے جو فصل گل ولالہ کا پابند نہیں۔

یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ

انسان، جسے اللہ کی نیابت کرنا تھی ہبوط آدم کے نتیجے میں اپنی اصل سے بچھڑا ہوا ہے۔ بارش کے قطرے کی طرح جو سمندر سے بچھڑتا ہے اور زمین پر گرنے کے بعد واپس سمندر تک پہنچنے کیلئے مختلف شکلوں میں جدوجہد کرتا ہے۔ تب تک وہ جدائی کے عالم میں رہتا ہے اور ہر جگہ بے قرار رہتا ہے۔ سکون اور خموشی سے دور۔ اس طرح انسان بھی ایک فراق کے عالم میں ہے اور وہیں اپنی اصل کی جانب واپس جانے کی لگن بھی اس کے دل میں موجود ہے۔ اس لئے جدائی کی تڑپ اسے ہر لمحہ بے قرار رکھتی ہے، اسے دنیا میں کہیں قرار نہیں، کہیں سکون نہیں۔ ہر وہ مقام جہاں اسے اپنے مطلوب کی خوشبو محسوس ہوتی ہے اس کا دل اس کی جانب کھنچتا چلا جاتا ہے۔ کعبۃ اللہ، روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، دین اسلام، **لا الٰـــہ الا اللّٰـــہ**... یہ سب اسے اس کے مطلوب کی یاد دلاتے ہیں، یہ سب انسان کو اس کی اصل کی جانب مائل کرنے اور اس کے مطلوب سے وصل کے اسباب ہیں۔ جنت میں جنتیوں کو سب سے بڑا انعام جو ملے گا وہ اللہ بزرگ و برتر کی زیارت ہوگا۔ یہی وصل ہر جنتی کی اصلی منزل ہے۔ یہاں سے وہاں تک کا فاصلہ، مطلوب کی حیثیت، اس کی بڑائی، عظمت کبریائی اور اپنی کم مائیگی کا موازنہ کرتے ہوئے تو صل الی اللہ کا تصور ہی مومن کا مقصد حیات ہے۔ اور یہی عشق ہے۔ ورنہ عبادت کی تو اللہ کو کوئی ضرورت ہی نہیں، **فتعال اللہ الملک الحق** ۔۔۔القرآن۔ (اللہ۔ تمہارے۔ ہر تصور بڑائی سے بڑا ہے وہی اصلی پادشاہ ہے۔) عبادت کیلئے تو فرشتوں نے بھی اللہ کے سامنے ''**نحن نسبح بحمدک و نقدس لک**'۔ القرآن' کا اعلان کیا تھا تب کائنات کے خالق نے اس سربستہ راز یعنی تخلیق آدم کی وجہ کو راز ہی رہنے دیا اور ارشاد فرمادیا **انی اعلم بما لا تعلمون** (جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے). اک فرشتوں پر ہی کیا موقوف، کائنات کا ذرہ ذرہ دن رات تسبیح و تحلیل میں مصروف

ہے۔اب مسئلہ خالق اور مخلوق کا ہے، عبد اور معبود کا ہے، طالب اور مطلوب کا ہے۔مسئلہ مالک اور اس کے نائب کا ہے اس کا ایک ہی ذریعہ ہے۔حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستیٔ پاک کی ہدایات (سنن) کی پیروی اور ان کے اسوہ پر عمل۔کیونکہ وہی حقیقی راستے سے واقف ہیں (جو صراط مستقیم ہے اور وہ راستہ جو سیدھا خدا کی ذات تک جاتا ہے)۔محبّ کی ذمہ داری محبت کو جان و دل میں اتارنا اور حب الٰہی کے ان تقاضوں کو پورا کرنا ہے جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر ہر محبّ کو بتائے۔اللہ سے قرب اتنا ممکن ہے جتنی محبت میں شدت ہو گی۔محبت کی یہی شدت عشق کہلاتی ہے۔

چونکہ اللہ کی ذات انسان کے حس ادراک سے باہر ہے اور ہر اس مومن کو جو اللہ کے قرب کا طالب ہو، اس کا واحد ذریعہ تعلیمات نبوی کا حسن اتباع اور عشق رسولؐ ہے علامہ کے نزدیک اللہ کے قرب کو حاصل کرنے کا واحد ذریعہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ہیں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کا راستہ اصل راستہ ہے علامہؒ کی سوچ اپنے بہت سارے پیشروؤں (مسلم و غیر مسلم فلسفیوں) سے جدا ہے دنیا کے تمام سوچنے والے دماغ اس ادھیڑ بن میں مصروف رہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معراج جسمانی ہوئی یا روحانی۔لیکن علامہ ہر اس achievement کو جو نبی پاک صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حاصل کی یا انہیں بہ فیض باری تعالیٰ حاصل ہوئی ہر امتی کے لئے نشان منزل قرار دیتے ہیں۔اور اسی راہ پر چلنے کی دعوت دیتے ہیں۔

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفٰے سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں
عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمیں و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

معراج مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے پہلے شائد ہی کسی نے اس نظر سے دیکھا ہو۔بس یہی اور اسی طرح ان کی تمام شاعری میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کی

منفرد کہکشاں، محبت کے بے شمار رنگوں کی، سب سے علیحدہ دکھنے والی قوس وقزح اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اسوۂ مبارک پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب جا بجا دکھائی دیتی ہے۔ حضرت علامہ صرف نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اوصاف، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ و سلم کے اسوۂ پاک کا بیان، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و کردار کا تذکرہ ہی نہیں کرتے۔ بلکہ تمام مسلمانوں کو اسوۂ حسنہ پر عمل کرنی کی دعوت بھی دیتے دکھائی دیتے ہیں، جس کا فقدان اسلامی معاشرے میں پایا جاتا ہے۔

علامہ اقبال کا دکھ، ان کا کرب اور کڑھن وہی تھی جس کا اظہار انہوں نے ''نوجواں مسلم سے خطاب'' میں کیا۔

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا! تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

علامہ اقبال مسلم امہ کے تابناک ماضی کو یاد ضرور دلاتے ہیں تاکہ نوجواں نسل میں آگے بڑھنے کی امنگ پیدا ہو سکے۔ وہ محض ''پدرم سلطان بود''، کا نعرہ نہیں لگاتے نہ وہ ناسٹیلجیا (ماضی پرستی) کا شکار ہیں۔ وہ تو ماضی کو اس لئے یاد دلاتے ہیں تاکہ ہمارے آگے بڑھنے کی کوئی سبیل ہو سکے امید کا کوئی تارہ طلوع ہو سکے۔ علامہ کو احساس ہے کہ غلامی پر رضامند ہونے والی قوم میں آزادی کی جوت جگانا کوئی آسان کام نہیں۔ اس کیلئے وہ قرآنی اسلوب کے تتبع میں ماضی کی داستانیں سناتے ہیں تاکہ ان سے سبق حاصل کیا جائے اور ترقی کے سفر میں ان اسباب کو اختیار کیا جا سکے جن کو اختیار کر کے ہمارے اسلاف نے زمانے پر حکومت کی۔ اور علوم جدیدہ، (سائنسی علوم مثلاً طبیعیات، کیمیا، علم الابدان، فلکیات، علم ہیئت، علم جراحت، فلسفہ وغیرہ) میں ترقی کی منازل طے کیں۔ وہی علوم جن کو اختیار کرنے سے آج کی ترقی یافتہ قومیں ترقی یافتہ کہلاتی ہیں۔

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

علامہ اقبالؒ آج کے مسلمان کی ذہنی پراگندگی۔انتشار فکر، یقین وایمان کی زبوں حالی اورعمل سے دوری سے پریشان تھےاسی لئے وہ بار باروالیٔ امت،سیدالانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہٖ و سلم کی خدمت میں امت خوابیدہ کا مقدمہ پیش کرتے ہیں اور ادھر اپنے مؤکل یعنی ملت اسلامیہ کوبھی گہری نیند سے جگانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔علامہ اس کا صرف ایک حل بتاتے ہیں کہ اس خاکستر میں سوئی ہوئی چنگاری کو ہوا دینے کیلئے جس جذبے کی ضرورت ہے وہ اپنے مقصد(دین) سے لگن اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بے پناہ محبت (عشق) ہے۔یہی عشق وہ امت کے ہر فرد میں پیدا کرنے یا بیدار کرنے کی سعی فرما رہے ہیں۔اسی لئے وہ مسلمان کوحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے محبت کا درس دیتے نظر آتے ہیں۔ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کا تذکرہ اور دور حاضر کے مسلم سے اس کے تقابل کا سبب بھی یہی ہے۔ہر مسلمان کے دل میں عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پیدا کرنے کا مطلب، ایمان باللہ،قوت عمل اور ہر مسلمان کے دل میں دوسرے مسلمان کیلئے بالخصوص اور تمام انسانوں کیلئے بالعموم ہمدردی خیر خواہی اور محبت کے جذبات کا بیدار کرنا ہے۔ان سب معاملات کیلئے مسلم کا خود سے تعارف اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بے پناہ عشق لازمی ہے۔اسی لئے عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علامہ اقبال کی رگ وپے میں سرایت کر چکا تھا۔

علامہ اقبال کے پیغام کا ایک ایک لفظ،خطبات وتقاریر یا خطوط کا آئینہ اس بات کا غماز ہے کہ وہ سرتاپا عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں ڈوبے ہوئے تھے۔لیلیٰ کے عشق میں ڈوبا ہوا قیس نہیں۔لیلیٰ کے دیوانے قیس کو تو لیلیٰ کے شہر کی دیواروں سے بھی پیار تھا کہ اس شہر میں لیلیٰ کے جسم سے ٹکرانے والی ہوائیں شہر کی دیواروں سے ٹکراتی ہیں سو وہ جب لیلیٰ کے شہر جاتا تو کبھی ایک دیوار کو چومتا کبھی دوسری دیوار کو۔عاشق کو محبوب کی ہر بات سے پیار ہوتا ہے۔محبوب کی ہر متعلق چیز سے انسیت ہوتی ہے اس سے اسے محبوب ہی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔محبوب کی گلیوں سے،اس کے شہر کی خاک سے،محبوب کے نقوش پا سے، کسی اور دنیاوی محبوب کی بجائے اقبال کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے عشق تھا انہیں حضور اکرم کی ہر

متعلقہ شے سے بے انداز محبت تھی ہر وہ شے جس کا نام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات، آپؐ کے اسم گرامی سے مس ہوئی ہر شے اقبال کو دوعالم سے زیادہ عزیز ہوگئی۔ سرزمین عرب، اس کی تہذیب سے، اس کے ادب سے، اس کی تشبیہات سے، استعارات و تراکیب سے، عربوں کے رہن سہن سے، ان کی معاشرت سے، ان کے معمولات سے، ان کے لہجے سے غرض ہر رویے سے علامہ کو عشق تھا۔ مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، گنبد بیضاء (علامہ اقبال کے وقت تک گنبد کا رنگ سفید تھا) روضہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حرم پاک، منبر رسولؐ، منبر کی چوب خشک، ہر چیز جو بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق ہوئی علامہ کی جان بن گئی۔

علامہ اقبال کی سیرت وسوانح نگاروں نے ان کے جو حالات قلم بند کئے ہیں ان سب میں علامہ کے عشق رسولؐ کے جذبے کا اظہار موجود ہے۔ مولانا عبدالسلام ندویؒ کی کتاب ''اقبال کامل''، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی ''فکر اقبال'' اور فقیر سید وحیدالدین کی ''روزگار فقیر'' میں 'اقبال اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم' کے عنوان کے تحت علامہ کی زندگی کے مختلف واقعات اور ان کے خیالات کے تذکرے ہمارے دعوے کا ثبوت ہیں۔ فقیر سید وحیدالدین رقمطراز ہیں۔

''ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم کی سیرت کا سب سے ممتاز، محبوب اور قابل قدر وصف 'جذبۂ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ ذات رسالت مآب کے ساتھ انہیں جو والہانہ عقیدت تھی اس کا اظہار ان کی چشم نمناک اور دیدۂ تر ہوتا تھا۔ کہ جہاں کسی نے حضور کا نام ان کے سامنے لیا ان پر جذبات کی شدت اور رقت طاری ہوگئی۔ اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام آتے ہی اور ان کا ذکر چھڑتے ہی اقبال بے قابو ہو جاتے تھے۔ کفار مکہ نے انسانیت کے اس محسن اعظم کو کس کس طرح ستایا اور کیسے کیسے ظلم وستم ڈھائے، طائف میں حضور کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا؟۔ غرض حضورؐ کی مظلومیت اور پریشان حالی کا کوئی واقعہ ڈاکٹر صاحب کے سامنے بیان کیا جاتا تو ان کے احباب نے بارہا دیکھا کہ

ڈاکٹر صاحب چیخیں مار مار کر رو رہے ہیں۔ اور نڈھال ہوئے جا رہے ہیں۔'' (۳)

عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ڈاکٹر اقبال کے رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا اور ان کے ذہن و فکر پر چھا گیا تھا۔ وہ کتنے بڑے فلسفی تھے؟ اور صاحبان علم جانتے ہیں کہ فلسفے کا سارا معاملہ عقل کے بل بوتے پر چلتا ہے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کو وہ عقل کی کسوٹی پر جانچنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ اس معاملے میں وہ ایمان بالغیب کے قائل تھے بس جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرما دیا وہ دین و ایمان اور سر آنکھوں پر۔ اس بارگاہ میں چون و چرا کی گنجائش ہی نہیں۔ ''سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا'' (ہم نے سنا اور اطاعت کی) اطاعت، فرماں برداری اور غلامی۔ یہی ایمان کی دلیل بلکہ بنیاد ہے۔ (۴)

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

''ملفوظات اقبال'' میں مرزا جلال الدین بیرسٹر لکھتے ہیں'' خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم کے مسدس (مسدس مدوجزر اسلام) کے تو وہ عاشق تھے۔ میرے پاس ریاست ٹونک کا ایک شائستہ مذاق ملازم تھا اسے ستار بجانے میں خاص دسترس تھی اور وہ مسدس حالی ستار پر ایک طرز کے ساتھ (ترنم کے ساتھ) سنایا کرتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب التزام کے ساتھ ہر دوسرے روز اس سے مسدس سننے کی خواہش کرتے۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف میں وہ بند جو'' وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا'' سے شروع ہوتے ہیں انہیں بطور خاص مرغوب تھے۔ ان کو سنتے ہی ان کا دل بھر آتا اور وہ اکثر بے اختیار رو پڑتے اس طرح اگر کوئی عمدہ نعت سنائی جاتی تو ان کی آنکھیں ضرور پرنم ہو جاتیں۔

حضرت علامہ کا یہ سوز و گداز عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ان کی سرشاری اور استغراق کمال کے درجے پر جا پہنچا۔ آخر میں تو یہ حال ہو گیا تھا کہ ذرا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک کسی کی زبان پر آیا اور علامہ کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ اسی طرح آپ کو فریضۂ حج اور روضۂ مبارک کی زیارت کی شدید آرزو تھی جو وقت کے ساتھ

ساتھ ترقی کرتی جاتی تھی آخر زمانے میں بیماریوں اور ضعف کی وجہ سے چلنا پھرنا مشکل ہو گیا تھا مگر اس وقت بھی یہی لگن تھی کہ شاید طاقت عود کر آئے اور مجھے یہ مقدس سفر نصیب ہو جائے۔''

پروفیسر سید عبدالرشید فاضل لکھتے ہیں:

''مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں'' میں ۷۔اپریل (۳۸۔۱۹۳۷) کی شام کو حاضر ہوا تو ایک حضرت مرحوم کے پاس بیٹھے تھے میرے پہنچنے پر ان صاحب نے حضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ ابھی تو آپ کو حجاز جانا ہے۔حضرت فرمانے لگے کہ سہارن پور سے ایک صاحب نے لکھا ہے کہ میں نے حرم پاک کا طواف کرتے ہوئے بارگاہ ایزدی میں دعا کی تھی کہ آپ کو بھی حرم پہنچنا نصیب ہو۔مجھے یقین ہے کہ یہ دعا قبول ہوگئی ہے۔پھر فرمانے لگے اب بظاہر حجاز پہنچنے کی کوئی صورت نہیں۔لیکن دیکھئے خدا کو کیا منظور ہے''

میر غلام بھیک نیرنگ تحریر کرتے ہیں:

'۱۹۳۷ء کے موسم سرما میں ایک روز جاوید منزل میں ان سے ملاقات ہوئی دیر تک صحبت رہی وہ اس وقت بہت کمزور تھے سفر مدینہ کا بھی ذکر رہا، کہنے لگے کہ جس قدر تھوڑی طاقت مجھ میں رہ گئی ہے میں اس کو مدینہ کے سفر کیلئے بچا بچا کر رکھ رہا ہوں افسوس کہ ان کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی اور وہ دنیا سے رخصت ہو گئے''

''اقبال کا قلبی تعلق حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات قدسی صفات سے اس قدر نازک تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر آتے ہی ان کی حالت دگرگوں ہو جاتی تھی، اگرچہ وہ فوراً ضبط کر لیتے تھے چونکہ میں بارہا ان کی یہ کیفیت دیکھ چکا تھا اس لئے میں نے ان کے سامنے تو نہیں کہا مگر خاص لوگوں سے بطور راز ضرور کہا کہ یہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مرقد پاک پر حاضر ہوں گے تو وہاں سے زندہ واپس نہیں آئیں گے، وہیں جاں بحق ہو جائیں گے میرا اندازہ یہی تھا، اللہ بہتر جانتا ہے۔ (۵)

اقبال کی شاعری کا خلاصہ، جوہر اور لب لباب عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اطاعت

رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کی صحبتوں میں عشق رسول صلی اللہ علیہ و سلم کے جو مناظر دیکھے ہیں ان کا لفظوں میں پوری طرح اظہار بہت مشکل ہے۔ وہ کیفیتیں بس محسوس کرنے کی تھیں۔ جب یہ مقدس ذکر چھڑ ہی گیا ہے تو جی چاہتا ہے کہ ایک واقعہ بیان کر ہی دوں۔ ایک دن سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے خاص انداز میں ایک واقعہ سنایا۔ فرمانے لگے۔ ایک معرکہ میں مسلمان سپہ سالار کا گھوڑا زخمی ہو گیا زخموں کی یہ حالت تھی کہ گھوڑے کا میدان کارزار میں کھڑا ہونا دشوار تھا۔ وہ بیٹھنا چاہتا تھا دوسری طرف کافر یلغار کرتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ اس عالم میں امیر العسا کر نے گھوڑے سے مخاطب کر کے کہا۔ اگر تم نے اس نازک وقت میں میرا ساتھ چھوڑ دیا تو اس جہان فانی سے رخصت ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تمہاری شکایت کروں گا۔ یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب زار و قطار رونے لگے اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اس واقعے سے سپہ سالار کے عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

قبیلہ بنی طے کے ساتھ جنگ کے بعد جب حاتم طائی کی بیٹی بطور جنگی قیدی پابہ زنجیر لائی گئی تو اس کیلئے پردے کا کوئی اہتمام نہ تھا اس بے ردا خاتون کو جس کی گردن حیا سے جھکی ہوئی تھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چادر مبارک اس کے سر پر ڈال دی۔ علامہ اس تلمیح کے حوالے سے ارشاد فرماتے ہیں ''ہم قبیلہ طے کی اس عورت سے زیادہ عریاں ہیں۔ ہم دنیا کی اقوام کے سامنے بے ردا ہیں۔ قیامت کے روز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہماری آبرو اور عزت ہیں، دنیا میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پردہ دار ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ و سلم شفیع المذنبین ہیں قیامت کے دن حضور اہل ایمان کی شفاعت فرمائیں گے تا کہ ان کی بخشش کا سامان ہو سکے یوں ہم گناہگاروں کی ساکھ رہ جائیگی۔ اور ہم ذلت اور رسوائی سے بچ جائیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مہربانی اور سختی دونوں مکمل طور پر ایک رحمت ہیں۔ وہ یعنی لطف و مہربانی دوستوں اور ساتھیوں (اپنوں، صحابہ کرامؓ) کیلئے اور یہ یعنی قہر اور سختی دشمنوں

کیلئے۔ وہ ذات والا صفات صلی اللہ علیہ وسلم کہ جس نے دشمنوں کیلئے رحمت وشفقت کا دروازہ کھول دیا اس نے مکے والوں کو'اذ ھبو و انتم الطلقاء لا تثریب علیکم الیوم ' کا مژدہ سنایا''۔ترجمہ: چلے جاؤ،تم سب آزاد ہو،آج سے تم پر کوئی الزام نہیں)۔ (٦)

کامل اتباع نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا طاعت رسولؐ عشق کے جذبے کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ محض اعلان کر دینے کا نام نہیں۔قدم قدم پر،ایک ایک حرکت،ایک ایک نفس۔دل کی گہرائیوں سے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی ہی سے یہ ممکن ہے۔ ورنہ زبانی اعلان اطاعت حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی خلافت کے ابتدائی عرصے میں مرتدین کا طوفان کیوں اٹھتا؟۔ عشق ایمان ہے،اور ایمان عشق۔نبی پاک سلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے پناہ محبت عشق رسول ہے اور یہی ایمان کی شرط اول ہے بلکہ اصل ایمان ہے۔اور یہی عشق ہے۔

اس عشق کی شراب سے کیا کیا سرور پیدا ہوتے ہیں؟ تقلید اور پیروی بھی عشق کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔یعنی ہو بہو محبوب کے نقوش قدم پر چلنا۔ بسطام کے مرد کامل حضرت بایزید بسطامیؒ تقلید میں بے مثال تھے۔کہ انہوں نے ساری زندگی خربوزہ کھانے سے اس لئے اجتناب کیا کہ انہیں معلوم نہیں تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خربوزہ کس طرح کاٹا؟ اور کس طرح کھایا؟ عاشقی تقلید یار ہی سے طاقت حاصل کرتی ہے تا کہ عاشق اپنے محبوب کا قرب حاصل کر سکے۔اس کے دل میں جگہ بنا سکے محبوب (اللہ) کے قرب کا اصل ذریعہ یہی ہے۔مثنوی 'اسرور موز' میں علامہ کا ارشاد ہے:

اے مسلمان تیرے دل میں بھی ایک محبوب پوشیدہ ہے اگر تو آنکھ رکھتا ہے تو آ میں تجھے دکھاتا ہوں کہ اس قوم کے پاس دل تو ہے (اور اس کا محبوب بھی ہے) لیکن وہ اپنے محبوب کو جانتا تک نہیں۔ایک قطعے میں علامہ مسلمانوں کی کمزوری ان کی زبوں حالی کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے) دوری کا نتیجہ بتاتے ہیں۔

شمی پیش خدا بگریستم زار
مسلماناں چرا زارند و خوارند

ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم
دلے دارند و محبوبے ندارند

(ایک رات میں خدا کے حضور بہت رویا کہ مسلمان کس وجہ سے ذلیل وخوار ہیں آواز آئی، تجھے علم نہیں کہ اس قوم کے پاس دل تو ہے لیکن ان کا کوئی محبوب نہیں)۔ (۷)

علامہ مزید فرماتے ہیں حضور کے عاشق، حسینوں سے بھی کہیں زیادہ حسیں، عمدہ، زیبا اور محبوب ہوتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیار کرنے والے زیادہ حسین اور خوبصورت ہوتے ہیں۔ دل حضور کے عشق سے قوی اور مضبوط ہوتا ہے۔ اور مرتبے میں ان کی خاک بھی ثریا کے ہم پلہ ہو جاتی ہے۔ نجد کی خاک حضور کے فیض سے حرکت پذیر ہوگئی اس خاک پر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی اور وہ آسمانوں پر جا پہنچی۔ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام مسلمان کے دل میں ہے ہماری عزت اور آبرو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام مبارک ہی سے ہے۔ کوہ طور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دولت خانے کے گرد ایک لہر ہے اور آپ صلی اللہ علیہ و سلم کا کاشانہ مبارک کعبے کیلئے بیت الحرم (عزت کا مقام) ہے۔ ابد حضور اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کے اوقات کے ایک پل سے بھی کم تر ہے ابد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک سے فیضان حاصل کرنے والا ہے۔ چٹائی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی راحت بھری نیند کی احسان مند ہے، کسریٰ کا تاج حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے پاؤں تلے ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غار حرا کے شبستان میں خلوت گزینی اختیار کی اور اس طرح ایک قوم ایک عظیم آئین کی مالک بنی اور ایک عظیم حکومت دنیا کو عطا ہوئی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک آنکھیں کئی کئی راتیں نیند سے محروم رہیں تب کہیں قوم دنیا کے تخت پر آرام سے سوئی۔ لڑائی کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار لوہے کو پگھلا دینے والی تھی جب کہ نماز میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھیں آنسوؤں سے پر رہتیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کافروں کے خلاف اللہ عزوجل اس ذات بزرگ و برتر سے طالب دعا ہوتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار ''آمین'' بن جاتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار نے بادشاہت کی

نسل کا سلسلہ کاٹ کر رکھ دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا میں نئے آئین اور نئے نظام کی بنیاد رکھی اور گذشتہ قوموں کی بساط کو الٹ دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی چابی سے دنیا کا دروازہ کھولا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جیسی شخصیت کسی ماں نے نہیں جنی۔

شاعر دربار رسولؐ حضرت حسان ابن ثابتؓ (انصاری) نے کہا:

وَ اَحسنُ منک لم تَرُقطُّ عینی
وَاَجْمَلُ مِنْکَ لَمْ تَلِد، النِسَآءُ
خُلِقْتَ مُبَرَّأً من کُلِّ عَیْبٍ
کانّکَّ قَدْ خُلِقْتَ کَمَا تَشَآءُ

ترجمہ :آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسا حسین کسی آنکھ نے دیکھا نہیں اور آپ جیسا جمیل کسی ماں نے جنا نہیں۔ آپ کو ہر عیب سے اس طرح پاک پیدا کیا گیا ہے گویا آپ کی تخلیق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی سے کی گئی ہو۔ (۸)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہ میں سب بلند و پست یکساں تھے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے غلام کے ساتھ ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھاتے تھے۔ ڈاکٹر طاہر فاروقی لکھتے ہیں:

''وہ عشق و مستی جو جس کو اقبال نے انسان کے ارتقا کیلئے لازمی گردانا ہے کیوں کر حاصل ہوتی ہے؟ صرف عشق رسول کے توسل اور اس کے صدقے میں کہ یہ سرشاری و سرمستی آفتاب مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار کی ایک کرن ہے یہ نصیب میں آ گئی تو تو سب کچھ مل گیا جب تک اس کا سوز انسان میں ہے اسی وقت تک اسے حقیقی زندگی میسر ہے، یہی قوت ہے جس سے یقین و ایمان میں پختگی آتی ہے اور ان کا تحفظ ہوتا ہے'' (۹)

علامہ کہتے ہیں : (۱۰)

مومناں زیر سپہر لاجورد
زندہ از عشق اند و نے از خواب و خورد

می ندانی عشق و مستی از کجاست؟
ایں شعاع آفتاب مصطفیٰؐ ست
زندۂ تا سوزِ او در جان تُست
ایں نگہ دارندۂ ایمانِ تست
مصطفیٰؐ بحر است و موج او بلند
خیز و ایں دریا بجوئے خویش بند
مدتے بر ساحلش پیچیدۂ
لطمہ ہائے موجِ اُو نادیدۂ
یک زماں خود را بہ دریا درفگن
تا روانِ رفتہ باز آید بہ تن

ترجمہ:

مومن اس کارزار حیات میں (نیلے آسمان کے نیچے) عشق سے زندہ ہیں محض سونے اور کھانے پینے اور دیگر لذات سے نہیں۔ تو نہیں جانتا؟ کہ یہ عشق و مستی کہاں سے حاصل ہوتی ہے؟ کس در کا فیض ہے؟ یہ عشق و مستی، ایمان و عمل کی یہ لگن، یہ جذبہ آفتاب مصطفیٰؐ کی ایک کرن ہے جب تک اس کا سوز تیری روح میں، تیرے دل میں موجزن رہے گا یہ تیرے ایمان و یقین کا نگہدار رہے گا۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰؐ ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہیں جس کی موجیں آسمان چھوتی ہیں تمہیں بھی چاہیئے کہ اس سمندر سے اپنی تشنگی کو بجھاؤ اس سے سیرابی حاصل کرو تا کہ تمہیں ایک نئی زندگی عطا ہو اور تمہیں از سرنو وہ جذبے عطا ہوں جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں میں تھے جن کی بدولت وہ دنیا میں ایک قابل فخر مقام کے مالک بنے۔ تو ایک مدت سے اس سمندر کے کنارے کنارے بے نتیجہ گھومتا رہا تو نے اس اس سمندر کی موجوں کے تھپیڑے کھائے ہی نہیں۔ کچھ دیر کیلئے تو اس دریا میں کود جا تا کہ تیری کھوئی ہوئی زندگی تجھے دوبارہ مل جائے۔

جب سے عالم انسانی میں اظہار عشق نبیؐ کیلئے نعت وجود میں آئی ہے یا جب سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پاک ہوئی ہے ہر سخن ور نے اس صنف میں طبع آزمائی کی۔ عربی ادب میں دور صحابہؓ سے پانچویں صدی ہجری کے بعد تک پھر فارسی ادب میں، ترکی ادب میں، اردو اور دیگر زبانوں میں شمع رسالت کے پروانوں نے عشق رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حوالے سے بے شمار رنگوں کی کہکشائیں تخلیق کی ہیں۔ ان سب میں انفرادی عشق ومحبت، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سراپا مبارک، آپ سے متعلق ہر ایک شے کو محبت کے اظہار کا ذریعہ گردانا لیکن علامہ اقبال کا انداز نعت بالکل جداگانہ ہے ان کے عشق کا اظہار سب سے الگ اور منفرد ہے اس اظہار عشق کو کیا نام دیا جا سکتا ہے؟ اس بات کا طے ہونا شاید ابھی باقی ہے علامہ کی مناجات اور دعا و توسل کا ایک انداز

اے تو ما بیچارگاں را سازو برگ
وار ہا ایں قوم را از ترس مرگ
سوختی لات ومنات کہنہ را
تازہ کردی کائنات کہنہ را

۔یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ ہم بیچارگان کا بہت بڑا سرمایہ ہیں، اس قوم کو موت کے خوف سے نجات دلوایئے۔

۔حضور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لات ومنات جیسے تمام بت (رسوم ورواج اور غلط روایات کے بت) جلا دیئے اور قوم کو نئی زندگی سے روشناس کیا خدائی صفات وتصورات والی اصلی کائنات کو زندہ کیا۔

در جہان ذکر و فکرِ انس و جاں
تو صلوٰۃ صبح، تو بانگ اذاں
لذت سوز و سرور از لا الٰہ
در شب اندیشہ نور از لا الٰہ

۔انسانوں اور جنوں کے جہان ذکر وفکر میں نئی زندگی کی سحر اور صبح نو کے نقیب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی ہیں۔

(آپ کا پیغام لا الـٰـہ الا اللـہ ہے اور) سوز وسرور کی لذت لا الٰہ سے ہے۔ ہر فکر ہر اندیشے کی رات کو بھی لا الٰہ کا نور ہی روشن کرتا ہے۔

ایں ہمہ از لطف بے پایان تست
فکر ما پروردۂ احسان تست
ذکرِ تو سرمایۂ ذوق و سرور
قوم را دارد بہ فقر اندر غیور

(یہ جو حقیقی مسلمان غیر اللہ کے آگے سجدے نہیں کرتے) یہ سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے بے حد لطف وکرم کے طفیل ہے ہماری فکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے احسان کی پروردہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر، ذوق وسرور کا سرمایہ ہے اسی سے قوم فقر میں غیّور رہے۔

اے مقام و منزل ہر راہرو
جذب تو اندر دل ہر راہرو
ساز ما بے صوت گر دید آنچناں
زخمہ بر رگہائے او آید گراں
در عجم گردیدم و ہم درعرب
مصطفیٰؐ نایاب و ارزاں بولہب

۔حضور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر مسافر (دنیا میں آکر آخرت کی تیاری کرنے والے) کیلئے مقام (سستانے کی جگہ، نشان منزل، پڑاؤ) بھی ہیں اور منزل بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر سالک کے دل میں حضور ہی کی محبت کا جذبہ ہے جو اسے منزل تک لے جانے کا ذریعہ ہے

۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارا ساز کچھ ایسا بے آواز ہو گیا ہے کہ اب تو مضراب بھی اس کے تاروں کو گراں گذرتا ہے ہ (ہم دین وایمان سے اتنے بیزار ہو گئے ہیں کہ دین کی ترغیب

بھی ہم پر گراں گذرتی ہے)

۔میں عجم میں بھی پھرا ہوں اور عرب میں بھی، ہر جگہ حضورؐ کے رنگ میں رنگے ہوئے لوگ (مسلمان) نایاب ہیں اور بولہب کے پیروکار زیادہ (عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا لفظی دم بھرنے والے اور عمل مصطفیٰؐ سے بیگانہ)۔

تو از آں قومے کہ جام او شکست
وا نما یک بندۂ اللہ مست
گرد تو گردد حریم کائنات
از تو خواہم یک نگاہ التفات

یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اس قوم میں سے جس کا جام ٹوٹ چکا ہے، کسی درویش خدامست کو ظاہر فرما دیجئے۔

حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) پوری کائنات آپ کے گرد گھوم رہی ہے۔میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک نگاہ التفات کی التجا کرتا ہوں۔

ذکر و فکر علم و عرفانم توئی
کشتی و دریا و طوفانم توئی
اے پنا ہ من حریم کوئے تو
من بہ امیدے رمیدم سوئے تو

میرا ذکر وفکر علم عرفاں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی ہیں۔میری کشتی، میرا سمندر اور میرا طوفان سبھی آپ ہیں۔

حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کا کوچہ میری پناہ گاہ ہے۔میں ایک امید پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دوڑا چلا آرہا ہوں۔

نغمۂ من در گلوئے من شکست
شعلۂ از سینہ ام بیروں نجست

در نفس سوز جگر باقی نماند
لطف قرآنِ سحر باقی نماند

۔میرا نغمہ تو میرے گلے میں ہی ٹوٹ گیا ہے میرے سینے سے ایک بھی شعلہ باہر نہیں لپکا
۔میری سانس میں سوز جگر باقی نہیں رہا۔صبح کے وقت تلاوت قرآن کا لطف بھی جاتا رہا۔

نالۂ کو می نہ گنجد در ضمیر
تا کجا در سینہ ام ماند اسیر
تیشہ ام را تیز تر گرداں کہ من
محنتے دارم فزوں از کوہ کن

۔وہ نالہ جو میرے ضمیر میں نہیں سما سکتا کب تک میرے سینے میں مقید رہے گا؟
۔میری کلہاڑی (تیشے) کو اور تیز کر دیجئے کیونکہ مجھے فرہاد سے بھی زیادہ محنت درپیش ہے

گرچہ کشتِ عمر من بے حاصل است
چیز کے دارم کہ نام او دل است
دارمش پوشیدہ از چشم جہاں
کر سم ِشبدیزِ تو دارد نشاں
بندہ را کو نخواہد ساز و برگ
زندگانی بے حضور خواجہ مرگ

اگرچہ میری زندگی کی کھیتی بے حاصل ہے تاہم میرے پاس ایک حقیر سی شے ہے جس کا نام دل ہے۔
میں نے اسے دنیا کی نظروں سے چھپا کر رکھا ہے کیونکہ اس دل پر حضورؐ کے مشکی گھوڑے کے سُم کا نشان ہے۔

ایسے غلام کیلئے جو مال و دولت کا خواہاں نہیں آقا کے قرب کے بغیر زندگی موت کے برابر ہے۔ (۱۱)

علامہ کی تمام شاعری پر نظر ڈالئے ان کی شاعری میں تشبیہات، استعارات، تلمیحات، علامات اور دیگر لوازمات شعری کے الگ الگ کناروں سے باہر امڈ آنے کو بے تاب دریا موجزن نظر آتے ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ تقریباً تمام دریاؤں کے سوتے، ان کے منبع مشترک ہیں، یعنی دین، نبی اکرم ﷺ دینی شعائر، وہ کسی کے اندر خوبی دیکھتے ہیں۔

علامہ اقبال تمام امت کے ہر فرد کے اندر جو خوبیاں دیکھنا چاہتے تھے یا پیدا کرنا چاہتے تھے۔ جن خوبیوں کے واسطے سے ہر مومن کے دل کے اندر محبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشنی پیدا ہوسکتی ہے۔ اور محبت رسولؐ، اللہ کی محبت کا زینہ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تھا جس کا تذکرہ پہلے گذر چکا ہے یعنی (قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ ، يُحْبِبْكُمُ اللّٰه ۔ یعنی اے نبیؐ ان سے کہہ دیجئے اگر تم اللہ کی محبت چاہتے ہو تو میری یعنی رسول کی اطاعت کرو اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا،)۔ اسی لئے وہ مومن کی شان بیان کرتے ہیں تا کہ عہد حاضر کے مسلمان ان خواص کو اپنے اندر پیدا کرنے کی جدوجہد کریں:

مومن کی سب سے پہلی اور اور اہم ترین صفت یہ ہے کہ اس کے دل میں قرآن پاک موجود ہے۔ اور یہ قرآن (الفاظ کے حفظ، اس کی تلاوت، اور اس کے اندر پوشیدہ معانی سمیت) موجود ہے۔ قرآن پاک ان کی رہنمائی کرتا ہے اور وہ اسی کے نور سے دیکھتے اور عمل کرتے ہیں۔ خود نبیؐ پاک نے ارشاد فرمایا کہ میں تمہارے اندر دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں ایک اللہ کی کتاب یعنی قرآن پاک اور دوسری چیز میری سنت۔ انہی دو چیزوں سے دل کا تعلق مومن کی صفت اولیٰ ہے۔ یہی دین ہے، یہی اتباع ہے اور یہی عشق ہے۔ قرآن پاک اور اتباع رسولؐ عشق کی دلیل ہے اور مومن کیلئے کافی ۔ علامہ ارشاد فرماہیں:

نور قرآں درمیان سینہ اش
جام جم شرمندہ از آئینہ اش

می رود روشن تر از دستِ کلیمؑ
زورقِ زرّین تو در جوئے سیم

ترجمہ: قرآنی علوم نے ان کے سینے میں روشنی کی ہے۔یعنی ان کا دل قرآن سے گہرے تعلق کے سبب زندہ وروشن ہے،ان کے منورقلب کے سامنے جام جمشید(جس میں وہ دنیا بھر کے حالات دیکھتا تھا) بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

(تیری سنہری کشتی دست کلیم سے کہیں زیادہ تابناکی کے ساتھ چاندی کی شفاف ندی میں تیر رہی ہے)

علامہ اقبال تمام مسلمانوں کو بالعموم اور مسلمانان برصغیر کو بالخصوص کہ یہ خطہ انگریزوں کی براہ راست غلامی میں تھا اور یہاں کے باسیوں نے غلامی کو دل سے قبول کرلیا تھا انہیں اس کیفیت سے نکالنا ایک مشکل کام تھا اس غلامی کے خلاف فکری جدوجہد کرنے والوں کا علم علامہ اقبال کے ہاتھ ہی میں تھا اسی لئے وہ ہند کے مسلمانوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں

باش مانند خلیلؑ اللہ مست
ہر کہن بتخانہ را باید شکست
در رضائے حق فنا شو چوں سلف
گوہر خود را بروں آر از صدف

ترجمہ: حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی طرح عشق الٰہی میں اللہ کی ذات کی جستجو میں مست رہ۔تیرے اس عمل سے تیرے ہاتھوں ہر پرانا بت خانہ ضرور زمیں بوس ہوگا۔

۔اپنے اسلاف (قرون اولیٰ کے مومنین) کی طرح رضائے حق کی طلب کر۔تیرے اندر سینے کے صدف میں چھپا موتی خود بخود باہر آجائے گا (تیری خودی بیدار ہوجائے گی)۔

مثال دینی ہو تو کہتے ہیں۔

ابتدائے عشق و مستی قاہری است
انتہائے عشق و مستی دلبری است

مرد مومن از کمالات وجود
او وجود و غیرِ اُو ہر شے نمود
گر بگیرد سو زوتاب از لاالٰہ
جز بکام ِاو نہ گردد مہر ماہ

ترجمہ: عشق الٰہی کی ابتدا میں طبیعت میں جلال ہوتا ہے۔ اور اس عشق کی انتہاء خاکساری اور عجز ہوتی ہے۔

مرد مومن کی ذات خلاق کائنات کے کمالات میں سے ایک کمال ہے۔ کائنات کے اسرار و رموز کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں تو ارشاد ہوتا ہے:

نکتہ می گویم از مردان حال
امّتاں را لا جلال ، ا لاّ جمال

میں صاحب حال بزرگوں سے متعلق ایک نکتہ بیان کرتا ہوں۔ قوموں کیلئے 'لا' جلال اور حرف 'الا' جمال کی حیثیت رکھتا ہے۔،

لا و اِلاّ احتساب کائنات
لا و الاّ فتح باب کائنات

حرف 'لا' سے کائنات کا احتساب ہوتا ہے اور حرف 'الاّ' سے کائنات کی برکتوں اور اس کے اسرار کے دروازے کھلتے ہیں۔

ہر دو تقدیر جہان کاف و نون
حرکت از لا زائد از الاّ سکوں

ان دونوں حروف سے (لا اور الا سے) اس جہان 'کُن' کی تقدیر بنتی ہے۔ 'لا' سے حرکت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور 'الاّ' سے (بعد از تخلیق) سکون آتا ہے۔

تا نہ رمز لا الٰہ آید بدست
بندِ غیر اللہ را نتواں شکست

جب تک لا الٰہ کا نکتہ اس کا بھید نہ ہاتھ آئے۔ غیر اللہ کے بند نہیں توڑے جا سکتے۔

در جہاں آغازِ کار از حرف لاست
ایں نخستیں منزل مرد خداست

دنیا کے کام کا آغاز ''لا'' سے ہے اور یہ مرد خدا کی پہلی منزل ہے علامہ اقبال کا سارا کلام عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے لبریز ہے بالواسطہ ہو بلا واسطہ۔ اس فلسفی کی فکر کا محور انسان کامل خیر البشر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستی ہے۔ جس شاعر کے تخیل کے سوتے محبت رسول سے پھوٹتے ہیں۔ جس کو خواب میں یا مستی کے عالم میں شعروں کا باغ دکھایا جاتا ہو اور یہ کہا جاتا ہو کہ جو پھول مرضی ہے اسے چن لو اس کا ہر لفظ، ہر ترکیب، ہر خیال، ہر مصرع عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے لبریز نہیں ہوگا تو کیا ہوگا؟ سو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فکر کہ تمام عالم کے تمام انسان اللہ کے ہو جائیں اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لیں اور ساری انسانیت ایمان یعنی یقین اور حسن عمل پر کھڑی ہو جائے سو اسی فکر کو ایک امتی اور صاحب شعور مسلمان کی حیثیت سے اقبال نے حرز جان بنا لیا اور **لا امت بعدی ،لا قوم بعدی** کا نعرہ لگایا اور اسی کام میں جٹ گئے کہ وہ لوگ جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کریں۔ فکر مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کو اوڑھ لیں کیونکہ انہی سے قدرت نے زمانے کی امامت کا کام لینا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کے حوالے سے ارشاد فرمایا کہ حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل ایک لاکھ سے زیادہ انبیاء کرام علیہم السلام دنیا میں تشریف لائے اور انہوں نے دین کو سن بلوغت تک پہنچانے میں بے شمار قربانیاں دیں۔

ان ساری قربانیوں کا مقصد نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ورود مسعود ہے، وہ ساری قربانیاں مہر نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کی تابنا کی اور نور میں اضافے کیلئے تھیں۔ علامہؒ کا ارشاد ہے کہ اس انائے مطلق (اللہ) نے سینکڑوں ابراہیم (لاکھوں نمرودوں کی چتاؤں کی آگ میں) میں جلا ڈالے تب کہیں جا کر ایک ''محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' کا چراغ روشن کیا۔ وہ

قوت یا انائے مطلق عمل کے مقصد کی خاطر کبھی عامل بن جاتی ہے۔کبھی معمول۔اور کبھی وجوہات اور کبھی علل کا روپ دھار لیتی ہے۔

شعلہ ہائے او صد ابراہیم سوخت
تا چراغ یک محمدؐ بر فروخت
می شود از بہر اغراض عمل
عامل و معمول و اسباب و علل

علامہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات میں سے ایک صفت ''رحمۃ اللعالمین'' کو منشائے تخلیق عالم قرار دیا۔وہ فرماتی ہیں کہ 'خلق، تقدیر اور ہدایت اس کائنات کے سفر کی ابتداء ہے جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمۃ اللعالمینی اس کائنات کی انتہاء یعنی بلندی ہے اور کائنات میں اس سے زیادہ بلندی کا تصور بھی محال ہے۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست
رحمۃ اللعالمینی انتہا ست

علامہ کی تقریباً تمام تشبیہات ، استعارات ، علامات، اور تلمیحات اسوۂ رسول ﷺ، تاریخ اسلام، اکابر امت مسلمہ جن میں اولیت صحابہؓ کو حاصل ہے کی طرف اشارہ کناں رہتی ہیں۔نصیحت آموز، سبق آموز، تا کہ آج کا مسلمان اپنے ماضی کو جان سکے اور اس سے سبق حاصل کرے۔اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم قابل تقلید ہے۔صحابہ نے جس وارفتگی سے تقلید کی مثالیں قائم کی ہی ہیں آج کا مسلمان بھی اسی روش پر آجائے۔ان کے ہاں صدیق اکبرؓ، عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ، حیدر کرارؓ، ابوذر غفاریؓ، سلمان فارسیؓ اور دیگر اصحاب کبارؓ کے مختلف کردار ہیں ان کی محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف حوالے ہیں۔یہ تمام حضراتؓ اپنے اپنے شعبے کے منتہی ہیں اور اپنے اپنے شعبے کے حوالے سے منارۂ نور ہیں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بشریت کی معراج، انسان کامل اور سرورِ انبیاء ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم) اور یہ صحابہ کرامؓ ایسے ہیں کہ ان کے کے کرداروں سے لگتا ہے کہ ہر صحابی کو ایک ایک کر کے، چن

چن کر نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت کیلئے منتخب کیا گیا ہے۔ نبیٔ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادمقدس کے مطابق ''**الصحابی کاالنجوم لِمَن اقتد یتم اھتدیتم** ' میرے صحابہ ستاروں کی طرح (ہدایت کے راستے کی طرف رہنمائی کرنے والے) ہیں ان میں سے جس کی پیروی کرو گے ہدایت پا جاؤ گے'' ہر صحابی ایک مکمل کائنات ہے لہذا مثال کیلئے، تشبیہہ کیلئے، استعارے کیلئے تلمیح کیلئے ان سے زیادہ کوئی اور کیا ہوگا؟ اسی لئے علامہ اٹھتے بیٹھتے، انہی کی مثالیں دیتے نظر آتے ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت اور آپ کے ساتھ نے صحابہ کے اندر ''عشق'' کی صفات پیدا کر دی تھیں ۔ کیفیت ہا خیز داز صہبائے عشق۔ حضرت عمر فاروقؓ کی مثال دیتے ہوئے تلمیحاً کہتے ہیں کہ تو حضرت عمر فاروقؓ کی طرح خود اونٹ سے اتر اور اپنا گرا ہوا کوڑا خود اپنے ہاتھ سے اٹھا۔ انہی کی طرح تو بھی اے مسلمان اپنا کام خود انجام دینے کی کوشش کر اور دوسروں کا احسان مند ہونے سے بچ۔

خود فرو آ از شتر مثل عمرؓ
الحذر از منت غیر الحذر

اسی مضمون کو ادا کرتے ہوئے کہتے ہیں تو اپنی مٹھی بھر خاک کو زیادہ پریشان مت کر، چاند کی طرح اپنی روزی اپنے پہلو کو کاٹ کر پیدا کر،، چاند بدر بننے کے بعد جو برابر گھٹتا ہے۔ گویا پہلو کاٹ کاٹ کر اپنا رزق مہیا کر رہا ہے، اگر چہ تیرے دن کتنی ہی تنگی ترشی میں کیوں نہ گذریں، تو بدحالی کا شکار ہو، اس طرح مصیبتوں کے سیلاب کے راستے میں تو نے اپنا سامان اسباب ڈال رکھا ہو پھر بھی تو اپنی روزی کسی دوسرے کے مال و دولت میں تلاش مت کر اور مشرق کے چشمے سے پانی کی موج کا طلب گار نہ ہو۔ تا کہ کل قیامت کے دن جو بڑا ہی جان توڑ اور عذاب کا دن ہوگا تجھے حضور اقدس، شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے، چاند کو سورج کے دستر خوان سے رزق پہنچتا ہے، سورج کے اس احسان کے بدلے اس (چاند) کے سینے پر داغ ہے۔ (حسن تعلیل) ہمت خدا سے مانگ اور آسمان

سے الجھ جا (تقدیر کو خود سنوار) ملتِ روشن یعنی ملت اسلامیہ کی آبرو خاک میں نہ ملا، جس ذات گرامی (حضور مکرم صلی اللہ علیہ وسلم) نے کعبے کے بتوں کو پاش پاش کیا۔ کعبے کو بتوں سے پاک کیا اس ہستی نے محنت مزدوری کرنے والے کو اللہ کا دوست کہا۔ (الکاسب حبیب اللّٰہ) اپنی تقدیر انسان خود بناتا ہے اپنی جدوجہد سے اپنے عمل پیہم سے، اسے سنوارتا ہے۔

اس آدمی پر افسوس ہے جو غیروں کے دسترخوان کا احسان مند ہے دوسروں کا احسان اٹھانے کے سبب اس کی گردن اس کے سامنے جھکی رہتی ہے۔ اس نے دوسروں کی مہربانی کی بجلی سے اپنے آپ کو جلا لیا، اس نے معمولی شے کے عوض اپنی غیرت کا سرمایہ بیچ ڈالا (کیا ہے تو نے متاع غرور کا سودا) اس کے برعکس وہ پیاسا بڑا ہی مبارک انسان ہے جو کڑکتی دھوپ میں خضرؑ سے پانی کا ایک پیالہ بھی لینے کو تیار نہیں ہے، وہ مبارک انسان سوال کرنے کی ذلت سے بچا اور شرمندگی سے اس کی پیشانی نہ بھیگی۔ وہ انسان کی صورت جیا اور مٹھی بھر خاک نہ بنا (انسانیت کو برقرار رکھا)۔ اس دنیا میں ایسا باوقار جوان اپنی گردن صنوبر کے درخت کی طرح اٹھا کر چلتا ہے۔ اگر وہ خالی ہاتھ ہو تو اور زیادہ خوددار بن جاتا ہے۔ وہ خود کہیں زیادہ بیدار ہو جاتا ہے۔ گدائی کے تھیلے کا سمندر گویا آگ کا طوفان ہے، ہاں اگر اپنے ہاتھوں کی کمائی سے شبنم (کی مقدار جتنا تھوڑی سی) بھی حاصل کر لی جائے تو خوب ہے یعنی گدائی سے کہیں زیادہ بہتر ہے، تُو مردانہ غیرت خود میں پیدا کر کے بلبلے کی طرح ہو جا، یعنی اس بلبلے کی طرح جو سمندر میں رہتے ہوئے بھی اپنا پیالہ اوندھا رکھتا ہے۔

یہ امت مسلمہ کے ہر فرد کے اندر کردار کی بلندی (جس میں غیرت ایک اہم عنصر ہے)، خود انحصاری پیدا کرنے، دوسروں پر تکیہ کرنے سے گریز، گدائی سے بچنے اور اس کو ایک معاشرتی برائی سمجھنے، ہر ممکن طور پر دست سوال دراز کرنے سے پرہیز کرنے کا درس ہے۔ جیسا کہ دور نبوت کا ایک واقعہ بہت مشہور ہے کہ ایک شخص گدا مانگتا مانگتا نبیٔ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آ پہنچا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایک کلہاڑی دلوائی اور خود اپنے دست

مبارک سے اس میں دستہ لگا کر ارشاد فرمایا اب تو جا اور جنگل سے لکڑیاں کاٹ اور انہیں بیچ کر اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پال۔ اس طرح سوال کرنے کی حوصلہ شکنی اور محنت کرنے کی ترغیب۔ علامہ اقبال اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی پہلو کو اجاگر کر رہے ہیں۔ علامہ کی تمام شاعری کا خلاصہ یہی ہے، یہی ان کا پیغام ہے،

نظم یا قصیدے کے شاعر منظر نگاری میں فطرت کے ظاہری حسن کے مناظر دکھاتے ہیں حتیٰ کہ حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ محسن کاکوروی، امیر مینائی، مومن خان مومن جیسے صاحب حال و عمل بزرگوں کے نعتیہ قصائد اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ تشبیب یا گریز سے پہلے آپ کو فطرت کی منظر کشی کا وہ منظر نہیں نظر آئے گا جو اقبال کے ہاں ہے۔ آپ اقبال کے منظر نامے کا مطالعہ کیجئے آپ اپنے آپ کو اسلامی عہد کے داستانی عہد میں محسوس کریں گے۔ ہر ترکیب، ہر منظر، ہر تشبیہہ، ہر مثال یا نظیر آپ کو قرون اولیٰ کی یاد دلائے گی۔ جب کبھی صراحتاً نعت کا مضمون آتا ہے ہر قاری عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تپش محسوس کرتا ہے۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، دل ہمکنے لگتا ہے، آنکھیں آنسو برسانے لگتی ہیں:

علامہ اقبالؒ نے غزوۂ تبوک میں چندے کی اپیل پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے جذبۂ ایثار اور محبت رسول کا واقعہ نظم کیا ہے۔ اس نظم کا ایک ایک حرف اتنا اثر انگیز ہے کہ پڑھنے والے کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں: (۱۲)۔

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کیلئے ہے خدا کا رسولؐ بس

اسی طرح کا ایک واقعہ ''جنگ یرموک کا ایک واقعہ'' کے عنوان سے منظوم کیا گیا ہے۔

صف بستہ تھے عرب کے جوانان تیغ بند
تھی منتظر حنا کی عروس زمین شام
اک نوجوان صورت سیماب مضطرب
آکر ہوا امیر عساکر سے ہم کلام

اے بو عبیدہؓ رخصت پیکار دے مجھے
لبریز ہوگیا مرے صبر و سکوں کا جام
بے تاب ہورہا ہوں فراق رسولؐ میں
اک دم کی زندگی بھی محبت میں ہے حرام
جاتا ہوں میں حضور رسالت مآبؐ میں
لے جاؤں گا خوشی سے اگر ہو کوئی پیام
یہ ذوق و شوق دیکھ کے پرنم ہوئی وہ آنکھ
جس کی نگاہ تھی صفتِ تیغ بے نیام
بولا امیر فوج کہ وہ نوجواں ہے تو
پیروں پہ تیرے عشق کا واجب ہے احترام
پوری کرے خدائے محمدؐ تری مراد
کتنا بلند تیری محبت کا ہے مقام
پہنچے جو بارگاہ رسول امیںؐ میں تو
کرنا یہ عرض میری طرف سے پس از سلام
ہم پرکرم کیا ہے خدائے غیور نے
پورے ہوئے جو وعدے کئے تھے حضورؐ نے

(۱۳)

شوق شہادت، جذبۂ جہاد سے زیادہ جو جذبہ آپ کو یہاں نظر آئے گا وہ ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر اعلیٰ درجے کا ایمان، شہید ہونے اور شہادت کے فوراً بعد حضور صلی اللہ علیہ و سلم سے ملاقات کی شدید خواہش، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے کئے گئے وعدوں پر غیر متزلزل یقین۔ مرنے کے بعد بطور شہید خود کے زندہ رہنے پر بے پناہ یقین، حضورؐ سے ملاقات کا جنون، شاید اسی کا نام عشق ہے۔ یقیناً یہی عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی انتہا ہے

اقبال حضورؐ کی سیرت طیبہ کے حوالے سے فرماتے ہیں:

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہمارے سامنے ہے۔ حضورؐ نے مکارم اخلاق کی جو تعلیم دی ہے اسے دنیا کے بہترین مفکرین اور مصلحین نے معیاری درس اور اعلیٰ نمونہ مانا اور سمجھا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ اس لئے ہمارے واسطے اور ناگزیر ہو جاتا ہے کہ آج مسلمانوں کی پستی اور نکبت کا بڑا سبب یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی تقلید تو درکنار ہم کو ان امور سے واقفیت تک نہیں ہوتی جن کی تعلیم و تبلیغ میں سرکار صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری زندگی صرف فرمادی رونے اور ماتم کرنے کا مقام ہے کہ ہم دوسرے فلسفیوں اور مفکروں کے اقوال کو لائحۂ زندگی بنانا چاہتے ہیں حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان تمام مسائل پر جن کیلئے ہم دوسروں کے سامنے کاسۂ گدائی پھیلاتے ہیں ہماری رہنمائی فرما گئے ہیں اور آپ کے اعمال و اقوال ہماری تمام دینی اور دنیوی مشکلات کا صحیح حل پیش کر کے ہماری مشکل کشائی کیلئے تیار ہیں۔ (۱۴)

یہی فکر اور کڑھن تھی جو اقبال کو دن رات بے چین رکھتی تھی۔ وہ مسلمان کے اندر وہ صفات دیکھنا چاہتے تھے جو اسلام ان سے تقاضا کرتا ہے، وہ عشق جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے، آپ کے اسوۂ حسنہ سے، آپؐ کے کردار و عمل سے جو تعلق مومن کا ہونا چاہیے تھا وہ نہیں تھا، علامہ کے تصور مرد مومن کا مقصد اولیٰ یہی تھا کہ دور حاضر کے مسلمانوں کو ان کے ماضی سے شناسا کیا جئے تا کہ وہ عمل کی راہ پر آسکیں جو دین و ایمان کی تکمیل کیلئے بہت ضروری ہے۔

اقبال محسوس کرتے تھے کہ ان کی طرح ہر مسلمان عہد حاضر میں مسلمانوں کی زبوں حالی پر متاسف ہے اسے مسلمانوں کی کی تباہ حالی پریشان کرتی ہے اور وہ اس کا حل بھی چاہتا ہے لیکن اس کا حل کیا ہے وہ نہیں جانتا۔ وہ روتا ہے لیکن نہیں جانتا کہ وہ روتا کیوں ہے؟ حالانکہ مسلم کسی پریشانی میں کبھی مضطرب نہیں ہوا۔ وہ گدائی میں بھی بہت غیور تھا کہ منعم اسے گدا دیتے وقت بھی گدا سے مرعوب رہا لیکن اب مسلم کو کیا ہو گیا کہ وہ اقتدار میں بھی مرعوب رہتا ہے یہ اسے معلوم نہیں کیا اس کے سینے سے دین و ایمان کا سوز مٹ گیا ہے؟ ایسی

صورت حال میں اقبال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے توجہ، اعانت، نگاہ کرم کی استدعا کرتے ہیں۔ (۱۵)

مسلماں آں فقیرے کجکلاہے
رمید از سینۂ او سوز آہے
دلش نالد ، چرا نالد؟ نداند
نگاہے یا رسول اللہ ؐ نگاہے

ترجمہ: مسلمان ایک غیور فقیر ہے، جسے اپنے فقر پر ندامت کی بجائے فخر ہے اس کے سینے (دل) میں آہوں کا سوز پنپتا ہے۔ (لیکن عہد حاضر میں) اس کا دل روتا ہے، کیوں روتا ہے؟ اسے اس کی کچھ خبر نہیں یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر اپنی نگاہ کرم ڈالئے، اس پر توجہ کیجئے اسے آپ کی محبت بھری توجہ کی اشد ضرورت ہے۔

اس قطعے میں ''فقیرِ کجکلاہ'' خود اقبال ہیں اور وہ یہ التجا کر رہے ہیں کہ میرے دل کی حرارت اور سوز تیرے غم کی تڑپ (عشق) کی وجہ سے ہے۔ میری شاعری یا سخنوری، پیغام میں اثر بھی آپ ؐ کے عشق کے دم ہی سے ہے میں رو رہا ہوں کیونکہ اس برصغیر میں، میں نے آپ ؐ کو پہچاننے والا، آپ ؐ کی ذات کو جاننے والا، آپ ؐ کے پیغام کو سمجھنے والا، آپ کی صحیح معنوں میں تقلید کرنے والا کوئی نہیں دیکھا۔ (۱۶)

تب و تاب دل از سوزم غمِ تست
نوائے من ز تاثیر دمِ تست
بنالم زاں کہ اندر کشور ہند
ندیدم بندۂ کو محرمِ تست

(برصغیر ہند کی حدود میں رہنے والے) غلاموں (مسلمانوں) کی رات کی صبح ہونے میں نہیں آ رہی۔ اس مٹی میں سورج (کی روشنی کے گذرنے کا) راستہ نہیں ہے ہماری جانب نظر کرم کیجئے کیونکہ مشرق میں ہم غلام مسلمانوں سے زیادہ دنیا کسی اور حصے میں بسنے والا کوئی

مسلمان بے بس نہیں ہے۔ (۱۷)

شب ہندی مسلماناں را سحر نیست
بایں خاک آفتابے را گذر نیست
بما کن گوشۂ چشمے کہ در شرق
مسلمانے زما بیچارہ تر نیست

دور حاضر کے مسلمان نے اپنے دل کو رنگ و بو کا قیدی بنالیا ہے۔اور اس کا دل ذوق و شوق اور خواہشات سے یک سر خالی ہو گیا ہے۔اس کے اندر آزادی اور بلند پروازی کی کوئی آرزو پیدا ہی نہیں ہوتی۔وہ شاہبازوں کی آواز کو نہیں پہچانتا کیونکہ اس نے اپنے کانوں کو مچھروں کی بھنبھناہٹ کا عادی کر لیا ہے۔(وہ دین سے مکمل کنارہ کشی اختیار کر چکا ہے جہاد کے جذبے سے خالی ہو چکا ہے۔عمل کی راہ سے دور جا چکا ہے۔وہ ہر دم دنیاوی لذات جیسے موسیقی وغیرہ کی دنیا میں مست رہتا ہے)(اگر علامہ آج کے عہد میں زندہ ہوتے تو ''پشہ خو'' کی بجائے walkman کی اصطلاح کا استعمال کرتے یہ علیحدہ بات ہے کہ واک مین سے بھی مچھر کی بھنبھناہٹ کی سی آواز ہی آتی ہے۔۔۱۷۔

دل خود را اسیر رنگ و بو کرد
تہی از ذوق و شوق و آرزو کرد
صفیر شاہبازاں کم شناسد
کہ گوشش باطنین پشہ خُو کرد

علامہ اس اخلاقی اور دینی انحطاط کی وجہ بتاتے ہوئے کہتے ہیں: اس (نوجوان مسلم) کے سامنے دل کا دروازہ نہیں کھلا ہوا، اس کی مٹھی بھر خاک میں خودی پیدا نہیں ہوئی۔یہ اپنی ذات کے جوہر سے ذرہ برابر آشنا نہیں ہوا۔اس کا ضمیر اللہ اکبر کی آواز سے خالی ہے۔اس کے ذکر کا کعبہ (حریمِ دل) اپنا وجود کمزور کر چکا ہے (یہ اپنی ثقافت کو بھلا کر کاسۂ گدائی ہاتھ میں لئے غیر کے آستانے کی طرف دیکھ رہا ہے) اس کا گریبان پھٹ چکا ہے اور اسے رفو

کرنے کی پرواہ کئے بغیر زندہ ہے (اسے اپنے نقصان کی ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں ہے وہ اپنے نقصان کو نقصان سمجھنے کیلئے تیار ہی نہیں) میں نہیں جانتا کہ وہ آرزوئے حیات، آزادی کی خواہش اور آزاد زندگی کی امید کے بغیر زندہ کیسے ہے؟ اس کی قسمت میں نامکمل موت لکھی ہے وہ مسلمان جو اللہ ہو کے بغیر زندگی گذار رہا ہے نہ وہ زندہ لوگوں میں شمار ہوتا ہے اور نہ مُردوں میں، وہ غیر اللہ کی غلامی میں دن رات بسر کر رہا ہے (اس کی سانسیں تو چل رہی ہیں لیکن اس میں زندگی کے آثار نہیں۔ مسلمان تو ہے لیکن نام کا مسلمان ہے)۔ یہ ساری گفتگو، ان ساری محرومیوں کا تذکرہ اس لئے ہو رہا ہے کہ ہندی مسلم کا دل بالخصوص اور امت مسلمہ کا بالعموم عشق کے جذبے سے تہی ہے وہ جذبہ جو مسلم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پائیدار تعلق کو جوڑتا ہے۔ اور جب یہ تعلق جڑ جائے تو عالم کائنات کی ہر شے، اس کی جان کے سمیت حب رسولؐ اور عشق الٰہی کے سامنے اپنی حیثیت کھو بیٹھتے ہیں۔ اب اس کے سامنے اللہ اور اس کا رسولؐ ہی سب کچھ ہیں۔ علامہ ارشاد فرما ہیں:

بروئے او در دل ناکشادہ
خودی اندر کف خاکش نہ زادہ
ضمیر او تہی از بانگ تکبیر
حریم ذکر او از پا فتادہ
گریباں چاک و بے فکر رفو زیست
نمی دانم چساں بے آرزو زیست
نصیب اوست مرگ ناتمامے
مسلمانے کہ بے 'اللہ ھو' زیست

عہد حاضر کے مسلمان کے دل کا دروازہ ذات الٰہی، حب رسولؐ اور خود اس کی ذات کے جوہر نمایاں کرنے کیلئے نہیں کھلا۔ اس کی مٹھی بھر مٹی میں خودی کا بیج ڈلا ہی نہیں (وہ نہال بن کر اس کی شخصیت سے پھوٹے گا کیسے؟) اس کا ضمیر اللہ اکبر کی صدا سے خالی ہے (اس نے

اللہ کی ذات کو اپنے دل کے اندر جگہ نہیں دی) اس کے ذکر کا حریم (دل) متحرک نہیں۔ (اول تو اس کا دل ذکر سے خالی ہے اور اگر وہ ذکر میں مشغول ہے بھی تو محض زبان سے)۔ غلامی نے اس کی سوچ کا گریباں جگہ جگہ سے تار تار کر دیا ہے لیکن اسے اس کے رفو کی کوئی خواہش ہیں (وہ غلامی پر رضامند ہو گیا ہے)۔ مجھے نہیں معلوم وہ بغیر کسی آرزو کے زندہ کیسے ہے؟

اس کی قسمت میں مرگ ناتمام لکھ دی گئی ہے وہ روزانہ، پل پل مرتا ہے۔ لیکن اسے مکمل موت نہیں آتی۔ یہ خود کو مسلمان کہلاتا ہے لیکن اس کا دل اللہ کے تصور، اس کے یقین اور اس پر ایمان کے بغیر ہے۔ (۱۸)

علامہ کے دل میں عشق رسولؐ کی شدت کا عالم یہ ہے کہ وہ حجاز جاتے ہوئے روضۂ رسول ﷺ پر حاضری کو اپنے لئے لازمی قرار دیتے ہیں کہ وہی ذات ان کی محبوب ہے۔ (۱۹)

بدن دا ماندو جانم درتگ و پوست
سوئے شہرے کہ بطحا دررہِ اوست
تو باش ایں جا و با خاصاں بیامیز
کہ من دارم ہوائے منزل اوست

(میرا جسم تھکا ہوا ہے اور میری جاں اس شہر کی طرف جانے کیلئے تگ و دو میں مصروف ہے جس کے راستے میں مکہ معظّمہ آتا ہے، 'اے ہم سفر' تو اسی جگہ مکہ میں ٹھہر کر اللہ کے خاص بندوں سے مل، کیونکہ میں تو دل میں اپنے محبوب کی منزل پر جانے کی 'شدید' خواہش رکھتا ہوں)۔

اس باب کے آخر کلام کے طور پر علامہ اقبال کا ایک شعر جو اگرچہ پختونوں کو خطاب کر کے کہا گیا ہے لیکن یہ پیغام امت کے ہر فرد کیلئے ہے:

خیز و اندر گردش آور جام عشق
در قہستاں تازہ کن پیغام عشق

(اٹھ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق کے پیالے کو گردش میں لا اور کوہستان

(بلکہ پوری دنیا) میں عشق کا پیغام تازہ (عام) کر۔ ۲۰

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کردے

دہر میں اسم محمدؐ سے اجالا کردے

(۲۱)

پورے عالم میں پیغام محمدؐ کے آفتاب عالم تاب سے اجالا کردے ۔

صدق خلیلؑ بھی ہے عشق۔۔۔

صدق خلیل بھی ہے عشق، صبر حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

حضرت ابراہیم علی السلام کی سچائی اور ان کے دل میں اللہ کے ہونے کی تصدیق عشق ہے حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کی شہادت سے کربلا میں حضرت امام حسین نے اپنی شہادت تکؓ جو مصائب برداشت کئے خصوصاً میدان کربلا میں اپنے خاندان کو اپنے سامنے شہید ہوتے دیکھ کر بے انتہا صبر، دراصل عشق ہی کی دلیل ہے، میدان بدر میں تھوڑی سی جماعت اور ٹوٹے پھوٹے ہتھیار لے کر دشمن سے نبرد آزما ہونے کی جرأت اور اسے مات دینا، حق و باطل کا پہلے ہی معرکے میں کفار مکہ کو شکست دینا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری معرکے (حنین) میں تعداد میں زیادہ ہونے کے باوجود ہزیمت کے آثار کا سامنا ،اور پھر نبی پاک ﷺ پر پروانہ وار نثار ہونے والی جماعت کی قربانی عشق کا نمونہ ہے یہ چار مینار عشق کے ہیں۔خلت، صبر، جرأت اور استقامت سالک کی صفات بھی ہیں اور عشق کی منزل کے سنگ میل بھی ہیں ان میں ''خلت'' حاصل ہے اور باقی تین اوصاف ہیں؛ سوال یہ ہے کہ خلت کیا ہے؟ خلت عشق کا ایک مقام ہے جو کائنات میں اللہ کے برگزیدہ رسلؑ میں سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ صرف حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کو حاصل ہوا یہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت ہے کہ آپ اس مقام سے گذر کر عشق کے اگلے سارے مقامات طے کرنے والی واحد ہستی ہیں۔جو مختلف صاحبان اسرار نے بیان کئے ہیں ان میں مؤدت، حب، ہیوم، ولہٗ اور تیم کے بعد آخری مرحلہ عشق مطلق یا حب مطلق ہے۔یہی منزل **دنیٰ فتدلیٰ** کے بعد قاب قوسین اَوْ ادنیٰ کی منزل ہے۔

جیسا کہ گذشتہ صفحات کے بابؔ مدارج عشق'' میں گذر چکا ہے حضرت سید علی ہمدانیؒ نے عشق کے جو مراحل بیان کئے ہیں ان میں عشق کا پانچواں مرحلہ ''خلت'' ہے ان سے پہلے مراحل:

۱۔لحظہ ۲۔رمقہ ۳۔ہویٰ اور ۴۔ وُدّ ہیں

اسی طرح صاحب مجمع السلوک (شرح رسالہ مکیہ) نے بھی ۱۔موافقت ۲۔میل و موانست ۳۔مؤدت ۴۔ہویٰ کے بعد عشق کا پانچواں مرحلہ 'خلت'' کو قرار دیا ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ (رسالہ عشقیہ) نے خلت کو عشق کا چھٹا مرحلہ قرار دیا ہے۔ان کے ہاں خلت سے پہلے عشق کے پانچ مراحل یہ ہیں؛

۱۔الفت ۲۔صداقت ۳۔مؤدت ۴۔ہویٰ ۵۔شغف۔

قاضی محمد سلیمان منصور پوری ''خلت'' کے حوالے سے کہتے ہیں:

''اعلیٰ ترین درجہ کا نام عبودیت ہے جب کہ محبّ ہر دعوے سے دست بردار ہو جاتا ہے اس کا جسم، دل روح، تمنا، آرزو، مراد سب کو بخوشی چھوڑ کر معبود کی عبودیت پر قانع وشاکر ہوتا ہے۔عبد کہلایا جانا اس کی واحد آرزو ہو جاتی ہے۔اس سے بالاتر درجہ 'خلت' کا ہے جب کہ جذبات اور تمنیات کا خاتمہ ہو جاتا ہے دل، دماغ طبع، روح، کامل طاقت و وحدت کے ساتھ محبوب ہی کو مقصود و مطلوب بنا لیتے ہیں۔اس مرتبہ پر صرف حضور ﷺ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پہنچے۔عقل انسانی اس کا احاطہ نہیں کر سکتی۔'' (۲۲)

عشق کے مقام خلت کے معروف حامل حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جیسا کہ حدیث میں ہے'' اِنَّ مِنْ اَمَنِّ النَّاسِ عَلَیَّ فِیْ صُحْبَتِہٖ وَ مَالِہٖ اَبُوْ بَکْرٍ وَلَوْ کُنْتُ مُتَّخِذاً خَلِیْلاً غیر ربی لاتخذت ابوبکر خلیلًا وَّلٰکِنْ اُخُوَّۃِ الْاِسْلَام و مودته.. لا یبقین.....الخ ' الحدیث (۲۳)

ترجمہ: اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں میں سب سے زیادہ اپنی ہمراہی اور مال سے ابوبکرؓ نے میری خدمت کی اگر میں اللہ کے علاوہ کسی کو خلیل بناتا تو وہ ابوبکر ہی ہوتے

البتہ ان کے ساتھ اسلامی اخوت اور مودّت کا رشتہ کافی ہے۔۔۔۔الخ الحدیث

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ خلت کے مقام پر حضرت ابراہیمؑ ہیں جن کے بارے میں قرآن پاک کی تعلیمات کے مطابق علامہ اقبالؒ نے ''اسرار خودی'' میں ارشاد فرمایا:

حق شناس وتارکِ آفل براہیم خلیلؑ
انبیاء را نقش پائے او دلیل
کلیات اقبال فارسی اسرارخودی رکن دوم رسالت

یہاں حضرت ابراہیمؑ کی دو صفات کا تذکرہ ہے اول الذکر ''حق شناس'' اور دوسری صفت ''تارک آفل'' ہے۔(اس کا تذکرہ ذیل کی سطروں میں مذکور ہے)۔

تلاش حق کا مرحلہ اول جسے علامہ اقبال نے ''حق شناس وتارک آفل '' سے تعبیر کیا ہے، قرآن پاک میں حضرت ابراہیمؑ کے اس سفر 'تلاش حق ' کے دوران مظاہر فطرت کے مشاہدے اور اس دوران ان پر مرتب ہونے والے اثرات کا تذکرہ کیا گیا ہے حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش ایک ایسے بت تراش گھرانے میں ہوئی جہاں ہر طرف بتوں کی فرمانروائی تھی۔(اس وقت اس بات پر کوئی بحث نہیں کہ ان کے والد گرامی آذر تھے یا تارخ) لیکن ان کی پرورش بہر حال آذر نے کی اور وہ شاہی بت تراش تھے۔حضرت ابراہیمؑ کے آس پاس بت ہی بت تھے انہیں کی پرستش ہو رہی تھی۔اس عہد کے شہنشاہ عالم نمرود سے عام آدمی تک سب بتوں کے پجاری تھے (اور نمرود خود کو بھی خدا کہلاتا تھا)۔لیکن حضرت ابراہیمؑ کا دل اس بات کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں تھا کہ انسان کے ہاتھوں سے تراشے ہوئے بت انسان کی تقدیر، اس کی زندگی اور موت کے مالک ہو سکتے ہیں؟ وہ خود اپنے خیال کیلئے دلیل لاتے پھر اس دلیل کو رد کر دیتے ہیں ۔ بتوں سے دل برداشتہ ہو کر وہ مظاہر فطرت کی جانب متوجہ ہوئے۔سب سے پہلے انہوں نے ایک ستارے کو دیکھا۔اور دل میں سوچنے لگے کہ یہ خدا ہو سکتا ہے۔لیکن جب وہ ڈوب گیا (فلمّا افلت) تو وہ اس سے دل برداشتہ ہو گئے، پھر چاند

ابھر آیا تو کہنے لگے۔شاید یہ خدا ہو۔وہ بھی ڈوب گیا، پھر اگلی صبح سورج طلوع ہوا تو وہ کہنے لگے کہ یہ بڑا ہے یہ میرا رب ہوسکتا ہے۔لیکن جب وہ بھی غروب ہوگیا (فلمّا افلت) تو حضرت ابراہیم پکار اٹھے جو ڈوب جائے وہ میرا خدا ہو نہیں سکتا اس لئے کہ خدا تو ہر لمحہ ہر آن ہر سمت موجود ہونے والا ہوسکتا ہے اور وہ تو ایک اللہ ہے۔

القرآن سورۃ الانعام ۶ آیات ۷۴ تا ۷۹ (۲۴)

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ لِاَبِیْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَاماً اٰلِهَةً ج اِنِّی اَرٰک وَ قَوْمَک فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ O وَ کَذٰلِکَ نُرِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ مَلَکُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالاَرْضِ وَلِیَکُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِیْنَ O فَلَمَّا جَنَّ عَلَیْهِ الَّیْلُ رَاٰ کَوْکَباً ، قَالَ هٰذا رَبِّی ، فَلَمَّا اَفَلَ قَالَ لا اُحِبُّ الاٰفِلِیْنَ O فلما رَاَ القمرَ بازغاً قال هذا ربی ، فلمّا اَفَلَ قالَ لَئِنْ لَّم یَهْدِنِی رَبِّی لَاَ کُوْنَنَّ مِن اَلقَوْمِ الضَّآلِّیْنَ O فلمّا رَاَ الشَّمْسَ بازِغةً قال هٰذا ربِّی هٰذَا اَکْبَرُ ، فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ یٰقَوْمِ انّی بَرِیٌٔ مِمّا تُشْرِکُوْنَ O اِنِّی وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذی فَطَرَ السَّمٰوٰتِ والاَرْضَ حنیفاً وَّ ما انا من المشرکینَO

ترجمہ:۔(از ''تفسیر عثمانی'': علامہ شبیر احمد عثمانیؒ) اور یاد کرو جب ابراہیمؑ نے اپنے والد آذر سے کہا کہ (یہ جو) تم بتوں کو اپنا معبود مانتے ہو، تو میں تم کو اور تمہارے (بت پرست) گروہ کو صریح گمراہی میں (پڑا ہوا) دیکھتا ہوں O اور اس طرح ہم دکھانے لگے ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کے عجائبات (مظاہر) تاکہ اس کو یقین آجائے۔O پھر جب رات ہوگئی تو اس (ابراہیم) نے آسمان پر ایک تارہ دیکھا تو کہنے لگے یہ میرا رب ہے پھر جب وہ غائب ہوگیا تو (ابراہیم) کہنے لگے میں غائب ہوجانے والوں کو پسند نہیں کرتا O پھر جب انہوں نے چاند کو اپنی چاندنی بکھیرتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگے یہ میرا رب ہے لیکن جب وہ ڈوب گیا تو کہا اگر میرے رب نے مجھے ہدایت نہ دی۔صحیح راستہ نہ دکھایا۔تو میں تو بلاشبہ گمراہ ہوجاؤں گا O پھر جب انہوں نے سورج اپنی تب وتاب کے ساتھ دیکھا تو کہنے لگے یہ ان سب سے بڑا ہے (جو میں نے اس وقت تک دیکھے ہیں) یہ میرا رب ہے لیکن جب وہ بھی غروب ہوگیا تو پکار اٹھے اے میری قوم میں ان سب سے بیزار

ہوں جنہیں تم (معبود حقیقی کے ساتھ) شریک کرتے ہو۔O بے شک میں پوری توجہ اور یک سوئی کے کے ساتھ اس کی جانب متوجہ ہوتا ہوں جو آسمانوں اور زمین کا بنانے والا ہے، (میں اعلان کرتا ہوں) کہ میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں O

پس حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے اللہ کی جانب متوجہ ہو کر اپنی برأت اور رہنمائی کی دعا فرمائی۔ حضرت ابراہیمؑ کی مزید خوبیاں جو کلام اقبال میں بھی قرآنی بیان کے تتبع میں بیان کی گئیں یعنی ''حق شناس'' 'تارک آفل' 'رہبر انبیاء'، 'ابوالانبیاء' اور امت محمدیہ کیلئے ملت ابراہیمی۔ علامہ اقبال، ابوالانبیاء حضرت ابراہیمؑ کے اس تلاش حق قربانی و ایثار، اللہ کی غیر مشروط اطاعت کے حوالے سے ارشاد فرماہیں: (۲۵)

حق شناس و تارکِ آفل براہیم خلیلؑ
انبیاء را نقش پائے او دلیل
آں خدائے لم یزل را آیتے
داشت در دل آرزوئے ملّتے
جوئے اشک از چشم بے خوابش چکید
تا پیامِ ''طھّرَا بَیْتِی'' شنید
بہر ما ویرانۂ آباد کرد
طائفاں را خانۂ بنیاد کرد
تا نہالِ ''تُبْ عَلَیْنَا'' غنچہ بست
صورتِ کارِ بہارِ ما نشست

(پروفیسر عبدالعلیم صدیقی نوراللہ مرقدہٗ منظوم ترجمہ ''کلیات قبال فارسی'')

حق شناس و تارک آفل براہیمؑ خلیل
انبیاء کے واسطے تھا جس کا نقش پا دلیل

وہ خدائے لم یزل کی آیت تابندہ تر
چاہتا تھا اس کا دل اک ملت صاحب نظر
دیدۂ بے خواب سے جب اشک کا دریا بہا
حق سے تب اس نے پیام 'طہّر ا بیتی' سنا
پھر ہمارے واسطے آباد ویرانہ کیا
ٹکڑیوں کو ، کرکے تعمیر حرم ، یکجا کیا
غنچہ جب شاخ نہال 'تُب علینا' میں کھلا
کاروان فصل گل بستاں میں خیمہ زن ہوا

امت مسلمہ ملت ابراہیمی ہے، اور ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام والتسلیم خلیل اللہ ہیں، آپ کو عشق کا اعلیٰ مقام 'خلت' حاصل ہے۔ اور یہ یونہی نہیں حاصل ہوا اس مقام سے پہلے حضرت ابراہیمؑ کو رہ عشق میں بے شمار امتحانوں سے گذرنا پڑا۔ بلاشبہ آپؑ نے یہ مقام اپنے اعلیٰ ترین اوصاف اور صبر آزما جدوجہد کی بنا پر حاصل کیا۔ معبود حقیقی کی تلاش اور اس سے شدید محبت والی بندگی، ماسوااللہ سے توجہ ہٹا کے صرف اپنے محبوب حقیقی کی طرف لو لگانا، اللہ کے عشق میں اپنی اور اپنی اولاد کی قربانی سے دریغ نہ کرنا۔

حضرت ابراہیم علیہ اسلام کی تمام زندگی عشق سے عبارت ہے اسی وجہ سے وہ حسن ازل کی بارگاہ سے مقام ''خلّت'' سے سرفراز ہوئے۔

صبر حسینؓ بھی ہے عشق

غریب وسادہ ورنگیں ہے داستان حرم
نہایت اس کی حسینؓ ابتدا ہے اسماعیلؑ

علامہ اقبالؒ نے حضرت امام حسینؓ کو ''امام عاشقاں'' قرار دیا ہے اور ان کی واقعۂ کربلا میں ''قربانی'' کو عشق کی فتح' اور 'ذبحٌ عظیم کا مصداق بیان کیا ہے جس کا قرآن پاک میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے واقعہ قربانی'' و ترکنہٰ فی الآخرین'' 'والی آیات میں ذکر ہوا ہے' ،علامہ ارشاد فرماہیں:

آں شنیدستی کہ ہنگام نبرد
عشق با عقل و ہوس پرور چہ کرد
آں امام عاشقاں پور بتولؓ
سروِ آزادے ز بُستان رسولؐ
اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر
معنیٔ ذبح عظیم آمد پسر

(۲۶)

''تو نے سنا کہ (عشق وعقل کے مابین) جنگ (کربلا) کے لمحات میں عشق نے عقل ہوس پرور کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ وہ امام عاشقاں (حضرت امام حسینؓ) سیدہ فاطمۃ الزہراءؓ کے فرزند ہیں جو گلستان نبویؐ کے سروِ آزاد ہیں اللہ اللہ کیا مقام ہے کہ ان کے والد حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ) بائے بسم اللہ (قول حضرت علیؓ ہے کہ 'میں بسم اللہ کی ب کا نقطہ ہوں') اور (ان کا) بیٹا (حضرت امام حسینؓ) معنیٔ ذبح عظیم ''عظیم ترین قربانی'' جیسا کہ سورۃ الصافات میں '' وَ فَدَیْنٰہُ بِذِبْحٍ عَظِیم' کا مطلب ومفہوم بن گئے''

قافلہ عشق کے علمبردار حضرت امام حسینؓ اور ان کے ساتھی تھے جو عددی اعتبار سے کم

تھے اور بظاہر کمزور تھے جب کہ عقلِ ہوس پرور کی سیادت یزید وابن زیاد وشمر ذی الجوشن کے پاس تھی ان کے پاس عددی اکثریت بھی تھی اور اسلحہ وسامان جنگ کے اعتبار سے بھی، مزید برآن اپنے انتخاب کردہ میدان جنگ کے اعتبار سے بظاہر قوی تھے۔

حضرت امام حسینؓ اور ان کے ساتھی ایک ایک کر کے شہید ہو گئے، بظاہر شکست کے باوجود وہ سرخرو ہوئے دنیا میں آج تک ان کا تذکرہ محبت اور عقیدت سے ہوتا ہے دوسری جانب یزید اور ان کے حواری بظاہر فتح حاصل کرنے کے باوجود مردود ہیں اور ان کا تذکرہ انتہائی کراہت سے کیا جاتا ہے سو عشق نے واقعہ کربلا میں بے مثال قربانی کی وجہ سے عقل ہوس پرور سے فتح کا جھنڈا چھین لیا آج بھی حسینیت فتح مند ہے اور یزیدیت شکست خوردہ ہے۔ یہی ہے وہ کارنامہ جو عشق نے سرانجام دیا۔ حضرت امام حسین کی ذات اقدس کے حوالے سے علامہ اقبال مزید ارشاد فرماتے ہیں: (۲۷)

بہر آں شہزادہ ٔ خیر الملل
دوش ختم المرسلیں ؐ نعم الجمل
سرخ رو عشق غیور از خونِ اُو
شوخی ٔ ایں مصرع از مضمونِ اُو
درمیان امت آں کیواں جناب
ہم چو حرف قل ھو اللّٰہ در کتاب
موسیٰ ؑ و فرعون و شبیرؓ و یزید
ایں دو قوت از حیات آمد پدید

ترجمہ: تمام امتوں میں بہترین امت یعنی ملت اسلامیہ کے شہزادے کی شان یہ تھی کہ وہ خاتم المرسلین، خاتم الانبیاء اپنے نانا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دوش مبارک پر سواری کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کسی صحابیؓ نے یہ کیفیت دیکھ کر کہا ''نعم الجمل'' یعنی کتنی اچھی سواری ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''سوار بھی تو بہت اچھے ہیں''۔

عشق غیور نے امام عاشقاں حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے ذریعے کامیابی حاصل کی۔انہی کے مضمون شہادت واقعہ کربلا کے ذریعے اس مضمون شہادت میں عظمت پیدا ہوئی یعنی حضرت امام حسینؓ نے حق کی شیفتگی میں انتہائی ناسازگار حالات کے تحت شہادت بہ طیب خاطر قبول کی۔'سر داد نداد دست در دست یزید'۔عشق غیور باطل کے مقابلے میں پیچھے ہٹنے کے تصور سے نابلد ہے۔اپنی اور اپنے کنبے کی قربانی گوارا کر لی لیکن باطل کے مطالبے کو قبول نہ کیا۔حضرت امام حسینؓ کا رتبہ بلندی میں آسمان کا ہم سر تھا ان کی حیثیت امت میں ایسی ہی تھی جیسی قرآن پاک میں سورۂ اخلاص کی ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفویؐ سے شرار بو لہبی

حق و باطل کی آویزش ازل سے جاری ہے۔اس جنگ میں موسیٰؑ اور فرعون کی طرح حسینؓ اور یزید کی قوتوں کے درمیان چپقلش ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔یہ اس کائنات کی ازلی حقیقت ہے۔ (۲۸)

تا قیامت قطع استبداد کرد
موج ِ خونِ او چمن ایجاد کرد
بہر حق در خاک وخوں غلطیدہ است
پس بنائے لا الٰہ گردیدہ است

ترجمہ:حضرت امام حسینؓ نے اپنی اور اپنے کنبے کی قربانی دے کر قیامت تک استبداد کو مٹا ڈالنے کی مثال قائم کی ان کے جسموں سے بہنے والا خون امت کے چمن میں بہار کا باعث بنا۔انہوں نے حق کی خاطر اتنی مشکلات کا پامردی سے مقابلہ کیا،اور بالآخر وہ خون میں نہا گئے۔یہ قربانی عالم میں اسلام کے احیاء کی بنیاد بن گئی۔ (۲۹)

مدعایش سلطنت بودے اگر
خود نکردے باچنیں سامانِ سفر

دشمناں چوں ریگ صحرا لاتعدّ
دوستان او بہ یزداں ہم عدد

ترجمہ: حضرت امام حسینؓ کا مقصد اگر سلطنت حاصل کرنا ہوتا تو اس لڑائی کیلئے سامان فراہم کرنا ان کیلئے مشکل نہیں تھا۔

۔حضرت امامؓ کے دشمنوں کی تعداد صحرا میں ریت کے ذرات کی طرح تھی اور ان کے ہمراہیوں کی تعداد حروف ابجد کے حساب سے ''یزدان'' کے برابر تھی ۔یعنی، ی =۱۰، 'ز'=۷،'د'=۴،الف=۱،ن=۵۰ =۷۲ (۱۰+۷+۴+۱+۵۰=۷۲=شہدائے کربلا)۔

اتنی مختصر تعداد اور اپنے کنبے کے تمام مرد وزن اور بچوں کو لے کر اتنے کثیر التعداد دشمن کے مقابلے میں لے آنے کا ایک مقصد تھا اور وہ مقصد کائنات میں عظیم ترین تھا اور پوری امت کیلئے سبق بھی۔ کہ مقصد اگر عظیم ہو اور خدا کی خوشنودی اور امت مسلمہ کی بہتری مقصود ہو تو کسی بھی طرح اور کسی بھی درجے کی قربانی سے گریز عشق کی توہین ہوگی۔ یہ عشق الٰہی ہی ہے کہ شہید کربلا کو اپنے سامنے اپنے نونہالوں کی خون میں لت پت جسموں کو دیکھ کر بھی مقصد سے ہٹا نہ سکا۔

حضرت امام حسینؓ کا مقصد پہاڑوں سے بلند اور مستحکم تر تھا اور ایسا کیوں؟ اس لئے کہ کہ تلوار صرف دین کی عزت کے واسطے بے نیام ہوسکتی ہے۔اس کا مقصد صرف ایک ہے کہ اور وہ یہ کہ کہ شریعت کی حفاظت ہو اس کے علاوہ سلطنت کے حصول جیسی کسی چھوٹی بڑی غرض کیلئے نہیں۔انہوں نے دین (کہ جو آئین عشق ہے) کی حفاظت کی خاطر تلوار اٹھائی۔اور اپنی اور اپنے کنبے اور دوستوں کی قربانی دے دی اور ان تمام مراحل، مصائب، مشکلات میں صبر واستقامت کا ایک ایسا مینار کھڑا کر دیا جس کی بلندی کو آج تک کوئی چھو بھی نہ سکا۔

علامہ اقبال کہتے ہیں:

خون او تفسیر ایں اسرار کرد
ملت خوابیدہ را بیدار کرد

تیغ 'لا' چوں از میاں بیروں کشید
از رگ ارباب باطل خوں کشید
نقش 'الا اللہ' بر صحرا نوشت
سطر عنوانِ نجاتِ ما نوشت

ترجمہ: حضرت امام حسینؓ کے خون نے دین حق یعنی اسلام (آئین عشق) کا یہ راز کھول کر بیان کر دیا اور سوئی ہوئی ملت کو جگا دیا (یعنی ملت دین اسلام کے حق سے غافل تھی) حضرت امام حسینؓ نے یہ غفلت دور کر دی۔ انہوں نے ''لا'' کی تلوار نیام سے باہر کھینچی تو باطل لشکریوں کی رگوں سے خون نکال دیا۔ پھر انہوں نے ''الا اللہ'' یعنی توحید کا نقش صحرا کے سینے پر بٹھا دیا، لکھ دیا اور یہی نقش ہماری نجات کا سبب ہے۔ سو انہوں نے ہماری نجات کے عنوان کی سطر لکھ دی۔ (۳۰)۔

علامہ اقبال کا یقین ہے کہ ہم (امت مسلمہ) نے قرآن کی رمز حضرت امام حسینؓ سے سیکھی ہے اور انہی کی شہادت کے شعلے سے اپنی اپنی آگ جلائی ہے۔ انہی کے فلسفے سے اپنی اپنی راہیں کشید کی ہیں۔ دنیا کی ساری بادشاہتوں، ساری سلطنتوں کی شوکتیں، ان کا سارا کروفر قصۂ پارینہ ہو چکا ہے۔ لیکن صبر و شہادت حسینؓ کا فخر ابھی تک قائم ہے۔ اور اس سورج نے کبھی غروب نہیں ہونا۔ قیامت تک یہ سورج اپنی چمک ، اپنی تاب کے ساتھ موجود رہے گا۔

شہباز گردیزی ''صبر حسینؑ۔ ایک فکری مطالعہ'' میں صبر حسین کی فکری پرتوں کو کھولتے ہوئے رقمطراز ہیں: ''رسم شبیری چار ستونوں پر استوار ہے۔ صبر، یقین، عدل اور جہاد یہی تشریح امیر المومنین علی علیہ السلام نے ایمان کے حوالے سے بھی کی ہے ۔(۳۱)

اس رو سے بشریت یا ایمان کا پہلا ستون ''صبر'' ہے۔ ایمان امن اور امان سے مشتق ہے امن یعنی محفوظ ہو جانا، خطرات سے بچ جانے کو امن کہتے ہیں ایمان کی طرح صبر کے معانی بھی ہمارے ہاں بدل گئے ہیں جیسے ہمارے ہاں دعوت کا مطلب کھانا کھلانا لیا جاتا ہے جبکہ دعوت کے معنی پیغام پہنچانا ہے۔ کربلا میں امامؑ میں صبر، یقین، عدل اور جہاد کا عملی مظاہرہ

کر کے شبیریت یعنی ایمان کی تنظیم کی۔۔۔صبر کے معنی استقامت کے ہیں۔۔۔امام علیؑ کے مطابق صبر کے چار شعبے ہیں شوق، خوف، زہد اور چوتھا شعبہ ہے 'ترقب' یعنی انتظار انسان کو صابر بننے کیلئے ایک پروسیس سے گذرنا پڑتا ہے۔۔۔ '' (۳۲)

شہباز گردیزی مزید تحریر کرتے ہیں ''امام عالی مقام کی جدوجہد اور قیام کا اگر بنظر عمیق جائزہ لیا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان کے مقاصد ہمہ جہت اور ہمہ گیر تھے۔ فقط دینی اقدار شرعی احکام یا نظام حکومت آپ کا ہدف یا موضوع نہیں تھے۔ بلکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے قرآنی (الوہی اور نبویؐ) فریضے کے ذریعے اصلاح نظام اور اصلاح معاشرہ بھی آپ کا مطمعٔ نظر آتا تھا۔ اس بات کی دلیل اور واضح ثبوت آپؑ کے متعدد خطبات میں موجود ہے۔ جو آپؑ نے مدینہ سے مکہ اور کربلا تک ارشاد فرمائے تھے۔ اسی تسلسل میں ثانی زہرا حضرت سیدہ زینبؑ اور سید الساجدین حضرت امام زین العابدینؑ کے خطبات بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اصلاح نظام اور تعمیر معاشرہ کی ذمہ داری اس قدر اہمیت کی حامل ہے کہ اس کے لیے نہ فقط زبان سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا پڑتا ہے بلکہ اصلاح نظام اور تعمیر معاشرہ کے لیے اگر نواسہ رسولؐ جیسی محترم ہستی اور ان کے اصحاب وانصار کو موت گلے لگانا پڑے تو اس میں ہچکچاہٹ نہیں ہوتی۔ (۳۳)

قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں
گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ وفرات
عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات
صدق خلیلؑ بھی ہے عشق، صبر حسینؓ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

حضرت امام حسینؓ نے انتہائی صبر کے ساتھ اتنے نامساعد حالات کا مقابلہ کیا جس کی مثال تاریخ عالم نہیں ملتی، ان کی جگہ اور ہوتا تو ہمت ہار بیٹھتا اور یزید کی بیعت کر کے دنیا کے

سارے مزے اٹھا تا لیکن انہوں نے اپنے نانا (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دین کی سربلندی کیلئے کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا اور بے مثال صبر کا مظاہرہ کیا۔جس کی بات علامہ اقبال ''صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق'' کی تلمیح میں کررہے ہیں۔

صبر ایسی صفت ہے جو اللہ نے ہر نبیؑ کو ودیعت کی۔دین اسلام کی دعوت کے دوران سب سے زیادہ تکالیف کا سامنا انبیاء کو کرنا پڑا۔حضرت نوحؑ ساڑھے نوسو سال یہ فریضہ انجام دیتے رہے ان کی قوم روزانہ انہیں اذیت دیتی اور ان پر سنگ باری کرتی یہاں تک کہ وہ پتھروں میں ڈوب جاتے۔فرشتے آ آ کر انہیں ان پتھروں سے نکالتے۔اور وہ اگلے دن پھر اپنا کام شروع کردیتے۔آخر انہیں وہ دعا کرنا پڑی جو قرآن پاک میں مذکور ہے **و قال نوح ربّ لا تذر علی الارض من الکافرین دیاراً**.(سورۃ نوح) نبی آخرالزمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اذیتوں کے پہاڑ توڑے گئے لیکن حضور آپ رحمت نے کبھی بددعا نہیں کی۔حضور ﷺ کے پیارے نواسے جنہیں سوار دوش رسول ﷺ لعل بتولؓ کا اعزاز حاصل ہے۔انہیں جن اذیتوں سامنا کرنا پڑا اور انہوں نے جن مصائب اور تکالیف پر صبر کیا اور استقامت کا مظاہرہ کیا یہاں تک کہ اپنے کنبے کے تمام افراد کو اپنے سامنے شہید ہوتے دیکھا اور خود بھی شہید ہوئے۔آپؓ کی قربانیاں اور صبر ضرب المثل ہے اور یہ سب کچھ ''عشق'' کے بغیر ممکن نہیں،سو آپؓ کا ہر کارنامہ عشق کی شدت کی بدولت ہے۔اور عشق کی بیش قیمت مثال بھی۔اور عشق کی منزل کا حصول صبر کے بغیر ناممکن ہے اس باب کے آخر میں محسن نقوی کی ایک عظیم کوش کو شامل کرتے ہیں محسن نقوی ہمارے عہد کے ایک ممتاز شاعر ہیں انہوں نے صبر حسینؓ کے حوالے سے ایک مرثیے میں صبر کی کتنی پرتیں کھولیں ، ملاحظہ فرمائیں۔: (۳۴)

صبر سرمایۂ دل، صبر مناجات ضمیر
صبر خوشبو کی طرح پھول کے سینے میں اسیر

صبر صحرا سے گزرتے ہوئے بادل کا سفیر
صبر سقراط کے ہونٹوں پہ تبسم کی لکیر
صبر ایوان سلاطیں میں کہاں ملتا ہے
صبر کا پھول یہ سرِ نوک سناں کھلتا ہے
صبر کونین کے چہرے کے لیے زینت وزین
صبر معیار نظر، دولت جاں، راحت عین
صبر خیر کا جری، فاتح صد بدر و حنین
صبر کردار نبیؐ، صبر علمدارِ حسینؑ
صحن تاریخ میں جب خاک بکھر جاتی ہے
کربلا صبر کی معراج نظر آتی ہے
مقتل شہؑ کی زمیں خون سے تر ہو کے رہی
زندگی اپنے ہی سینے کی سپر ہو کے رہی
نوک نیزہ کی بلندی تھی کہ سر ہو کے رہی
ظلم کا ابر چھٹا، دیں کی سحر ہو کے رہی
جبر کا نام ونشاں، بھولا ہوا خواب ہوا
صبر شبیرؑ کے سجدے سے ظفر یاب ہوا

حوالہ جات

۱۔ پروفیسر ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، ''عروج اقبال''، علامہ اقبال کے 'عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا جمالی پہلو'

۲۔ القرآن سورہ آل عمران آیہ ۱۵۹

۳۔ ''روزگار فقیر'' جلد اول ''عاشق رسول فقیر سید وحید الدین''

۴۔ القرآن سورۃ بقرہ آیہ ۲۸۵ و سورہ مائدہ آیہ ۷

۵۔ (مجلّہ ''اقبال''۔ اکتوبر ۱۹۵۷ء، ص ۳۰)

۶۔ القرآن: سورۂ یوسف۔

۷۔ کلیات اقبال فارسی مثنوی اسرار و موز

۸۔ (دیوان حسانؓ بن ثابت) ترجمہ و تشریح قاری محمد اویس سرور

۹۔ (ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی۔ اقبال اور محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ص ۳۲)

۱۰۔ (اقبالؒ مثنوی پس چہ باید کرد۔۔۔ مسافر)

۱۱ علامہ اقبال کلیات اقبال فارسی ''در حضور رسالت مآبؐ'': مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق۔ مسافر)

۱۲۔ کلیات اقبال اردو : بانگ درا (صدیقؓ)

۱۳۔ کلیات اقبال اردو: بانگ درا 'جنگ یرموک کا ایک واقعہ

۱۴۔ ''سیرت اقبال ایک مکتوب''

۱۵۔ (ارمغان حجاز۔ ۹)

۱۶۔ ایضاً

۱۷۔ (ایضاً)

۱۸۔ (ایضاً۔)

۱۹۔ ارمغان حجاز (حضور حق ۔۔ق ۱۱

۲۰۔ پیام مشرق : تمہید پیش کش : علامہ اقبالؒ
۲۱۔ کلیات اقبال اردو بانگ درا 'جواب شکوہ'
۲۲۔ قاضی محمد سلیمان منصور پوری ''رحمۃ اللعالمین ''جلد ۳
۲۳۔ صحیح البخاری باب فضائل اصحابؓ النبی ﷺ حدیث ۳۶۶۳
وصحیح مسلم حدیث نمبر ۲۳۸۴
۲۴۔ .القرآن سورۃ الانعام ۶ آیات ۷۴ تا ۷۹
۲۵۔ رموز بیخودی رکن دوم رسالت
۲۶۔ ''علامہ اقبال رموز بیخودی۔درمعنی حریت اسلامیہ وسرِّ حادثہ کربلا''
۲۷۔ ایضاً
۲۸۔ (ایضاً)
۲۹۔ ایضاً
۳۰۔ ایضاً
۳۱۔ (نہج البلاغہ ۔حکمت ۳۰)۔
۳۲۔ ''صبر حسینؑ ایک فکری مطالعہ''
سید شہباز گردیزی ''مطلع'' اکتوبر تا دسمبر 2007
۳۳۔ ایضاً
۳۴۔ مرثیہ محسن نقوی

زندہ رود (جاوید نامہ)

علامہ اقبالؒ

بآدمے نرسیدی ، خدا چہ می جوئی؟
ز خود گریختہ ای ، آشنا چہ می جوئی؟

تو آدمی تک تو پہنچا نہیں (ایک آدمی کو تو پہچان نہیں پایا) خدا کو کیا ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ تو تو خود سے بھاگا ہوا ہے (اپنے آپ سے دور ہے) تو محبوب کی تلاش کیسی؟

دگر بشاخ گل آویز و آب و نم در کش
پریدہ رنگ ! ز بادِ صبا چہ می جوئی؟

تو پھر پھول کی شاخ سے لٹک (اسلام سے اپنا رشتہ جوڑ لے) اور پانی اور نمی جذب کر۔ اے کمہلائے ہوئے پھول (کہ تیرا رشتہ دین سے کٹا ہوا ہے) تو بادِ صبا سے کیا چاہتا ہے۔

دو قطرۂ خوں دل است، آں چہ مشک می نامند
تو اے غزالِ حرم در خطا چہ می جوئی؟

جسے مشک نافہ کہتے ہیں وہ دو قطرۂ خون ہی تو ہیں۔ اے غزال حرم ! تو ملک خطا (ختن) میں کیا تلاش کرتا پھرتا ہے۔

عیارِ فقر ز سلطانی و جہانگیریست
سریر جم بطلب ، بوریا ؟ چہ می جوئی؟

فقر کی کسوٹی سلطانی و جہانگیری ہے، تو تخت جمشید طلب کر، بوریا کیلئے کس لئے دعائیں کر رہا ہے۔

سراغ او ز خیابان لالہ می گیرند
نوائے خوں شدۂ ما ز ما چہ می جوئی؟

اس کا سراغ تو لالہ کی کیاریوں سے لگایا جاتا ہے ہماری خوں شدہ نوا کو ہم سے ہی کیوں طلب کر

رہا ہے((گل لالہ کے داغ ہماری ہی ناکام تمناؤں کا سبب ہیں)

نظر ز صحبتِ روشندلاں بیفزاید
ز دردِ کم بصری توتیا چہ می جوئی؟

روشن ضمیر حضرات کی صحبت سے بصیرت میں اضافہ ہو جاتا ہے، تو اپنی کم نگہی کے علاج کیلئے سرمہ کیوں تلاش کرتا پھرتا ہے۔

قلندریم و کرامات ما جہاں بینی ست
زما نگاہ طلب، کیمیا چہ می جوئی؟

ہم قلندر ہیں اور پوری دنیا کو بیک وقت دیکھنا ہماری کرامت ہے تم ہم سے دلوں کے اندر تک دیکھنے والی نگاہ طلب کرو سونا بنانے والی ترکیب حاصل کرنے کیلئے دعائیں کیوں مانگ رہے ہو؟

-☆-☆-☆-

اختتامیہ زندہ رود رخصت می شود از فردوس بریں ۔۔۔۔۔

(زندہ رود بہشت سے رخصت ہوتا ہے۔۔۔ جاوید نامہ علامہ اقبال)

راہرو کو داند اسرار سفر
ترسد از منزل، ز رہزن بیش تر
عشق در ہجر و وصال آسودہ نیست
بے جمال لایزال آسودہ نیست
ابتدا پیش بتاں افتادگی
انتہاء از دلبراں آزادگی
عشق بے پرواہ و ہر دم در رحیل
در مکان و لا مکاں ابن السبیل
کیش ما مانند موج تیز گام
اختیار جادہ و ترک مقام

ترجمہ: ☆۔وہ مسافر جسے سفر کے رازوں کا علم ہے وہ راستے کے لٹیروں سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا منزل سے ڈرتا ہے

☆۔عشق ہجر و وصال دونوں میں آسودگی نہیں پاتا وہ جمال لایزال (حسن مطلق) کے دیدار یا وصل کے بغیر ہمیشہ بے چین رہتا ہے اور مطلق آسودگی نہیں پاتا

☆۔عشق کی ابتدا بتوں کے آگے جھک جانے سے ہے (حسینوں کی زلف گرہ گیر کا شکار ہوتا ہے) اور اس عشق کی انتہاء ان دلبروں اور حسینوں سے آزادی ہے۔

☆۔عشق بے پرواہ ہے اور ہر دم سفر میں رہتا ہے خواہ مکاں (دنیا) ہو یا لا مکاں (آخرت)، وہ ہر جگہ مسافر ہے۔

☆۔ہمارا (اہل عشق کا) مسلک تیز بہنے والی موج جیسا ہے یعنی راستہ اختیار کرنا اور منزل کو چھوڑ دینا، اور۔۔۔۔۔ اور مسلسل چلتے رہنا۔

حواشی

ح ۱۔حضرت سید ابوالحسن علی بن محمد عثمان الہجویریؒ معروف بہ حضرت داتا گنج بخش لاہوریؒ: (صاحب کشف المحجوب ،کشف الاسرار ، کتاب الفنا و البقاء، اسرار الخرق والمؤ دفات، کتاب البیان لاہل العیان، بحرالقلوب، الرعایت لحقوق اللہ، دیوان، (پیدائش ۴۰۰ھ مطابق ۱۰۱۰ء ہجویر، جلاب غزنی افغانستان)

سلسلۂ نسب حضرت سیدنا علیؓ بن سیدنا حضرت عثمانؓ بن سیدنا حضرت علیؓ جلابی بن سیدنا حضرت سید عبدالرحمٰنؒ بن سیدنا حضرت سید شاہ شجاعؒ بن سیدنا حضرت سید ابوالحسن علیؒ بن سیدنا حضرت سید حسین اصغرؒ بن سیدنا حضرت سید زیدؒ شہید بن سیدنا حضرت سید امام حسنؓ بن امیر المؤمنین سیدنا حضرت علی (کرم اللہ وجہہٗ) ابن ابی طالب۔

لاہور آمد: ۴۳۱ھ: دور محمودؒ غزنوی اس وقت لاہور کا گورنر ایک ہندو رائے راجو تھا جو حضرت علی ہجویریؒ کی توجہ اور دعوت سے مسلمان ہوا اور حضرت ہجویریؒ کی طرف سے ''شیخ ہندی'' کے لقب سے ملقب ہوا۔ انہی کی اولاد آج تک مزار داتا گنج بخشؒ کی مجاور ہے۔ آپ کی وفات ۴۶۵ھ مطابق ۱۰۷۲ء لاہور میں ہوئی اور یہیں ان کا مزار آج تک مرجع خلائق ہے۔ لاہور کو'' داتا کی نگری'' کہا جاتا ہے

ح ۲۔حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ: (صاحب عوارف المعارف وحکمۃ الاشراق وغیرہ) شیخ الاسلام ، امام السالکین قدوۃ المشائخ شیخ ابوحفص عمر بن محمد سہروردی (نسباً صدیقی) پیدائش سہرورد (زنجان) اوائل ماہ شعبان ۵۳۹ھ مطابق ۱۱۴۵ء وفات بغداد ۶۳۲ھ مطابق ۱۲۳۴ء مزار بغداد عراق۔ مؤسس ثانی سلسلہ سہروردیہ جس کے بانی ان کے چچا ابونجیب سہروردیؒ ہیں۔ حضرت شیخ شہاب الدینؒ سہروردی آخری دور عباسیہ میں سفارت کا فریضہ بھی سرانجام دیتے رہے۔ وہ ایک معروف صوفی تو تھے ہی ان کی وجہ شہرت ایک فلسفی کے اعتبار سے بھی تھی۔ وہ اشراقیہ کے بانی بھی تھے اور شیخ الاشراق (صاحب حکمۃ الاشراق) کے لقب سے بھی معروف تھے۔

ح ۳۔حضرت ابوبکر شبلیؒ۔

(نام:جعفرؒ ابن یونس) ابو بکر شبلی ۸۶۱ ء میں خراسان کے علاقے میں پیدا ہوئے۔خاندانی اعتبار سے آپ کا تعلق خراسان کے ایک متمول کنبے سے تھا ان کے والد یونس نہاوند کے والی تھے، والد کے بعد وہ نہاوند کے والی مقرر ہوئے ،اسی ولایت کے دوران ان کا دل دنیا کی آسائشوں سے متنفر ہوا اور وہ حضرت جنید بغدادی کی خدمت میں حاضر ہو کر تصوف کی راہ پر چل پڑے اس دوران انہیں قید بند کی صعوبتوں سے گذرنا پڑا بالآخر انہیں شہر بدر کیا گیا اور وہ صحرا صحرا پھرتے رہے اسی حالت میں ان کا انتقال ۹۴۶ ء میں ہوا، وہ حضرت جنید بغدادیؒ کے خلیفہ تھے اور حسینؒ ابن منصور الحلاج کے دوست تھے)

ح ۴۔حضرت شیخ فخر الدین ابراہیم عراقیؒ:

پیدائش: گاؤں کوماجان نزد ہمدان ،اپنی زندگی کے اکثر ایام قونیہ، کرمان اور ملتان میں گذارے۔وہ ہندوستان (ملتان) میں اس وقت کے سہروردیہ سلسلہ کے شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے پاس تشریف لائے۔جہاں انہوں نے حضرت ملتانیؒ کی صاحبزادی سے شادی کی اوران کا ایک صاحب زادہ کبیر الدین تولد ہوا۔حضرت ملتانیؒ کی وفات کے بعد وہ واپس چلے گئے اور مکہ، مدینہ اور بلاد عربیہ کی زیارات سے مستفیض ہوئے۔اوائل جوانی میں وہ قونیہ میں مولانا رومیؒ سے ملاقات کیلئے قونیہ گئے جہاں مولانا رومؒ کے علاوہ حضرت محمد بن یونس معروف بہ صدر الدین قوناویؒ سے ان کی ملاقاتیں رہیں۔ان کی تصانیف میں ''لمعات'' اور ''عشاق نامہ'' معروف ہیں۔وہ ابن عربیؒ دبستان فکر کے معروف شارح ہیں۔تصوف کے علاوہ وہ فارسی وعربی ادب کے بڑوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ان کی وفات ۱۲۸۹ء میں دمشق میں ہوئی۔(انسائیکلوپیڈیا آف اسلام،طبع دوم مولفہ پی بیئرمین ودیگر۔۲۰۱۰)

ح۔۵۔عبدالسلام،ندوی،مولوی۔ مصنف ''اقبال کامل''

ح۔۶۔خلیفہ عبدالحکیم ڈاکٹر مصنف ''فکر اقبال''

کتابیات

(الف) القرآن

(ب) کتب احادیث صحاح ستہ

(صحیح بخاری، صحیح مسلم، موطا امام مالکؒ، سنن ابی داؤد، مسند امام حنبلؒ، سنن ابن ماجہؒ)

(ج) بائیبل (عہدنامہ عتیق ،عہدنامہ جدید)

۱۔مثنوی مولانا رومؒ	مترجمہ مولانا قاضی سجاد حسین دفتر اول ودوم
۲۔کلید مثنوی (جلد ا تا ۲۴)	ترجمہ وتشریح حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ
۳۔کشف المحجوب	حضرت سید علی ہجویریؒ
۴۔عوارف المعارف	حضرت ابوحفص عمر شہاب الدین سہروردیؒ
۵۔تذکرۃ الاولیاء	حضرت فریدالدین عطارؒ
۶۔تذکرۂ اولیائے پاک وہند	ڈاکٹر ظہورالحسن شارب دہلوی
۷۔رباعیات سرمد شہیدؒ	ترجمہ انگریزی (ڈاکٹر ظہورالحسن شارب)
۸۔فکر اقبال	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم :بزم اقبال لاہور جنوری ۲۰۱۰ء
۹۔اقبال کامل	مولانا عبدالسلام ندویؒ
۱۰۔حکمت رومی	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم
۱۱۔کلیات اقبال اردو	علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال
۱۲۔کلیات اقبال فارسی	ایضاً
۱۳۔روزگار فقیر جلد اول ودوم	فقیر سید وحیدالدین
۱۴۔میزان اقبال	پروفیسر مرزا محمد منور
۱۵۔قرطاس اقبال	ایضاً
۱۶۔نقوش اقبال	مولینا سید ابوالحسن علی ندویؒ
۱۷۔روح اقبال	ڈاکٹر یوسف حسین جامعہ ملیہ دہلی

۱۸۔ترجمہ وشرح کلیات اقبال فارسی پروفیسر حمید الدین ہاشمی
۱۹۔کلیات اقبال فارسی (منظوم ترجمہ) پروفیسر عبدالعلیم صدیقی تمغۂ امتیاز
۲۰۔سیف الملوک حضرت میاں محمد بخشؒ میر پور آزاد کشمیر
۲۱۔بابا بلھے شاہؒ (تحقیق) پروفیسر حمید الدین ہاشمی
۲۲۔سلطان باہوؒ (ایضاً) ایضاً
۲۳۔دیوان حافظ شیرازیؒ ترجمہ وشرح پروفیسر میاں مقبول احمد
۲۴۔دیوان غالب میرزا اسد اللہ خان غالب
۲۵۔اقبال اور محبت رسولؐ ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی
۲۶۔کشف المحجوب حضرت سید علی ہجویریؒ
۲۷۔عوارف المعارف حضرت شہاب الدین سہروردیؒ
۲۸۔نعت کا سفر شفیق راجہ
۲۹۔لفظ کا کاجل ایضاً
۳۰۔کدل ایضاً
۳۱۔''فکر اقبال کے منور گوشے'' مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر
۳۲۔''اقبال اور مسجد قرطبہ'' عمیق حنفی
۳۳۔فضائل اعمال مرتبہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ
۳۴۔مجلّہ سہ ماہی پیغامِ آشنا شمارہ ۵۳۔۵۴ اپریل ۲۰۱۳ء تا ستمبر ۲۰۱۳ء
ثقافتی قونصلیٹ سفارت اسلامی جمہوریہ ایران
۳۵۔روزنامہ باغ ٹائمز مضمون ''صبر حسین''۔سید شہباز گردیزی

پروفیسر شفیق راجہ

صدر نشین طلوع آزاد جموں و کشمیر، سابق ناظم ادارہ علم وفن آزاد جموں و کشمیر۔ سابق معتمد مجلس اقبال آزاد جموں و کشمیر، نائب صدر پہاڑی ادب سنگت آزاد کشمیر، مدیر اعلیٰ ادبی مجلّہ ''مطلع'' باغ، سابق مدیر کالج میگزین ''ماہل'' گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج باغ

تصانیف

۱۔ میں حرف حرف سمیٹوں۔	پہلا شعری مجموعہ 1998ء
۲۔ نعت کا سفر	نثری تصنیف (تحقیق)
۳۔ اجلی دھرتی سچّے لوگ	تذکرہ شخصی خاکے
۴۔ عشق دم جبرئیل	نثری تصنیف (فلسفۂ عشق)
۵۔ کدَل	شعری مجموعہ
۶۔ دخل در معقولات	مضامین
۷۔ لفظ کا کاجل	شعری مجموعہ

یارب درون سینہ دل باخبر بدہ
در بادہ نشہ را نگرم آں نظر بدہ
ایں بندہ را کہ بانفسِ دیگراں نزیست
یک آہ خانہ زاد مثالِ سحر بدہ
سلیم مرا بجوئے تنک مایہ ٔ میپچ
جولاں گہے بوادی و کوہ وکمر بدہ
سازی اگر حریف یم بیکراں مرا
با اضطرابِ موج ، سکونِ گہر بدہ
شاہینِ من بصید پلنگاں گذاشتی
ہمت بلند و چنگل ازیں تیز تر بدہ
رفتم کہ طائرانِ حرم را کنم شکار
تیرے کہ نافگندہ فتد کارگر بدہ
خاکم بہ نورِ نغمہ ٔ داؤد بر فروز
ہر ذرّۂ مرا ، پر و بال شرر بدہ

علامہ اقبال :کلیات فارسی :زبورعجم حصہ اول ''دعا''

ترجمہ:۱۔یارب میرے سینے میں حقیقت کی خبر رکھنے والا دل عطا کر دے،اور مجھے ایسی نظر عطا فرما کہ میں جام میں نشہ دیکھ (محسوس کر) سکوں۔ایک ایسے دل کی تمنا اور ایسی نظر کی دعا کہ طالب یا سائل (شاعر) کائنات کے اسرار کی حقیقت سے آگاہ ہو سکے۔

۲۔اے خدا تیرا یہ بندہ دوسروں کی دی ہوئی زندگی نہیں جینا چاہتا،اپنے اس بندے کو خلوص ومحبت سے بھری ہوئی آہ سحر عنایت کر جو اسے اس کی اپنی ذات کی پہچان دے دے۔ (یہ پہچان اس کی زندگی کی رات کو صبح میں تبدیل کر دے گی)۔

۳۔میری سوچ،فکر ایک سیل آب (سیلاب) کی مانند ہے اسے کم پانی والی ندی میں نہ

الجھا۔ میرے لافانی پیغام کیلئے وادیوں، پہاڑوں اور گھاٹیوں کی وسعت درکار ہے ۔ یہ وسعت اسے عطا فرما۔

۴۔اے خدا اگر تو نے مجھے بے کراں ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کا حریف بنا ہی دیا ہے تو مجھے موج کی بے قراری میں سکون گہر جیسا اطمینان تو عنایت کر۔(میرے فکر، میرے تخیل کی موجیں طوفان اٹھا رہی ہیں اور ہر دم اپنے اندر کے انقلاب، پوشیدہ علم کے خزانے لٹانے کیلئے بے تاب ہیں۔انہیں سکون کی ضرورت ہے)۔

۵۔اے خدا تو نے میرے شاہین (شاہین فکر، طائر تخیّل) کو چیتوں کے شکار کیلئے چھوڑا ہے تو اسے اور زیادہ ہمت عطا کر اس کے پنجوں کو اور زیادہ تیز کر (اس کی اثر پذیری میں اضافہ فرما۔تاکہ یہ غیر کی ساری قوتوں کو تباہ کر سکے اور اپنوں۔امت مسلمہ کیلئے زیادہ سودمند ثابت ہو سکے)۔

۶۔میں حرم کے پرندوں کے شکار کو جاتا ہوں (میں امت مسلمہ کے نوجونوں جو غیر کی تہ ذیب کے دلدادہ ہو رہے ہیں)۔تو اے خدا یا میرے ترکش میں ایسا تیر رکھ دے جو چلائے بغیر ہی کارگر ہو۔(تاکہ یہ نوجوان نسل مجروح ہوئے بغیر اپنی اصل کی جانب لوٹ آئے)

۷۔اے خدا یا میری حیثیت تو ایک بے نور مٹی جیسی ہے تو اس مٹی کو داؤد (علیہ السلام) کے نغمے (ترنم اور اثر پذیری) کے نور سے منور کر دے۔اور میری خاک کے ہر ذرے کو چنگاری کے بال و پر عطا کر دے۔(جس طرح حضرت داؤد علیہ السلام جب زبور کی تلاوت کرتے تھے تو انسان، جن پرندے اور دیگر جانور مسحور ہو جاتے تھے اس طرح میرے کلام کی شیرینی سے بھی اہل جہاں کو میرا ہمنوا کر دے)

علامہ اقبال :کلیات فارسی :زبور عجم حصہ اول ''دعا''